

مُعَاہِرِ ادب

ڈاکٹر جمیل جالبی

مُعَاہِرِ ادب

ادبی، تنقیدی و فکری مضامین کا مجموعہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۱

نبی ز احمد نے

زاہد بشیر پنٹر، لاہور سے چھپا کر

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد — ایک ہزار

قیمت — ۱۸۰ روپے

مُحَبِّ خُسنِ ظہیر صاحب کے نام

فہرست

۱۵	ادب کی صورت و حال	۱
۱۹	نئے لکھنے والوں سے	۲
۲۵	صحیح ادبی رویہ	۳
۲۹	شاعری اور مسائل حیات	۴
۳۲	ادب اور جمہوریت	۵
۳۶	اردو نعت گوئی کا تاریخی ارتقا	۶
۴۶	ہائیکو کے بارے میں	۷
۵۲	فرق تدوین	۸
۵۷	مشاعرے کی روایت	۹
۶۱	بچوں کا ادب	۱۰
۶۵	جدید افسانے کے بارے میں	۱۱
۶۸	عزیز احمد: ایک جائزہ	۱۲
۷۹	میراجی: ایک مطالعہ	۱۳
۱۰۰	حسن عسکری کے افسانے	۱۴

۱۰۵	افسانہ نگار ابو الفضل صدیقی	۱۵
۱۱۲	ابو الفضل صدیقی کے آخری لمحات	۱۶
۱۱۶	جمیلہ ہاشمی کے دونوں اول	۱۷
۱۲۵	جمیلہ ہاشمی کے آخری لمحات	۱۸
۱۳۰	عصمت چغتائی	۱۹
۱۳۳	رضیہ فصیح احمد کے افسانے	۲۰
۱۳۸	مشرق احمد کے افسانے	۲۱
۱۴۱	آصف فرخی کے افسانے	۲۲
۱۴۵	نذر الحسن صدیقی کے افسانے	۲۳
۱۴۸	سر سید احمد خاں	۲۴
۱۵۲	شبلی نعمانی	۲۵
۱۵۸	اکبر الہ آبادی	۲۶
۱۶۲	نیماز فتح پوری	۲۷
۱۶۵	اشتیاق حسین قریشی بحیثیت مؤرخ	۲۸
۱۷۰	پاکستانی فکر کی اساس	۲۹
۱۷۸	تاریخی شعور اور ڈاکٹر قریشی	۳۰
۱۸۲	اقبال اور تشکیلِ جدید	۳۱
۱۸۸	مسجدِ قرطبہ	۳۲
۱۹۵	اقبال کا پیغام عمل	۳۳

۱۹۸	جوش ملیح آبادی	۳۳
۲۰۳	جوش کی وفات پر	۳۵
۲۰۶	جوش کے لطیفے	۳۶
۲۱۶	فیض احمد فیض	۳۷
۲۱۹	فیض احمد فیض	۳۸
۲۲۲	فراق گورکھپوری	۳۹
۲۲۶	غلام عباس	۴۰
۲۳۰	نئیس احمد حفری کی خدمات	۴۱
۲۳۳	امداد صابری : تاریخ صحافت	۴۲
۲۳۷	پیر محترم الدین راشدی	۴۳
۲۴۱	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	۴۴
۲۴۶	مجنوں گورکھپوری	۴۵
۲۴۹	ڈاکٹر سید عبداللہ : ایک تعارف	۴۶
۲۵۳	احجاز الحق قدوسی	۴۷
۲۵۷	اے کے بروہی کی یاد میں	۴۸
۲۶۰	میر علی احمد خان تالپور	۴۹
۲۶۴	صادقین کے بارے میں	۵۰
۲۶۷	محمد نقوش کے بارے میں	۵۱
۲۷۱	مولانا ماہر القادری	۵۲
۲۷۶	ابراہیم جلیس	۵۳

۲۷۹	۵۳ . کامل القادری مرحوم
۲۸۳	۵۵ . ڈاکٹر الوب قادری
۲۸۷	۵۶ . ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان : ایک تعارف
۲۹۲	۵۷ . اختر حسین رائے پوری : گرو دراہ
۲۹۵	۵۸ . مولانا سید ابوالحسن علی ندوی : ایک تعارف
۲۹۸	۵۹ . ڈاکٹر سہیل بخاری : ایک تعارف
۳۰۱	۶۰ . بچوں کی شاعری : محشر ہائیو
۳۰۴	۶۱ . بچوں کی نظمیں : شان الحق حقی
۳۰۶	۶۲ . نعت گوئی : احمد سہارنپوری
۳۰۹	۶۳ . قومی شاعری : منظر الوبی
۳۱۱	۶۴ . اردو گویت : ڈاکٹر بسم اللہ نیاز
۳۱۴	۶۵ . جدید مرثیہ : ڈاکٹر یاد عباس
۳۱۷	۶۶ . سلیم احمد کے بارے میں
۳۲۱	۶۷ . صبا اکبر آبادی کی غزل
۳۲۵	۶۸ . فادسی رباعیات غالب کا اردو ترجمہ
۳۲۹	۶۹ . ضیاء جالندھری کی شاعری
۳۳۲	۷۰ . قمر جمیل کے بارے میں
۳۳۹	۷۱ . صد انصاری کی غزل
۳۴۲	۷۲ . پر تور و پیلہ اور ان کی شاعری

۳۲۹	راشد مفتی کی غزل	۷۳
۳۵۴	صادق نسیم کی غزل	۷۴
۳۵۹	افسر ماہ پوری کی غزل	۷۵
۳۶۳	جمیل عظیم آبادی کی غزل	۷۶
۳۶۶	غنی دہلوی کی غزل	۷۷
۳۷۰	صابر ظفر کی غزل	۷۸
۳۷۳	”بے جواز“ کے حوالے سے	۷۹

۳۷۷	بات سے بات : نصر اللہ خان	۸۰
۳۸۳	تاریخ ادب انگریزی : ڈاکٹر احسن فاروقی	۸۱
۳۸۶	عمر گزشتہ کی کتاب : مرزا ظفر الحسن	۸۲
۳۹۱	پاکستان کی شخصیات : نور الصباح بیگم	۸۳
۳۹۹	یادوں کا جشن : کنود مہندر سنگھ بیدی	۸۴
۴۰۵	طنز و مزاح کی شاعری : شہباز امروہوی	۸۵
۴۰۸	ماحول اور شاعری : نظر حیدر آبادی	۸۶

۴۱۲	تذکرہ سخنوران کا کوری	۸۷
۴۱۸	معاصر شعراء کا تذکرہ : سخن ور	۸۸
۴۲۳	تذکرہ ماثر الکرام	۸۹
۴۲۶	دیوان غالب کا پنجابی ترجمہ	۹۰
۴۲۹	نظیر خوانی	۹۱

۴۳۳	غیر منقوطہ نشر : بادی عالم	۹۳
۴۳۶	غیر منقوطہ شاعری : مصدر الہام	۹۳
۴۴۰	رحمن بابا کا پیغام	۹۳
۴۴۶	شاہ لطیف بھٹائی کی شاعری کے نئے گوشے	۹۵
۴۵۲	نظام الملک میر عثمان علی خان کی خدمات	۹۶
۴۵۵	قاضی خلیق مورائی	۹۷
۴۵۹	حافظ شیرازی	۹۸
۴۶۲	نصرتی کی فارسی غزل	۹۹

پیش لفظ

لفظ آگاہ۔ عصر آگاہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

یہ جاننے کے لیے کہ آیا معاشرہ فرسودگی اور قدامت سے رشتہ توڑتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے اور معاشرہ میں ذہنی استبداد اور سماجی بندشیں کم ہو کر اس میں سماجی رویے کثارتگی، تکمیل اور مساوات کی جانب ڈھلنے لگے ہیں دراصل یہ جاننا ہے کہ اس معاشرہ کا ادیب، شاعر، نقاد اور مفکر کیا اور کیسا نکھر رہا ہے؟ اس معاشرہ میں لفظ کی کیا قدر قیمت ہے؟ ابلاغی عمل کس سمت جا رہا ہے؟ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ساڑھے چار سو صفحات اور ننانوے مضامین پر مشتمل اس مجموعہ سے رابطہ کرنا دراصل عصری ذہن، معاشرہ اور سورج سے اپنا رشتہ استوار کرنا ہے۔ جالبی صاحب کے یہاں لفظ کا استعمال، موضوع کا انتخاب، ادبی اور سماجی رویوں کا تجزیہ اور مسائل پر گرفت اُن کے سماجی شعور کی علامت اور اُن کی شناخت بن گئی ہے۔ زبان سماجی رشتوں کی علامت ہے اور سماجی عمل سے بنتی، بڑھتی اور بدلتی رہتی ہے۔

وہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان رابطہ بنی ہے اور فرسودگی سے جُھلائی اور مستقبل کا اعلان بھی ہے۔ زبان کی اس سماجی حیثیت کی طرف جالبی صاحب کے ان مضامین میں بار بار اشارے ملتے ہیں۔ ان مضامین ہی میں نہیں بلکہ جالبی صاحب کی اکثر تحریریں ان میں لفظ اور زبان کی سماجی حلیت اور کارآوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اپنی تاریخ ادب اور دور جلد دوم، حصہ اول کے پہلے باب کے آخری پیرے میں جالبی صاحب ایک سوال اٹھاتے ہیں جس کا

جواب، دوسرے باب میں ملتا ہے: اردو نے ہندی معاشرہ میں جگہ کیسے لی، ایسے معاشرہ میں جہاں تاریخی منظم ہو چکی تھی؟ جاہلی صاحب کے خیال میں بدلتے ہوئے سماجی رشتے اور تقاضے، معاشرہ کے گرتے ہوئے ایوان، ایک نئے ابلاغی رشتے کے متقاضی تھے۔ ”اردو زبان نے عوام و خواص کے درمیان اس وسیع فوج کو... پاٹ دیا جواب تک دونوں کے درمیان حائل تھی“ (ص ۲۱) لیکن جہاں سماجی عدم تعزیتی کی بنیاد بنی، جاہلی صاحب کے مطابق آج سماجی مخالفت کے علمبرچہ کی ہے۔

جاہلی صاحب کے خیال میں ہمارا آج کا ادب عام طور پر فرد اور معاشرہ سے مخاطب نہیں (ص ۱۶) ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اس میں زندگی کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ ادیب کا معاشرہ سے رشتہ ٹوٹ جانے کے یہی معنی ہیں کہ وہ الفاظ کی سماجی اہمیت فراموش کر چکا ہے۔ الفاظ کے معنی اور ان کی سماجی اہمیت کو بھول جانا حقیقتاً سماجی رشتوں کو بھول جانا ہے۔ سماجی رشتے فرائض اور ذمہ داریوں میں تقسیم و تحلیل پذیر ہوتے ہیں، الفاظ کے معنی بھولنا گویا سماجی فرائض اور ذمہ داریوں کو بھلا دینا ہے۔ جاہلی صاحب کا خیال ہے کہ ہمارا ادیب اب اسی منزل پر پہنچ گیا ہے۔

لیکن جاہلی صاحب اس مخالفت کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے مطابق یہی نہیں کہ آج کا ادیب مصلحتوں میں محصور اور غیر معقول تنہائیوں کا اسیر ہو گیا ہے بلکہ اس کا اپنی تاریخ سے، ثقافت سے، ماضی سے بھی رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن یہ رشتہ ”لفظ آگاہی“ کے ذریعہ ہی دوبارہ استوار ہو گا۔ شعوری سطح پر اس کی بنیاد رکھنی ہوگی، معقولیت کے دائرے میں اولیٰ عمل جاری رکھنا ہو گا۔ اس پس منظر میں جاہلی صاحب نے لکھنے والوں سے کہتے ہیں کہ کوئی اعلیٰ تحریر گہرے شعور کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی... یہ شعور زندگی سے گہرے تعلق سے پیدا ہوتا ہے... علم و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ضروری مطالعہ، موجود زندگی کی تفہیم... اپنی تہذیب و ثقافت کی تاریخ اور اس کی موجود صورت حال پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے (ص ۲۱-۲۲)۔ گویا الفاظ کی تلاش سماجی شناخت کی علامت ہے۔

جاہلی صاحب اس تلاش کے لیے انقلابی عمل اور معاشرہ سے جنگ کے الفاظ استعمال

کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں معاشرہ کو جو ہریت اور نفس انفسی کے غول سے باہر نکالنے کے لیے جرأت دے بائیں کے ساتھ آزادی اظہار کی راہ یعنی پٹی ہے۔ دراصل ادب کی آزادی کے اظہار کی حقیقی صورت ہے (ص ۳۲) اور آزادی کا یہ معنی خیالات کے تصادم سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ سماجی غلیٹ اور حریت میں متفرق واذ بان کی حریت کی تلاش اور اس کا تحقق پوشیدہ ہوتا ہے۔ سماجی عمل، فکر و ادب کا عمل ہے "قوموں کی زندگی میں صرف سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے ذہن سے نہیں... بلکہ فکر کا مطالعہ کرنے سے نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے" (ص ۷۴)۔ سماجی غلیٹ کو یا سیاسی نظریوں اور حکمت عملیوں سے نہیں، بلکہ لفظ کے شعور سے وابستہ ہے۔

جالبی صاحب کے سماجی غلیٹ کے اس فلسفہ کو مختصر لایوں بیان کیا جاسکتا ہے : لفظ کا شعور و استعمال (ادب و فلسفہ) فرسودگی اور قدامت کا انکار اور حریت (امکانات) کا تحقق۔ لفظ کی گویا دو جہتیں ہیں اور اسی لحاظ سے اس کے استعمال کے دو سیاق سامنے آتے ہیں۔ ادب ماضی سے، فرسودگی سے اور قدامت سے جنگ بھی ہے، حال کی آگاہی بھی ہے اور آزادی اور امکانات کی تلاش اور حصول بھی ہے۔ قدامت اور فرسودگی کی جانب جالبی صاحب اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی میں داخل ہو رہے ہیں لیکن ہماری زبان اور ہمارے لسانی رویے اب تک جاگیردارانہ ہیں۔ ان کا منکر کج بھی ایک فرسودہ سماجی و معاشی و دلدل میں پڑا ہے اور "جاگیردارانہ نظام چونکہ کھوٹے سکے کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ہمارے سارے معاشرتی، معاشی اور سیاسی بحران اسی کھوٹے سکے کو مسلسل چلانے کی ذہنیت اور کوشش سے پیدا ہو رہے ہیں" (ص ۳۲-۳۴)۔ لیکن اس ذہنیت کو آپ کا تاریخی شعور لفظ کی تفہیم اور استعمال و حریت کا احساس بدل سکتا ہے۔ نئے سماجی رشتوں سے، ادب کے نئے افق اور فکر کے نئے سوتے تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ جالبی صاحب کے یہاں تاریخ اور تاریخی شعور کا بار بار ذکر آیا ہے۔ ان کے لیے تاریخ انفرادی اور اجتماعی شخص کی اساس ہے۔ "تاریخ انسانی فکر و شعور کو زندہ و متحرک کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ وہ قومیں جو

تاریخ کو بھلا دیتی ہیں، تاریخ انھیں بھلا دیتی ہے " (ص ۲۸۴)۔ جاہلی صاحب کو یہ احساس ہے کہ ہمارے ثقافتی منظر میں تاریخ کے دھارے منجمد ہو گئے ہیں اور زندگی کی قدریں معاشرے میں سوکھ کر مر چکا رہی ہیں۔ جاہلی صاحب جب لفظ 'شعور' استعمال کرتے ہیں تو وہ اسے محض ایک نفسیاتی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک توجیہاتی تصور کے طور پر ایک فکری ضابطے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ تصور بیک وقت حافظہ (ماضی)، اور متحیلہ (مستقبل، امکان) کے درمیان واسطہ اور ان کا سنگم ہے۔

اس مجموعہ میں شامل مضامین متنوع ہونے کے باوجود ایک داخلی رشتہ میں مربوط ہیں۔ جاہلی صاحب کے سوانحی خاکے ہوں، موضوعاتی تبصرے ہوں یا ادبی جائزے، وہ ہر جگہ دریافت کرتے نظر آتے ہیں؛ کیا اس شاعر، ادیب، یا دانشور کی تحریر پرانے بُت ٹوٹ گئے (ماضی)؟ کیا نیا شعور بیدار ہوا؟ (امکان، مستقبل، آزادی کا تحقق)۔

ان سوالوں کے جواب آپ کو ان مضامین میں ملیں گے لیکن آپ کو یہ مضامین ایک سے زیادہ بار پڑھنے ہوں گے اور اس عمل میں آپ اپنے سماج، اپنی ثقافت اور شاید خود اپنی ذات کو سمجھان جائیں اور مولانا عبدالرحمن جاتی کے ان اشعار کا جواب مل جائے جن کی جانب جاہلی صاحب نے اس مجموعہ کے پہلے مضمون میں اشارہ کیا ہے۔

ادب کی صورتِ حال

مولانا عبد الرحمن جامی نے اپنی مشہور "سلا مان و اہمال" میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک کڑو کو دھواڑے کسی بڑے شہر میں کیا بہاں آیا تو دیکھا کہ انسانوں کا سمندر ہے جو سڑکوں پر چاروں طرف بہ رہا ہے۔ کڑو نے یہ سماں دیکھا تو گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ اگر میں اس بھیڑ میں سلا جلا تو یقیناً گم ہو جاؤں گا اس لیے ضروری ہے کہ اپنی شناخت باقی رکھنے کے لیے کوئی ایسا نشان مقرر کروں کہ اگر گم بھی ہو جاؤں تو اس نشان کے ذریعے خود کو پہچان سکوں۔ اچھا وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک کدو سے رستے میں چڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے کدو اٹھایا اور اپنے پیرو سے باندھ لیا تاکہ اپنی پہچان کر سکے۔ ایک سرودانا آدھر سے گذرا تو اس نے دیکھا کہ ایک کڑو پاؤں سے کدو باندھے چلا جا رہا ہے۔ یہ منظور دیکھ کر وہ بات کی نہ تک پہنچ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ کڑو تنگ گیا اور ایک جگہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ جب کڑو سو گیا تو سرودانا قریب آیا اور کڑو کے پاؤں سے کدو کھول کر اپنے پاؤں میں باندھ لیا اور وہیں لیٹ گیا۔ کڑو جب بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ کدو کسی اور کے پاؤں میں بندھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا اور آواز دی کہ اے شخص میں اپنے معاملے میں حیران و پریشان ہوں۔ اٹھ اور مجھے بتا کہ یہ میں ہوں یا یہ تو ہے۔ اگر یہ میں ہوں تو یہ کدو تیرے پاؤں میں کیسے بندھا ہوا ہے اور اگر یہ تو ہے تو پھر میں کہاں ہوں؟

ایسا منہ یا تو فی دامن درست
گر منہ چوں ایں کدو ہاے تفت

در توفی ایں من کہا یم کیست
در شماری من نہا یم چہیست

یہی مسئلہ جو اُس وقت کروڑوں سالوں کے سامنے تھا یہی مسئلہ آج تہذیبی، انکری اور ادبی سطح پر بھی درپیش ہے۔ ہم نے بھی آج اپنی شناخت گم کر دی ہے اور فکر و خیال کی بھیڑ میں یہ پلچ رہے ہیں

کہ اگر یہ قہر تو پھر میں کہاں ہوں؟ اور اسی وجہ سے ہم آج ذہنی و فکری سطح پر بے سمت اور بے جہت ہیں، لفظ بغیر معنی کے پہل ہے اور پہل وہ ہے جس کے کوئی معنی نہ ہوں۔ اپنے ادب کو دیکھئے تو اس وقت یہ پہل بے مقصدیت کا شکار ہے۔ اس کی روع میں کوئی ایسی معنویت نہیں ہے جس سے فرد اور معاشرے کے بنیادی سوالوں کا جواب مل رہا ہو۔ وہ جواب جس سے فرد و معاشرہ میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے فکری زندگی کا بیج پھوٹتا ہے اور فکر میں جہت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا ادب عام طور پر فرد اور معاشرے سے مخاطب نہیں ہے۔ لیکن ابلاغ کے راستے کے کٹ کر علامات اور تجزیہ کی طرف چلا گیا ہے جہاں وہ اپنی بے معنویت کو "بظاہر معنویت" کے پردے میں چھپا رہا ہے۔ شاعری کو دیکھئے تو فکر خیال کی سطح پر وہ ایک گہرے بحران اور الجھاؤں کا شکار ہے۔ اس میں چٹکے بازی تو نظر آتی ہے لیکن معنی نظر نہیں آتے۔ وہ معنی جس سے شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے زندگی آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ اس وقت ایک ایسا سا ٹائپ ہے کہ جس میں حرکت کا عمل بند سا ہو گیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ معاشرے میں انسانی و معاشرتی اقدار، صداقتوں کی تلاش اور زندگی کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش بھی نظر نہیں آتی۔ ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اور ادیب تخلیق کے کرب میں مبتلا رہنے کے بجائے آسائش کے لطف کی تلاش میں دن رات سرگردان ہے۔ یہی مقصد اولیٰ ہے اور ادب اسی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ لیکن یہ باتیں سن کر آپ میں سے کچھ لوگ ناراض ہو جائیں لیکن جب ادب و فکر میں منفی رجحانات داخل ہو جائیں تو ان کی نشان دہی کرنا اور انہیں روکنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میرا یہ عمل بھی اسی غلو میں نیت پر مبنی ہے۔

اس منفی رجحان کی ذمہ دار آج کی نسل نہیں ہے۔ اس کا نام کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۸ء والی نسل نے ادب کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنے کا عمل شروع کیا اور آج کی نسل اسی فصل کو "چوپک کر تیار ہو گئی ہے" کاٹ رہی ہے۔ اس وقت میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس صورت حال کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں تاکہ آج کی نسل جسے زندگی کا بہت لمبا سفر بھی ملے کرنا ہے ان رجحانات اور رویوں کو رد کر کے اس راستے کو اپنائے

جس پر چل کر ہم ادب کے ذریعے بنیادی سوالوں کو اٹھا کر ان کے جواب کی تلاش کے سفر پر روانہ ہو سکیں تاکہ ادب پھر اس شعور کے پیدا کرنے کا سبب بن سکے جو ادب کا ہمیشہ سے منصب رہا ہے اور جس سے فرد اور معاشرے کی ذہنی تقدیر بدل جاتی ہے بلکہ زندگی کو کھگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ جس سے تاریکی شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے ذہن بدلتا ہے اور انسان پیدا ہوتے ہیں۔

اپنے دور کے ادب کا مربوط مطالعہ کیجئے تو یہ بات سامنے کئے گی کہ یہ وہ ادب نہیں ہے جس میں اپنے زمانے کی روح کا فرما ہوتی ہے اور جس سے ہم زمانے کو پہچانتے ہیں۔ یہ ویسا ادب بھی نہیں ہے جیسا وہ ہو سکتا تھا یا ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ادب زندگی کے دھارے پر بہتے ہوئے سچائیوں کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا ادب زندگی کا اور اس زندگی کی سچائیوں کا اظہار کرتا ہے جن کا ادیب و شاعر کی حیثیت سے، آپ نے تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ مصاحبتیں اور مناقتیں تو تخلیقی ادب کی دشمن ہیں۔ ۱۹۵۸ء کے بعد سے عام طور پر ہمارا ادیب تعلقات عامہ کے راستے پر چل پڑا ہے اور اپنا معاشرتی درجہ بڑھانے کے لیے ادب کو استعمال کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور فکر و خیال اب منزل نہیں بلکہ محض شہرت حاصل کرنے اور زندگی کی زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور معاشرتی رتبے بخورنے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور یہ رجحان یقیناً ایسا ہے جو ادب اور فکر و خیال کا سفاک دشمن ہے۔ اس صورت حال میں ویسا ہی ادب پیدا ہو گا جیسا ہو رہا ہے۔

یہ وہ صورت حال ہے جو انائی (سوڈو) دانشوروں کو بہت ماس آتی ہے۔ ایذا را پاؤنڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”سچا اور سنجیدہ فن کار قد رشتا سی سے اتنا ہی بے نیاز ہوتا ہے جتنا کوئی سنجیدہ سائنس دان ہوتا ہے۔ انائی فن کار سنجیدہ فن کار سے تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور انائی فن کار تعلقات عامہ کے ذریعہ وہ انعامات بھی حاصل کر لیتا ہے جو دراصل سنجیدہ فن کار کو ملنے چاہئیں۔ یہ فطری بات ہے کہ انائی فن کار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ حقیقی فن کار اور انائی فن کار میں تمیز نہ ہونے دے؟ یہ صورت ہر دور

میں نظر آتی ہے لیکن سب ادیبوں کا جب ہی مقصد خیالات بن جانے تو اس سے ادب کی وہ حالت ہو جاتی ہے جس وقت ہمارے ادب کی ہے۔ اس وقت ادیبوں کو اور نہ معاشرے کو اتنی فرصت ہے کہ وہ زندگی میں نگرو خیال کی اہمیت کو فی الحقیقت محسوس کر سکے یا کرا سکے۔ درپستی کی ایک دوڑ ہے جس میں سب شریک ہیں اور نگرو خیال کے ساتھ ادب کا بیج بھی مر رہا ہے۔ معاشرہ اسی لیے سستی تغریحات سے دل بہلانے میں مصروف ہے اور ادیب بہترین مسائلوں کے حصول میں لگا ہوا ہے اور میں مولانا جامی کی طرح پوچھتا ہوں کہ یہ میں ہوں یا یہ تو ہے۔ مگر یہ تو ہے تو پھر میں کہاں ہوں؟

(۱۹۸۷ء)

نئے لکھنے والوں سے

طلبہ و طالبات کی نئی نسل میں آج بھی ایسے نوجوان موجود ہیں جنہیں ادب سے نہ صرف دل چسپی ہے بلکہ جو ادب کو اپنے احساسات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنانا ہے ہیں۔ یہ بات ہذا خود بڑی خوش آئند ہے۔ اُن کی تحریروں سے اس بات کا بھی واضح طور پر اظہار ہوتا ہے کہ اُن میں وہ فطری میلان طبع موجود ہے جو ادب کی تخلیق کے لیے انسان پر فطرت کے وقت ساتھ لے کر آتا ہے۔ جب یہ فطری صلاحیت موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر صحیح سمت میں سفر کیا جائے اور اس سفر کی صحیح تیاری کی جائے تو آج کے یہ نوجوان کل کے بڑے ادیب، بڑے شاعر، بڑے نقاد و مفکر بن کر سامنے آئیں گے۔ میں نے صحیح سمت اور صحیح تیاری کا ذکر کیا ہے۔ صحیح سمت کے مراد یہ ہے کہ کتب کو یہ بھی سے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی منزل کیا ہے اور اس منزل کا راستہ کیا ہے؛ پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس راستے کی مسافت طے کرنے کے لیے آپ کو کیا تیاری کرنی ہے؛ منزل کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ آپ کو ادب کی کون سی صنف میں اپنے تجربات و خیالات کا اظہار کرنا ہے اور پھر یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ اس صنف کو اختیار کرنے کے لیے آپ کو کیا پڑھنا ہے؛ پھر ادب کی تخلیق کے لیے آسان ہی ضروری ہے جتنا زور ہے کہ بے سانس بیٹا ضروری ہے۔ اس بات کی میں یہاں ذرا سی وضاحت کروں گا جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی صلاحیت کے نشانات چراغ کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ بعض بچے زیادہ زمین ہوتے ہیں اور بعض نسبتاً کم زمین ہوتے ہیں۔ ذہین بچوں کے چراغ میں کم ذہین بچوں کے مقابلے میں زیادہ تیل موجود ہوتا ہے۔ اب اگر ذہین بچہ اپنی صلاحیت کے چراغ میں مزید تیل ڈڈالے اور اس کے مقابلے میں کم ذہین بچہ مسلسل تیل ڈالتا رہے تو کچھ ہی عرصے میں ذہین

بچے کا چراغ بجھ کر رہ جائے گا اور کم ذہین بچے کا چراغ اسی طرح مسلسل روشن رہے گا۔ گویا چراغ میں مسلسل تیل ڈالنے کا عمل بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تیل دراصل مطالعے سے، خود و فکر سے صلاحیت کے چراغ میں آتا ہے اور اسے زندہ و روشن رکھتا ہے۔ آپ نئی کار خریدتے ہیں تو شوروم کا مالک ایک گیلن پٹرول ڈال کر گاڑی آپ کے سپرد کر دیتا ہے۔ آپ اس تیل کی مدد سے اپنے گھر آ جاتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ساری عمر اسی تیل سے آپ اپنی گاڑی چلا سکتے رہیں۔ اس عمل سے یہ بات سامنے آتی کہ جیسے آپ کے چراغ یا گاڑی کے لیے تیل کا مسلسل ڈالنا ضروری ہے اسی طرح ادب کے لیے مطالعہ کا تیل تخلیق کے چراغ میں ڈالتے رہنا ضروری ہے۔ وہ لوگ جو صرف لکھتے ہیں اور پڑھنے کا شوق نہیں رکھتے ان کی تحریریں جلد ہی مر جھلے لگتی ہیں اور وہ جلد ہی خود کو دہرائے لگتے ہیں۔ فکر اور اظہار خیال اور احساس کی سطح پر خود کو دہرائے لکھنے والے کی شکست ہے اس لیے ضروری ہے کہ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ ادب کی دنیا میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے مطالعہ اور خود و فکر ضروری ہے۔ مطالعہ وہ راستہ ہے جس سے ادیب اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ آپ وہ سب کچھ پڑھیں جو آپ کو پڑھنا چاہیے۔ آپ نہ صرف اپنی زبان کا سارا جدید ادب پڑھیں بلکہ قدیم ادب کا مطالعہ بھی ذوق و شوق سے کریں تاکہ آپ اپنے ادب کی روایت سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔ روایت سے رشتہ کاٹ کر آپ کی تحریر بے جہان رہے گی۔ پھر یہی نہیں بلکہ آپ کم از کم ایک دوسری زبان کے ادب سے بھی واقف ہوں اور صرف واقف ہوں بلکہ اس کے مزاج دان بھی ہوں۔ آپ کی تحریر میں تازگی، توانائی اسی وقت پیدا ہوگی جب آپ اپنی زبان کے ادب کے ساتھ ایک بیرونی زبان کے ادب سے بھی واقف ہوں۔ اس لیے میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ کس سی شہرت سے گریز کریں اور کس ہی اپنی ذہنی بنیادوں کو مطالعے کے ذوق سے اتنا مضبوط بنالیں کہ اس پر آپ تخلیق کی جیسی اور عظیم الشان عمارت تعمیر کر سکیں۔

ہر وہ شخص جو ادب و فن کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے یہ عمل اس کے لیے لازمی ہے۔ میری اپنی زندگی کا تجربہ یہی بتاتا ہے اور یہی بات میں اس نئے ایوانک

پہنچا، چاہتا ہوں جو ادب کی دنیا میں کچھ کرنا چاہتا ہے تاکہ تاریخ میں اس کا نام روشن ہو
 لفظوں میں لکھا جاسکے یہ بات بظاہر بہت آسان سی نظر آتی ہے لیکن یہ راستہ اتنا پرخطر
 اتنا دشوار، اتنا پریشانی ہے کہ اکثر راہ گھروں کی سانس پھول جاتی ہے اور پھر وہ وہیں بیٹھ
 جاتے ہیں۔ کبھی مالی مسائل کلنٹن بن کر پاؤں کو زخمی کر دیتے ہیں، کبھی گھریلو الجھنیں مجروح کر دیتی
 ہیں اور کبھی ناسازگار حالات ہمت کو پست اور حوصلوں کو مٹا کر دیتے ہیں۔ ادب و فن کا
 راستہ اسی لیے زندگی کو قربان کرنے اور جان پر کھیل جانے کا راستہ ہے۔ یہ نہ آسانش کا
 راستہ ہے اور نہ معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کا راستہ ہے۔ یہ صرف ایثار کا راستہ
 ہے۔ اس لیے اس دشوار گزار راستے پر چلنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے تاکہ اگلے سفر میں
 آپ کو کسی قسم کی تھکن پہنچا نہ سکے، اگر آپ کو دولت کمائی ہے تو پھر اس راستے کو چھوڑ
 دیجیے اور وہ کام کیجیے جو دولت کمانے کے لیے ضروری ہیں۔ مرنے والا اپنی زندگی میں کچھ
 بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ اگر آپ نے شاعر یا ادیب بننے کا خواب دیکھا ہے تو پہلے یہ بات
 طے کر لیجیے کہ آپ کبھی مال دار نہیں بن سکتے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ لیجیے کہ آپ اپنی زندگی
 بغیر مناسب آمدنی کے اس طور پر بسر نہیں کر سکتے جس طور پر ادب و فن کے لیے ضروری ہے۔
 ورنہ یہ کمائی آپ کا مقصد یا منزل نہیں ہونا چاہیے بلکہ آپ کی منزل ادب و فن ہونا چاہیے۔
 اس صورت میں ضروری ہے کہ آپ اپنے لیے ایسا ذریعہ آمدنی پیدا کیجیے جس سے آپ کی
 منزل سامنے رہے اور آپ کا راستہ سدود نہ ہو۔ آپ کی طبیعت میں دردِ شانے نیازی
 ہونی چاہیے اور آپ کا مقصد حیات ہمیشہ ہر چیز پر حاوی رہے۔ جو کام آپ کریں شوق کے
 ساتھ کریں۔ شہرت کے کچھ نہ بھاگیے بلکہ کام اور صرف کام کیجئے تاکہ شہرت اس کام کی کوکھ
 سے پھولے۔ یہ وہ شہرت ہوگی جو آپ کے قدم بلند آپ کے جوہر کو روشن اور آپ کے
 نام کو از خود اڑھکا کرے گی۔ یہ مشکل راستہ ہے لیکن یہی وہ راستہ ہے جس پر بڑے ادیب
 اور کھنے والوں نے سفر کیا ہے اور منزل تک پہنچے ہیں۔

کوئی اعلیٰ ادبی تخلیق زندگی کے گہرے شوق کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ زندگی کا شوق
 وہ حقیقی روشنی ہے جس سے تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ یہ شوق زندگی سے گہرے تعلق

سے پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے تجربات سے پروان چڑھتا ہے۔ علم و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ضروری مطالعہ، موجود زندگی کی تفہیم، تاریخ کے مطالعے، مختلف خیالات دنیا میں ایک مخصوص زمانے میں کیوں ابھرے اور پھیلے اور کیوں اور کب مر گئے، اپنی تہذیب و ثقافت کی تاریخ اور اس کی موجود صورت حال پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ شعور کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے مسئلہ اور اس کی نوعیت کو سمجھ لیا ہے۔ زندگی ایک "اکائی" ہے مگر آپ ایک جزو پر قادر ہونا چاہتے ہیں تو پھر پوری اکائی کا علم اور اس سے آگاہی ضروری ہے۔ یہی شعور آپ کی تحریر دل کو وہ رنگ و نور عطا کرتا ہے جس سے تخلیق میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ اس شعور میں ماضی ہی شامل ہوتا ہے اور حال ہی۔ حال دراصل مستقبل کا ماضی ہے اسی لیے ہر لکھنے والے کو حال کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اسے قبول بھی کرنا چاہیے اور رد بھی۔ وہ لکھنے والے جو زمانہ موجود کو رد کر کے صرف ماضی یا مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں تو ایسے میں ماضی ان کا ماضی ہوتا ہے اور مستقبل ان کا مستقبل ہوتا ہے۔ نئے لکھنے والوں کو میرا ہی مشورہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ساتھ پوری طرح زندگی بسر کریں۔ اسے محسوس کریں اس کی خوشبو کو اپنے وجود کا حصہ بنائیں۔ اس کی بصیرت حاصل کریں۔ اسے بہتہ دلنے کے لیے اپنے قلم سے جدوجہد کریں اس کی منفی قوتوں کے خلاف آواز بلند کریں اور اپنے ضمیر کی آواز کو سارے عالم کو سنلنے کے لیے قلم کا سہارا لیں۔ ہمارے دور کی منفی قدریں وہ قدریں ہیں جو انسان انسان کے درمیان حاکم و محکوم کا رشتہ قائم کرتی ہیں، جو استحصال کو پاتی ہو سکتی ہیں، جو دولت کو چند ہاتھوں میں جمع کر کے سب دوسروں کو رعیت بنا دیتی ہیں۔ جو عدل و انصاف کو ختم کرتی ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو ان قدروں کے خلاف جہاد و قلم کرنا چاہیے۔ آپ اسی لیے تو لکھنے کی طرف مائل ہیں کہ آپ کو ان انصافیوں اور زندگی کی موجودہ معنویت کا احساس ہے اور آپ اسے ماضی و با مقصد بنانا چاہتے ہیں۔

آپ روحِ علم کو اپنے فن میں اس طور پر سمونے کی کوشش کیجیے کہ آپ کا فن آپ کے دور کا اظہار بن جائے لیکن یہ اظہار ایسا ہو جو اپنے دور کا حوالہ بننے کے ساتھ آپ کی روح کا بھی اظہار ہو اور گنے والے زمانوں کا احساس ہمارے ہی اس میں موجود ہو۔ یہ فی الحقیقت

بہت بڑا کام ہے لیکن اگر آپ کو بڑا بننا ہے تو پھر یہی کام آپ کو کرنا چاہیے اور اس کام کو کرنے کے لیے سخت محنت، وسیع مطالعہ، گہری فکر بھی کرنی چاہیے۔ پھر اپنے تخیل پر اور آپ بھی اس پر غور کیجیے کہ تاریخ کی اس منزل میں جہاں آپ کھڑے ہیں۔ جہاں ادب و فن کی دنیا میں بہت بڑے بڑے کام ہو چکے ہیں صرف الگ راستہ بنانا کوئی منزل نہیں ہے بلکہ امتزاج (Synthesis) اس دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور اسی امتزاج کی کوکھ سے کچھ کا اور مستقبل کا بڑا ادب یا فن پیدا ہو سکتا ہے اور ہو گا۔ آپ اس پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اس سلسلے میں آپ کیا کر سکتے ہیں یا آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ میں اپنی بات جدید تصویر کی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ خطاطی ایک الگ فن ہے اور تصویر ایک ایک الگ فن ہے۔ صادقین نے، شاگرد علی نے، زوہبی نے، خطاطی اور تصویر کے امتزاج سے اسے ایک ایسی صورت دی کہ خطاطی اور تصویر ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہو گئے اور آج نئی نسل کے تصور اس راستے پر خوش دلی سے چل رہے ہیں۔ آپ بھی اسی طرح فکر و احساس کے تعلق سے ایک نیا امتزاج تلاش کیجیے۔ آپ بھی بڑے تصور، بڑے فی کار ہاں کیسے گئے۔

نئے نئے لکھنے والوں سے اختصار کے ساتھ چند باتیں میں اور کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آپ جو کچھ کہیں جو کچھ لکھیں آپ کی آوازیں دلی درد مند کی نے شامل ہو۔ اس میں آپ کے خلوص کی جہک موجود ہو۔ آپ کی آواز میں سچائی کے اظہار کی توانائی کو جرد و ہر اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ دیانت کے ساتھ اپنی بات کہہ رہے ہوں۔ مصائب میں مصائب کو جنم دیتی ہیں اور مصائب تخلیقی توانائی کو برہاد کر دیتی ہیں۔ عزیزو! آپ تو جوان ہیں۔ آپ نے زندگی کے سفر کا ابھی آغاز کیا ہے۔ زندگی کو بنانا یا سنوارنا آپ کا اصل کام ہے۔ وہ زندگی جو آپ کو ملی ہے وہ نہیں ہے جو آپ اپنے بعد کی نسلوں کو دیں گے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ آنے والی نسلوں کو وہ زندگی دیں جو عدل و مساوات کی زندگی ہو۔ جو حق و دیانت کی زندگی ہو، جو انسانیت و محبت کی زندگی ہو۔ وہ زندگی جو میں نے اپنی نئی نسل کو دی ہے اس میں دعا و فریب شامل ہے۔ اس میں استحصاں و جبر موجود ہے۔ اس پر مبنی قوانین

ناوی ہے۔ اس میں بعض انسانیت تڑپ تڑپ کر سک رہا ہے۔ وہ زندگی جس پر بنیا تھا وہاں
 ہے جس پر سودا کی لعنت مسلط ہے اور جس نے ساری زندگی کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا
 کیا ہے۔ وہ جنگ جو ساری دنیا کو آنا فنانا میں فنا کر دے گی اور یہ خوب صورت پہاڑ یہ حسین
 مرغزار، یہ کھلتے ہوئے خوشبودار پھول، یہ دریا، یہ سمندر، یہ آبشار اور یہ انسان کی تماشائی ہوئی دلغز
 زندگی معدوم ہو جائے گی۔ میں آپ کے سامنے اس لیے شرمسار ہوں اور زندگی کے محشر میں
 اپنا اعمال نامہ لیے آپ کے سامنے گن گنا کر کی طرح کھڑا ہوں اور آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں اپنی
 زندگی کے مشن میں 'زندگی کی قدریں بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا قلم ادب کی دنیا میں وہ کام
 نہیں کر سکا ہے جو اسے کرنا تھا لیکن میری عبرت آپ کے لیے ایک سبق ہے اور میں چاہتا
 ہوں کہ آپ کا قلم وہ کام کرے جو اسے کرنا چاہیے۔ میں آج آپ کی توجہ اسی طرف مبذول
 کرنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ کام جو مجھ سے اور میری نسل سے نہ ہو سکا وہ آپ بہت
 حوصلے اور دیانت کے ساتھ کریں۔ عزیزو! اس وقت مجھے مصطفیٰ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے وہ
 شعر برمل ہے یا نہیں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اسی شعر پر اپنی بات کا اقسام کر دوں:

وصل کی شب بھی لڑائی ہی رہی یار کے ساتھ

سرسے عاشق کے عذاب شب بھرا نہ گیا

اب یہ فیصلہ آپ خود کیجیے کہ یہ شعر برمل تھا یا بے صل تھا۔ غزل کے اچھے شعر کی یہی

غوی ہوتی ہے۔

صحیح ادبی رویہ

ممتاز اصحاب کے انٹرویو ہمارے ہاں برسوں سے کیے جا رہے ہیں لیکن طاہر مسعود نے اس صنعت جدید کے کینوس کو نہ صرف وسیع کیا ہے بلکہ انٹرویو دینے والوں سے ان کے دل کی بات کہلو کر اس ہنر کو فن بنادیا ہے۔ انھوں نے انٹرویو سے پہلے ضروری تیاری کی ہے تاکہ اس شخص کے کانوں سے واقف ہو کر گفتگو کی جاسکے۔ اس کتاب کے سارے انٹرویو کو جب میں نے ایک ساتھ پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ اس کتاب سے نہ صرف انٹرویو دینے والے کے مزاج، شخصیت اور خیالات سے ابھی واقفیت ہو جاتی ہے بلکہ گزشتہ پچاس سال کے اہم واقعات، تحریکیں، نظریات اور مسائل بھی اس کتاب میں یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کتاب کو اہم بنا رہی ہے۔

اب تو خیر ادبی گروہ بندی کی نوعیت بدل گئی ہے لیکن آج سے بیس پچیس سال پہلے تک ادبی قریبوں کا سبب ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی ہوتا تھا۔ ہم خیال لوگ اکٹھا ہو جاتے تھے اور ان میں ذاتی مفاد کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ طاہر مسعود نے جب فیض احمد فیض سے اس قسم کا سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ”ہم اپنی ذات کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور نہ اسے مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کے لیے کسی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیں۔ کوئی اصول یا نظریہ کی بات ہو تو اس پر بحث کی جاسکتی ہے کیوں کہ بحث کرنے کا جواز موجود ہے لیکن اگر کوئی ذاتی اعتراض ہو اور آپ اس کا اسی شدت سے جواب دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ مصنفین کی سطح پر اتر گئے ہیں“ (ص ۲۳)۔ یہی وہ سطح ہے جو ایک بڑے

آدی کی ذہنی سطح ہوتی چاہیے اور اب تک ہمارے بڑے ادیب اسی سطح کو برقرار رکھتے آئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں 'نیا دور' کے ۳۴ شمارے میں محمد حسن عسکری صاحب کے خطوط شائع ہوئے ہیں اور ان میں ابھی یہ پہلو ملتا ہے کہ عسکری صاحب کی ترقی پسندوں سے جنگ ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی تھی۔ ممتاز شمس کے نام ایک خط مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۴۸ء میں انھوں نے لکھا کہ :

”ہمارے ہاں بعض عناصر ایسے بھی ہیں جو کلچر اور ادب کا نام لے کر سیاسی یا ذاتی فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی ادبی سرگرمیاں صفر کے برابر ہیں۔ ہمیں اس ذہنیت سے بھلے آپ کو پاک رکھنا ہے۔ یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو مخالفت کے جو ش میں ترقی پسندوں کو چین بگوانا چاہتے ہیں۔ جس دن منشو کو اور مجھے پتہ چلا کہ حکومت ترقی پسندوں کی نگرانی کر رہی ہے اس دن سے ہم نے ارادہ کر لیا کہ کم سے کم ہم دونوں ترقی پسندوں کے خلاف نہیں نکلیں گے بلکہ منشو نے تو اپنا ایک مضمون بھی واپس منگوا لیا۔ ہماری ادبی مشین الگ ہیں۔ ہم انھیں ادب میں پکھاڑنا چاہتے ہیں۔ پولیس کی مدد سے نہیں۔ ہم اپنی حکومت کے لیے بھی جاسوسوں کا کام نہیں کر سکتے بلکہ اگر حکومت نے ادبی سرگرمیوں کی بنا پر کسی ادیب کو گرفتار کیا تو سب سے پہلے ہم احتجاج کریں گے۔“

(نیا دور شمارہ ۷۹-۸۰ ص ۲۹۳)

یہ وہ زاویہ نظر تھا جو ایک بڑے اور بڑے ادیب ہی کا انداز نظر ہو سکتا ہے اور یہی انداز نظر ہمیں فیض کے انٹرویو اور حسن عسکری کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ ادب و فکر کی سطح پر ہمارے اختلاف ذاتی نوعیت کے ہرگز نہیں ہونے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ادب میں 'بچوں کے ذاتیات کا مسئلہ سب سے اہم ہو گیا ہے' اخلاص کی خوشبو مرغی ہے اور ادب کا اثر بے اثر ہو گیا ہے !

”جو ادیب مقصدی ادب پیش کرنا چاہتے ہیں وہ مقصدی ادب پیش کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن جو لوگ ایسا مقصد نہیں رکھتے ان کا ادب بھی ادب ہوگا اور انہیں پیش کرنے کا حق ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان جیسی اسلامی ریاست میں ایسے ادب کی تخلیق کی گنجائش ہے جو ریاست کے مقاصد کو پورا نہ کرتا ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ میری نظر ریاست پاکستان کے کسی مقصد کو پورا نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود وہ اہم اور وسیع ہے کیوں کہ اس کی سچائیاں میرے نفس کی سچائیاں ہیں اور اس میں میرے ایسے تجربات تخلیق کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں جن کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ غرض یہ کچھ ایسا کہ ادب یقیناً ریاست کے مقاصد کے تابع ہونا چاہیے یہ کہنے کے مترادف ہے کہ ادب کو سیاسی، معاشی اور ریاست کی دیگر ضروریات کے مترادف ہونا چاہیے۔“ (ص۔ ۵۰)

یہاں میں نے ایک زاویے سے ادب کے بارے میں تین اہم ادیبوں کا نقطہ نظر بیان کیا ہے اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ تینوں نے مختلف سیاق و سباق کے باوجود ادب کی ماہیت کے تعلق سے ایک سی باتیں کہی ہیں اور یہی وہ انداز نظر ہے جو ایک ادیب کا ہونا چاہیے۔ اس کتاب کو ہر اس شخص کو دل لگا کر پڑھنا چاہیے جو بڑا ادیب بننا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے بڑے معاصرین کی رائے سے ادب کے بارے میں صحیح رویہ اختیار کر سکے۔

شاعری اور مسائلِ حیات

کسی نے کہا ہے کہ شاعری ”مسائلِ حیات“ کے اظہار اور اس کی ترجمانی کا نام ہے۔ میں کچھ خود سے یہی سوال پوچھتا ہوں کہ شاعری کے تعلق سے ”مسائلِ حیات“ کے آخر کیا معنی ہیں؟۔ روٹی پکڑا مکان اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل بھی مسائلِ حیات کے ذیل میں آتے ہیں۔ اپنوں، ہمسایوں اور ہسپتال میں لب دم سکتے ہوئے بیماروں کو دیکھ کر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی مسائلِ حیات کے ذیل میں آتی ہے۔ معاشرے میں جو نا انصافیاں ہیں اور جو ظلم و جبر نا انصافیوں کی کوکھ سے جنم لے رہا ہے وہ بھی مسائلِ حیات کے ذیل میں آتا ہے۔ آپ کے ذاتی مسائل، دکھ درد، غم روزگار، غم جہاں اور غم جہاں یہ بھی اسی دمرے میں آتے ہیں۔ وہ نظامِ فکر، وہ روایات، وہ عقیدے اور وہ طرزِ حیات جس نے معاشرے کو بوجھ کر دیا ہے وہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ معاشرے کے باطن میں ہونے والا اضطراب مخصوص حالات سے پیدا ہونے والی بے چینی اور اس بے چینی سے پیدا ہونے والے جذباتِ احساسات اور خیالات یہ بھی اسی دمرے میں آتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ جو کچھ زیرِ فکر انسان دیکھ رہا ہے، جو کچھ وہ کر رہا ہے اور اس کے کرنے سے جو صورتیں سامنے آرہی ہیں جو اچھائی یا برائییں پیدا ہو رہی ہیں اور خیر و شر کی جو صورتِ حالی وجود میں آرہی ہے وہ سب مسائلِ حیات کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کو بیان کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ ان مسائلِ حیات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کسی اخبار میں واقعاتی اور حقائق پر مبنی ایک مضمون لکھ دیں۔ اگر آپ اخبار کے مدیر ہیں تو اس موضوع پر ادارہ لکھ دیں گے۔ آپ اخبار کے شاعر ہیں تو اس پہلو پر کوئی نظم یا قطعو لکھ دیں گے اور اس طرح اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر کے پناہ و جھ

ہلکا کر دیں گے لیکن جب میں شاعری کی بات کرتا ہوں تو مسائلِ حیات کے تعلق سے اس میں دو سطحوں کا ہونا لازمی ہے۔ ایک سطح یہ ہے کہ مسائلِ حیات کے تعلق سے جب آپ شعر چڑھیں تو آپ کی توجہ اس مسئلہ کی طرف جالے جس کا اشارہ اس شعر میں اس انداز سے کیا گیا ہے کہ بات آپ کے دل میں اُتر گئی ہے۔ یہ وہ سطح ہے جو شاعر کے ہم عصر انسانوں اور خود شاعر کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ شعر اس لیے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے کہ اس میں کسی اہم واقعہ کسی اہم بات، کسی اہم مسئلہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اگر یہ شعر کسی ایسے انسان کو جو اس معاشرے سے تعلق نہیں رکھتا، متاثر نہیں کر رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شعر میں صرف ایک سطح اور ایک ہی تہ ہے اس لیے یہ شعر اس وقت تک ان لوگوں کے درمیان زندہ رہے گا جب تک اس مخصوص واقعہ کا اثر ان کے دلوں پر قائم رہے گا۔ ایسا شاعر جو روزِ مرہ کی زندگی کے واقعات کو شعر کا جامہ پہناتا ہے اپنے دور میں مقبول ہوگا لیکن جب یہ دور سمٹ جائے گا تو اس کی شاعری بھی اسی کے ساتھ طاقِ نسیاں کی تندر ہو جائے گی۔ مثلاً ایسے شاعر ہیں جو ہمیشہ اپنے زمانے کی ترجمانی کر کے یہ کام کرتے رہے ہیں لیکن ہر بڑے شاعر کے ہاں شعر کی درگتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ سطح جس سے وہ اپنے دور کی ترجمانی کر رہا ہے۔ دوسری وہ سطح جو اس کے عہد سے ماوراء ہوتی ہے۔ غالب، تیسر، اقبال، مولانا روم، حافظ و سعدی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً تیسر کو لیجیے۔ تیسر کی شاعری میں جو تیر، جو لہو، جو رنگ اور غم و کرب کی جو کیفیت نظر آتی ہے اس کا تعلق اس کے عہد کے اس کرب سے ہے جب مغلیہ تہذیب زوال کی طرف تیزی سے جا رہی تھی، عظیم تہذیب کی دیوہیکل عمارت ملہ بن رہی تھی اور اس دکھ میں سارا معاشرہ مبتلا تھا۔ تیسر نے اس دور کی زندگی کے دریا سے اس دکھ کو اٹھایا اور اپنی شاعری کی روح میں جذب کر دیا۔ اسی لیے تیسر اپنے دور کا مقبول شاعر تھا۔ مقبول اس لیے کہ اس نے معاشرے کے باطن میں ہونے والے دکھ و درد کو، اس کے کرب اور غموں کو، ان واقعات کے حوالے سے، اس طرح بیان کیا کہ اٹھارویں صدی کی روحِ حیات کی نبض پر تیسر کی انگلیاں چمکنے لگیں۔ اس لیے تیسر اپنے دور کا توجہ اٹھانے والا تھا اور کائناتِ شاعر ہے اس کے اشعار میں اٹھارویں صدی کے انسان کے لیے ان واقعات

کی طرف ایسے درد انگیز اشارے موجود تھے کہ تیر کا شعر اُس کے دل میں اتر جاتا تھا۔ اگر تیر کا شعر صرف اپنے دور کے لیے مخصوص ہوتا تو تیر کی شاعری کا رنگ کبھی کا اتر جاتا لیکن تیر نے اس کرب کو 'اس غم و اندوہ کو کفے والے زمانوں کی روح سے ملا دیا اسی لیے تیر کا غم ذاتی ہونے ہونے بھی ذاتی نہیں ہے' 'ذاتی ہوتے ہوئے بھی وقتی نہیں ہے۔ تیر کے شعر آج بھی ہمیں اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح وہ اپنے دور میں کرتے تھے۔ اسی لیے تیر ہر بڑے شاعر کی طرح، دو سطحوں کے شاعر ہیں اور یہ دونوں سطحیں مل کر تیر کو بڑا شاعر بناتی ہیں۔ تیر اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے اور آج بھی 'جب ان کا زمانہ اور ان کا دور کبھی کا ختم ہو چکا ہے' وہ بڑے اور مقبول شاعر ہیں۔ 'جو گویا' مسائل حیات' ہی شاعری کا خام مواد ہوتے ہیں۔ شاعری کا ناما بانا اسی سے بنتا ہے لیکن شاعر ان مسائل حیات کو کس طرح اور کس انداز سے شاعری میں ڈھالتا ہے دراصل یہ وہ پہلو ہے جس سے شاعری کے درجے مقرر ہوتے ہیں۔

مکمل اگست ۱۹۸۸ء

ادب اور جمہوریت

اس موضوع پر اظہارِ خیال کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں کچھ دیر جمہوریت کی مدح میں قصیدہ پڑھوں اور کچھ دیر آمریت کے غلات اپنے غمِ دغصہ کا اظہار کروں اور آخر میں فنونِ لطیفہ کے بارے میں کچھ عام سی باتیں خاص انداز میں کر کے آپ سے رخصت ہو جاؤں لیکن میں ایسا کرنے کا کوئی ارادہ اس لیے نہیں رکھتا کہ میں جمہوریت کو ہمیشہ سے ایک بہتر اور فطری نظام سمجھتا ہوں اور آمریت کو ہمیشہ سے غیر انسانی اور جاہلانہ نظام سمجھتا ہوں۔ میری رائے آج بھی یہی ہے، گندے ہونے کی میں بھی یہی سمجھتی اور آنے والے میں بھی یہی ہوگی۔ یہ اندازِ نظر میری فکر، میری ذات، میری شخصیت اور میرے ذہن و دانش کا حصہ ہے اور میری تحریروں اور تصانیف میں بار بار آیا ہے۔ یہ بات کہہ کر میں برا و راست اپنے موضوع پر آتا ہوں اور آنے سے پہلے یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فنونِ لطیفہ میں چون کہ ادب، شاعری، موسیقی، مصوری اور دوسرے سب فنون شامل ہیں اور مختصر سے وقت میں ان سب پر بات کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے میں اپنی بات کو صرف ادب تک محدود رکھوں گا۔

فرانسیسی مفکر، ادیب، ژان پال سارتر سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک ادب اور سیاست کا کیا رشتہ ہے تو اس نے جواب دیا کہ سیاسی عمل کو ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرنے کا چاہیے جس میں ادب آزادی کے ساتھ آزادی کی فضا میں اظہار کر سکے۔ ادب آزادی کے اظہار کی ایک حقیقی صورت ہے۔ آزادی کی یہی وہ فضا اور آزادی کا یہی وہ تصور ہے جس نے فرانسیسی ادب کو دنیا کے لیے مینارِ نور بنایا ہے۔ وہاں کا ماحول

وہاں کا فرد خود کو نہ صرف آزاد محسوس کرتا ہے بلکہ آزادی کے ساتھ اپنا اظہار بھی کرتا ہے اور آزادی کا یہی احساس فرد اور معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی رویوں کا تعین کرتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ الجزائر کی جنگ آزادی کے دوران میں سارتر اور حکومت وقت کا طرز عمل ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھا۔ سارتر الجزائر کی آزادی کا حامی اور ڈی گال کی حکومت اس آزادی کی مخالف تھی۔ سارتر فرانس میں الجزائر کی حمایت کی تحریک میں پیش پیش اور حکومت وقت سے متصادم تھا۔ اسی کش مکش میں اس گھر پر ہم بھی پھینکا گیا اور پولیس نے تجویز پیش کی کہ سارتر کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے۔ جب یہ فائل ڈی گال کے سامنے آیا تو ڈی گال نے کہا کہ میں سارتر کی گرفتاری کے کاغذ پر اس لیے دستخط نہیں کر سکتا کہ یہ بات تو آنے وقت ہی بتائے گا کہ آیا میں فرانس تھا یا سارتر فرانس تھا؟ اور میں فرانس کو ہتھیار گرفتار نہیں کر سکتا اس واقعے سے اس انداز نظر اور اس انداز نظر سے پیدا ہونے والی فضا کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس سے ادب و فکر کی روح پروان چڑھتی ہے اور حقیقی جمہوریت کی فضا سے معاشرہ مہلک اٹھتا ہے۔ جمہوریت اور ادب دونوں ساتھ ساتھ چلتے اور ایک دوسرے کو مستحکم کرتے ہیں۔ ادب بغیر جمہوریت کے مڑھایا ہوا پھول ہے اور جمہوریت بغیر ادب کے ایک ہنجر رگ زار ہے۔ جمہوریت صرف کسی ایسی حکومت کا نام نہیں ہے جسے عوام نے منتخب کیا ہو بلکہ یہ ایک طرز حیات، ایک انداز فکر ہے جس میں دشمن کی بات بھی، ملکہ و قوم اور عالم انسانیت کے حوالے سے اٹھنڈے دل سے سنی جاتی ہے جس میں ذات کو فنا کر کے اجتماعی روح کو اہمیت دی جاتی ہے جس میں تعصبات سے بلند ہو کر فیصلے کیے جاتے ہیں جس میں چھوٹی سے چھوٹی رائے کو توجہ اور تحسک سے سنا جاتا ہے اور صرف اپنی طبقاتی یا علاقائی فکر کو دوسروں پر تنویر کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہمارا معاشرہ جو بنیادی طور پر جاگیر دارانہ معاشرہ ہے آج تک اسی ذہنیت کا حامل ہے۔ اس معاشرے کا بنیادی رویہ آج تک وہی جاگیر دارانہ رویہ ہے اور جاگیر دارانہ نظام جوں کہ آج کھوٹے سکے کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے

ہمارے سارے معاشرتی، معاشی اور سیاسی بحران اسی کھوٹے سکتے کو مسلسل چلانے کی ذہنیت اور کوشش سے پیدا ہو رہے ہیں۔ کج کے ادب کو جمہوریت کے فروغ کے لیے جاگیردارانہ نظام، جاگیردارانہ ذہنیت کو موضوع بنا کر اسے جلد سے جلد اپنے انجیل کو پہنچانے کے لیے وہ شعور عوام میں پیدا کرنا چاہیے کہ یہ ذہن اور ذہنیت ہمیشہ کے لیے ہمارے معاشرے سے ختم ہو جائے۔ اس نظام نے پاکستانی معاشرے کو کس کس طرح سے خواب کیا ہے اور گذشتہ ۴۲ سال سے کس طرح نئے نئے تحزبوں کو جنم دیا ہے اور کس طرح ہمارے معاشرے کا انسان جبر و استحصال کا شکار ہو رہا ہے اور کس طرح انسانیت اس کے پیروں تلے روندی گئی ہے اور کسی کیسی دردناک کہانیوں نے جنم لیا ہے۔ ان کو ادب کا موضوع بنا کر نئے شعور کو جنم دینے کی ضرورت ہے تاکہ اس نئے شعور سے پاکستان نئی دنیا کی تعمیر کر سکے۔ یہ وہ شعور ہے جس سے جمہوریت نہ صرف پروان چڑھتی ہے بلکہ فطری طریقے سے مستحکم ہوتی جاتی ہے اور وہ فضا پیدا ہوتی ہے جو ادب کی دین ہے اور جو جمہوریت کی اساس ہے۔ ادب انسان کو تعصبات سے بلند اٹھاتا ہے۔ اسے اپنی ذات سے بلند کرتا اور جذبہ ایثار پیدا کرتا ہے، اسے خود غرضیوں کے جال سے نکلاتا ہے، اسے جبر و استحصال اور آمریت کے عفریت سے آزاد کرتا ہے۔ اسے مقصد حیات کی روشنی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں جو بار بار آمریت کے دور نامہ مسطور کا دور دہوتا ہے یا اس کا دھڑکا لگا رہتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ و ڈیروں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا وہ ڈولہ ہے جو کسی نہ کسی صورت میں ہمارے ہاں بالکل بدل کر اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور صرف اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے قانون کا محافظ بن جاتا ہے اور غریب عوام بے بسی کے عالم میں منہ بٹکتے رہ جاتے ہیں۔ عوام ہی اصل قوت کا سرچشمہ ہیں۔ جمہوریت عوام کو ابھارتی، اٹھاتی اور ان کی پرودش کرتی ہے اور ادب عوام کے مسائل، ان کے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور یہی اظہار معاشرے میں اس شعور کو پیدا کرتا ہے جس سے خود جمہوریت جڑ پکڑتی اور ارتقا کی منزل سے گذرتی ہے۔ ادب کا کام اپنے معاشرے کی جڑوں کو سیراب کرنا ہے، عوام سے اپنا

رشتہ نامہ مضبوط کرنا ہے۔ ادب کے ذریعے قاری تک ان باتوں کو پہنچانا ہے جن کو اس نے ٹوٹے ٹوٹے انداز میں محسوس تو کیا تھا لیکن پوری طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ اسی احساس سے وہ شعور پیدا ہوتا ہے جو ادب کا کام اور مقصد ہے اور جو جمہوریت کے لیے تازہ ہوا کا درجہ رکھتا ہے۔ ادب زندگی کا اظہار ہے۔ وہ عہد حاضر کے تعلق سے زندگی کی ان گہریوں کو کھولتا ہے جو معاشرے کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ وہ مسائل، محسوسات اور شعور کو تو ابھارتا ہے لیکن تعقبات، تنگ نظری اور خود غرضی کو مٹاتا ہے۔ بڑا ادب وہ ہے جو ذہن انسانی کو تبدیل کرے اور اسے عمل کی طرف رجوع کرے۔ آج ہمیں ایسے ہی ادب کو سامنے لانا چاہیے تاکہ ادب عوام اور جمہوریت کی روح کا ترجمان بن جائے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ جمہوری معاشرہ آزادی کی فضا کو برقرار رکھے، ادب، ادیبوں اور ادبی قدروں کو اہمیت دے اور ان کا احترام کرے اور اُس غلامانہ ذہنیت کو ختم کرنے کے لیے علی اقدام کرے جو دو سو سالہ دور غلامی سے ہمیں ذہنی و فکری ورثے اور نظام فکر کے طور پر ملتی ہے۔ دور غلامی کی اس ذہنیت نے اب تک ملک و قوم اور جمہوریت کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ذہنیت جہاں جہاں ہمیں نظر آئے اسے جمہوری فکر سے بدلنے اور ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کرتی چاہیے۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ادیب کو جمہوریت کے ارتقا و استحکام کے لیے اپنے قلم کو وقف کر دینا چاہیے، عوام سے نیا رشتہ قائم کرنا چاہیے۔ انگریزی دور کی غلامانہ ذہنیت سے معاشرے کو نجات دلانے کے لیے قلم اٹھانا چاہیے۔ جاگیردارانہ نظام کو مٹانے کے لیے ادب کو کارزارِ عمل میں لانا چاہیے، علاقائی تعقبات پر مبنی ذہنیت سے نجات حاصل کرنی چاہیے اور سب کے لیے یکساں انصاف کو اپنی فکری اساس بنانا چاہیے۔ نیا شعور اسی انصاف کی کوکھ سے جنم لے گا اور انصاف ہی وہ حقیقی قوت ہے جس پر صحت مند معاشرہ قائم ہوتا ہے اور خاندان و حضرات ایسا درکھیے کہ ان انصافی اُس گیند کی مانند ہے کہ جسے آپ جس قوت سے معاشرے کی دیوار پر ماریں گے وہ اسی قوت سے واپس آئے گی۔ ادب، ادیب اور

جمہوریت کے حامیوں کو نا انصافی کے اس عمل میں شریک نہیں ہونا چاہیے اور قلم سے اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ جمہوریت کے ارتقا میں یہی وہ کردار ہے جو ادب و ادیب، عہد حاضر کے تعلق سے، ادا کر سکتا ہے اور اسے ہی کرنا چاہیے۔

(۳۱ اگست ۱۹۸۹ء)

اُردو نعت گوئی کا تاریخی ارتقاء

”نعت“ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تعریف و توصیف کے ہیں لیکن عربی فارسی اردو اور مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں لفظ نعت صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف اور مدح کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ اب جب بھی ہم نعت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ پارہ شاعری ہے جس میں سرور کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات کی توصیف و مدح کی گئی ہو۔

نعت کے لیے کوئی مخصوص ہیئت مقرر نہیں ہے۔ کسی بھی صنفِ سخن کی ہیئت میں لکھی جاسکتی ہے۔ یہ صنفِ سخن قصیدہ اور مثنوی بھی ہو سکتی ہے، غزل، قطعہ، رباعی یا کوئی اور صنفِ سخن بھی ہو سکتی ہے۔

نعت گوئی کا آغاز سب سے پہلے عربی زبان میں ہوا اور عربی سے اس کا رواج فارسی اردو اور مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں ہوا۔ رسولِ پاکؐ کے محبت ہمارے مذہب کا حصہ ہے۔ خود خدا نے قرآن پاک میں بار بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کی ہے۔ یہ توصیف بھی نعت کے ذیلی میں آتی ہے۔ مسلم شریف میں یہ حدیث درج ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایمان نہیں لایا جب تک میں اس کے بیٹے، والدہ اور تمام لوگوں سے نپاڑ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جب رسولؐ جزوِ ایمان ہے اور یہی حبِ رسولؐ نعت گوئی کی بنیاد ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے نعت گوئی کا رواج شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ پہلے نعت گو شاعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ

تھے۔ اسی سلسلے میں ایک اور نام کعب بن زحیر کا ہے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں نعتیہ قصیدہ پیش کیا۔ عربی نعت گوئی میں ایک بہت اہم اور ممتاز نام ساتویں صدی ہجری کے محمد بن سعید بن مسیری کا ہے جن کا قصیدہ بروئے ساری دنیا کے اسلام میں آج بھی مخصوص محفلوں میں عقیدت و محبت کے سنا جاتا ہے اور جس کے سیکڑوں تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ نعت گوئی کا یہ سلسلہ آج بھی عربی شاعری میں جاری ہے۔

عربی نعت کے زید اثر فارسی زبان میں بھی نعت گوئی کا آغاز ہوا۔ فردوسی کے شاہنامہ میں نعتیہ اشعار موجود ہیں۔ ابو سعید ابوالخیر (م ۴۳۰ھ) کی رباعیات میں نعتیہ کلام موجود ہے۔ حکیم سنائی (۵۲۵ھ) کے ہاں بھی نعتیہ کلام ملتا ہے۔ فرید الدین عطار کے علاوہ نظامی کی مثنویات خمسہ میں نعت گوئی اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔ نظامی کی مثنوی میں وہ زور کلام موجود ہے کہ آج آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود نظامی کے اشعار دل میں اتر جاتے ہیں۔ مولانا روم کی تو ساری مثنوی نعت کے ذیل میں اس لیے آئی ہے کہ روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سرِ اُٹھت کیے ہوئے ہے۔ سعدی شیرازی (۷۹۹ھ) کی ذاتِ گرامی عشقِ رسول سے سرشار تھی اسی لیے انہوں نے جو کچھ کہا وہ جریدۂ عالم پر ثبت ہو گیا۔ بلخ اعظمی، کمال، کشف الدجی، بیجا۔ تو آج تک ساری دنیا کے اسلام میں سب کی زبان پر رواں ہے۔ امیر خسرو دہلوی کا وہ عظیم پاک و ہند کی وہ عظیم اور زندہ جاوید شخصیت ہیں جن کا نام ہمارے خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔ ان کی نعتیں آج بھی محفلِ حال و قال اور محفلِ میلاد میں شوق کے سنی جاتی ہیں۔ ان کا یہ شعر تو ضرب المثل بن گیا ہے:

آفاق باگردیدہ ام مہربان درزیدہ ام

بسیار خوبان دیدہ ام اتنا تو چیزے دیگری

اس نعتیہ غزل کو آپ بھی سنئے :

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری

ہر چند و صفت ہی کم در حسنِ زانِ زیبِ باری

آفاق باگر دیدہ ام مہرستان در زیدہ ام
 بسیار غریبان دیدہ ام انا تو چیز سے دیگری
 من تو شدم تو من شدم من تن شدم تو جاں شدم
 تاکس نہ گوید بعد ازین من دیگری
 تو از پری پاک تر، و ز بگ بگل بزرگ تر
 از ہرچ گویم بہتری حقا عجب دلہری
 عالم ہمہ بخلائے تو خلق جہاں شہدائے تو
 آن تر گس شہلائے تو آوردہ دم کافی
 خسر و غریب است و گدا افتادہ در شہر شہا
 باشد کہ از بہر خدا سوائے غریبان بنگری

حضرت امیر خسرو کے بعد مولانا جامی، طبری اور قدسی کے نام نامی کہتے ہیں جن کا
 کلام آج بھی مغل سماع و میلاد میں سن کر عاشقانِ رسول اشک بار ہو جاتے ہیں۔ حضرت
 قدسی کی وہ غزل، جس کا مطلع

مرحبا سیدی مکی مدنی العسری
 دل و جان باو فدائیت چہ عجب خوش لقبی

آج بھی ہمارے کانوں میں رس گھومتی ہے۔

عربی و فارسی شاعری کی اس عظیم روایت نے اردو نعت گوئی کو بھی شدت سے
 متاثر کیا اور جب سے اردو شاعری کا آغاز ہوا نعتیہ شاعری کسی نہ کسی صورت میں ہمیں ملتی
 ہے۔ نعتیہ اشعار حسن شوقی کے ہاں بھی ملتے ہیں اور قلی قطب شاہ کے ہاں بھی۔ ملاحی اور
 نصرتی کے ہاں بھی ملتے ہیں اور ولی کنی اور سراج اور بگ آبادی کے ہاں بھی۔ گزشتہ چار پانچ
 سو سال کے عرصے میں کچھ جانے والے معراج نامے، نور نامے، قولہ نامے، وفات نامے آج
 بھی کثیر تعداد میں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ نعتیہ شاعری سودا و میر درد کے ہاں بھی اپنا
 رنگ دکھاتی اور دلوں کو گرماتی ہے اور نظیر اکبر آبادی اور غالب کے ہاں بھی۔ لیکن

وہ شعرا جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ نعت گوئی کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا ان میں کرامت علی خان شہیدی (متوفی ۱۲۵۶ھ) کا نام نعت گوئی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے :

تمنا ہے درختوں پر ترے رونے کے جاہلیے
نفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ متعبد کا
خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے
زبان پر میری جس دم نام آتا ہے محمدؐ کا

کم و بیش اسی دور کا ایک اور نام مولوی غلام امام شہید کا ہے۔ شہید سراپا عشق تھے اور انہوں نے مختلف اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ، مغلزل، مثنوی، غمسمہ، ترجیع بند میں صرف اور صرف نعتیہ کلام لکھا۔ جذب و شوق اور قدرتِ استوار اظہار نے ان کی شاعری کو گہرا اثر بنا دیا ہے۔ شہید نے میلادِ نبیؐ لکھا تھا جو میلادِ شہید کے نام سے آج بھی محفلِ میلاد میں پڑھا جاتا ہے۔ ان کے یہ دو شعر مثنوی :

بو سے کی تمنا ہے جو مینائے فلک کو

بھگتا ہے سونے گنبدِ خضرائے مدینہ

قسمت یہ دکھاتی ہے حسرت کی نظر سے

ہم دیکھتے ہیں اس کو جو دیکھ آئے مدینہ

بحرِ طوبیٰ میں شہید نے جو نعتیہ قصیدہ لکھا تھا وہ بھی پڑھنے اور سننے کے لائق ہے :

ازمقدم نور خدا، شمسِ اضیٰ، بدر اللہ جنی، نجم الہدیٰ، خیر الورد، بحرِ عطا، ابرِ سخا

کلابِ حیا، کوہِ وفا، شانِ علا، شمعِ ہما، مہرِ ضیا، ماہِ صفا، شاہِ زمن ۔

حکیم مومن خان مومن (متوفی ۱۸۵۱ء) اردو میں منفرد عشقیہ شاعری کی

وجہ سے مشہور ہیں۔ لیکن انہوں نے نعتیہ شاعری میں جس انداز کے عشقِ رسولؐ کا اظہار

کیا ہے وہ بھی منفرد و ممتاز ہے۔ مومن نے کل نو قصیدے لکھے جن میں سے ایک محمدؐ میں

ہے ایک نعت میں اور چار غزل لکھے راشدین کی مدح میں ہیں ان کے علاوہ ایک مثنوی

ایک تضحیل اور کچھ رہائیاں بھی نعت میں لکھی ہیں۔ عشقیہ شاعری کی وہ نے جو مومن کی غزلوں میں ملتی ہے نعت میں ایک ایسا والہام جوش اور گداز بن جاتی ہے کہ پڑھنے والا عشق بریل کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ویسے تو امیر مینائی کے سارے کلام میں نعتیہ اشعار ملتے ہیں لیکن ”محمد خاتم النبیین“ ان کا نعتیہ دلوان ہے جو ۶۱۸۷۲ میں شائع ہوا۔ امیر مینائی کے نعتیہ کلام میں جذب و کیف اور عقیدت و عشق نے وہ اثر و تاثیر پیدا کیا ہے کہ ان کا کلام سننے والے کی روح میں اتر جاتا ہے۔

نعت گو شعرا میں محسن کا کوروی سب سے الگ حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ساری عمر صرف اور صرف نعتیہ شاعری کی :

یہ ہے خواہش کروں میں عمر بھر تیری ہی مددای

نہ اٹھنے بوجھ مجھ سے اہل دنیا کی خوشامد کا

سوز و گداز، فکر آفرینی اور فنی شعور کے اعتبار سے محسن کا کوروی نعت گوئی میں ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا قصیدہ لایہ ایک ایسا سدا بہار تحفہ ہے جسے بڑھ کر مشاہدہ کرنا معطر ہو جاتے ہیں :

ذکوئی اس کا مشابہ ہے نہ جہر نہ نظیر

ذکوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

ادب و نعت کا قمر غزل دو عالم کا شمر

بحر وحدت کا گہر چشت کثرت کا کنول

بحر توحید کی ضد ادب و نعت کثرت کا مہر

شعب ایجاب کی لوز بزم رسالت کا کنول

مرجع روح امیں زیب دو عرش بریں

حامی دیں مستہین ناسخ ادیان و ملل

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
 میرے ایمان مفصل کا یہی ہے محل
 ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خال
 نہ مرا شعر نہ قطع نہ قصیدہ نہ غزل
 آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تادم مرگ
 شکل تیری نظر آئے مجھے جب کئے اہل
 روح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل
 کہ مری جان مدینے کو جو چلتی ہے تو چل

محسن کا کو روی کے ہم عصر اور ان کے بعد کے شعراء میں مولانا الطاف حسین
 حالی بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے نعت کو امت مسلمہ کی اصلاح و
 بیداری کے لیے استعمال کیا۔ یہی وہ لے ہے جو علامہ اقبال کی شاعری میں ایک نئے
 انداز سے جلوہ گر ہوئی۔ ویسے تو انھوں نے غزل کی ہیئت میں ہی نعت بھی ہے لیکن مدنی
 مد و جز اسلام میں جو مستند حالی کے نام سے معروف ہے، انھوں نے ولادت سے
 متعلق جو اشعار لکھے ہیں وہ آج بھی دلوں کو گرما تے اور زبان زد خاص و عام ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
 مراد میں غریبوں کی بر لائے والا
 اور اس کے کئی بند تو آپ نے سنے ہوں گے اب یہ نعت بھی سنئے !
 لے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
 اوقت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
 وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چسراغوں
 اب اس کی محاسن میں نہ بیٹی نہ دیا ہے
 جو تفرقہ اقوام کے آیا تھا مٹانے
 اس دین میں خود تفرقہ اب کسے پڑا ہے

جو دین کو ہمدرد بنی نوبہد بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں پاپ ہے
فریاد ہے اے کشتی اُمت کے نگہبان
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
کر حق سے دعا اُمتِ مروجہ کے حق میں
ظہور میں بہت جس کا جہاز کے گھرا ہے
اُمت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن

ولدادہ تراک سے ایک ان میں پڑا ہے

اس دور کے دوسرے نعت گو شعرا میں یوں تو بہت سے نام ہیں لیکن شاہ نیاز
بریلوی (متوفی ۱۸۳۳ء) بہیم شاہ وارثی اور احمد رضا خان بریلوی (متوفی ۱۹۲۱ء)
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاہ نیاز کا کلام کیفیتِ عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔ بہیم وارثی
عشقِ مجسم بن کر سامنے آئے ہیں اور حضرت احمد رضا خان بریلوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی ذات و صفات اور حیات و سیرت کو کیفیتِ عشق سے ملا کر ایک نیا رنگ عطا کرتے
ہیں۔ ان کا دیوان ”ہدایہ بخشش“ تین حصوں میں شائع ہو کر عشاقِ رسولؐ کے دلوں میں
شمعِ محبت و عقیدت روشن کر چکا ہے۔ ان کا سلام جس کا مطلع یہ ہے:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

شمعِ بزمِ رسالت پہ لاکھوں سلام

آج بھی ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔

علامہ اقبالؒ کا سارا کلام مدحتِ رسولؐ کا موثر اظہار ہے۔ انھوں نے اپنے کلام
میں دینِ اسلام کی روح کو اس طرح نعت کا رنگ دیا ہے کہ خود اقبالؒ ملتِ اسلامیہ کی
نشۃ الثانیہ کی علامت بن گئے ہیں۔ ہال جبریلؑ کی یہ غزل سُنئے جس میں سوز و گداز بھی ہے
جو نعت کی جان ہے اور خیالاتِ نو کی وہ آرزو بھی جس سے علامہ اقبالؒ کی ساری شاعری
عبارت ہے:

روح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود اکتساب
 گنبدِ آجگینہ رنگ تیرے محیط میں حجاب
 عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
 ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
 شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
 فقرِ جنید و بایزید تیرا جلال بے نقاب
 شوقِ ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
 میرا قیام بھی حجاب میرا سجدہ بھی حجاب
 تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے

عقلِ غیاب و جستجو، عشقِ حضور و اضطراب
 یہ تعارف نامکمل رہ جائے گا اگر مولانا ظفر علی خان کا ذکر نہ کیا جائے۔ مولانا کے
 ہاں نعت گوئی میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اسلوب کی وسعت بھی۔ ان کی نعتیں
 محفلوں میں عام طور پر محبوبیت کے ساتھ سننی جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں عشقِ رسولؐ سے پیدا
 ہونے والی کیفیتِ روح کو اس طرح گرمادیتی ہے کہ عشقِ رسولؐ نعت سننے والے کا ہر ذرّہ
 احساس بن جاتا ہے :

ان کی یہ نعت سنئے :

دل جس سے زندہ ہے وہ حتمًا تم ہی تو ہو
 ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو
 پھوٹا جو سینہ شبِ تارِ الست سے
 اس نورِ اقلیس کا اجالا تم ہی تو ہو
 سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
 سب غایتوں کی غایت، ادنیٰ تم ہی تو ہو

جو ماسوا کی حد سے بھی گئے گذر گیا

لے رہ نور و جادۂ اسری تم ہی تو ہو

گمرتے ہو دلوں کو حمام لیا جس کے ہاتھ نے

اے تاج دار یثرب و بلحام ہی تو ہو

اس دور میں اور اس کے بعد جن دوسرے شعراء نے نعت گوئی میں نام پایا ان میں امجد حیدر آبادی، اکبر والئی میرٹھی، سہیل اقبال، حفیظ جالندھری، بہتر آزاد لکھنوی، احمد سہیل ندوی اور مآثر القادری کے نام نمایاں اور ممتاز ہیں۔ امجد حیدر آبادی شاعری کی آواز کو رہنما کی آواز جانتے ہیں جس سے خدا کی آواز آتی ہے۔ اثر و تاثیر ان کے کلام کا جزیر ہے۔ اکبر والئی میرٹھی نے سیرت محمد کو معاشرے کے عام فرد تک نہایت پُر اثر انداز میں پہنچایا ہے۔ یانجی سلام علیک، یار رسول سلام علیک، ان کا وہ سلام ہے جو آج بھی گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔ میلہ و اکبر ان کی وہ مقبول زمانہ تصنیف ہے جو ہزاروں ہار شاخ ہو چکی ہے۔ حفیظ جالندھری انیس کے شاگرد تھے جنہوں نے شاہنامہ اسلام چار جلدوں میں لکھ کر حقیقی شاعری ادا کیا ہے۔ شاہنامہ اسلام نعتیہ ادب میں ایک ممتاز و منفرد درجہ رکھتا ہے۔ حفیظ جالندھری کی یہ تصنیف تاریخی بھی ہے اور سیرت بھی۔ اس میں جذبہ ایمانی کا درس بھی ہے اور اصلاح احوال کی تلقین بھی۔

بہتر آزاد لکھنوی کی نعتوں میں جذبہ عشق کا والہانہ بین دلوں میں اثر جانتا ہے۔ احمد سہیل ندوی کی عشقیہ شاعری اپنی سادگی و پرکاری کی وجہ سے دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ مآثر القادری کا کلام بھی عشق رسول میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کے ہاں محبت و عقیدت کے جذبہ و جذبہ اسی لیے ان کا کلام عشق کے جذبے کا پُر اثر اظہار ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کی مقبولیت ہمارے دور میں مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اب عام طور پر مجلسوں اور تقریروں میں تلاوت کلام پاک کے بعد نعت رسول مقبول پیش کی جاتی ہے۔ سرکاری سطح پر بھی نعت گوئی کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نعتیہ مشاعرے اور کلام نشر کیے جاتے ہیں۔ آج کی نعتیہ شاعری میں حالی اور اقبال کی لے بھی

شامل ہے اور محسن کا کوروی اور احمد رضا خان بریلوی کی عشقیہ سرشاری بھی۔ جدید نعت میں موضوع و ہمیشہ کا تنوع بھی قابل ذکر ہے۔ نعت گو شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جن میں حفیظ صاحب بھی شامل ہیں اور مظفر وارثی بھی۔ محشر رسول نگری بھی اور احمد ندیم قاسمی بھی۔ ان کے علاوہ یوسف ظفر، منور بدایونی، عبدالعزیز خالہ، حنیف سعدی، صبا اکبر آبادی، عارف عبدالستین، حافظ خالد حیا نوری، طفیل ہوشیار پوری، انجم رومانی، نصرت قریشی، عاصی کرتابی، شیر افضل جعفری، ناصر دیدی، یزدانی جالندھری، ذوقی مظفر نگری، اقبال عظیم، صدقہ انصاری، رشید الزمان خلش اور جعفر بلوچ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

یہ فہرست یقیناً ادھوری اور نامکمل ہے۔ اس میں بہت سے نام شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نعت گوئی کے فن اور تاریخ کا وسعت اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

نعت گوئی کا یہ ذوق نئی نسل کے شعرا میں بھی پروان چڑھ رہا ہے اور اسی لیے میرے خیال میں نعت گوئی کا مستقبل روشن ہے۔

(۲۹ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

ہائیکو کے بارے میں

ہائیکو کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند بنیادی باتیں جاپانی تہذیب کے بارے میں بھی سمجھ لی جائیں۔ جاپان کا مذہب شنتو مذہب ہے۔ شنتو کے معنی ہیں دیوتاؤں کا راستہ۔ یہ مذہب صدیوں کی معاشرت اور تاریخی عوامل کے نتیجے میں رفتہ رفتہ پروش پا کر جاپانی معاشرے کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ مذہب جاپانی معاشرے تک محدود ہے اور اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے جاپانی معاشرہ عاقبت یا حیات بعد الحیات پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے لیے یہی دنیا سب کچھ ہے۔ یہی آغاز ہے اور یہی انجام ہے اس معاشرے میں تعلیم کی سونی صد شرح کے ساتھ ذات پات کا مخصوص نظام بھی قائم ہے۔ اپنے مذہب، معاشرت اور تہذیب پر ہر جاپانی فخر کرتا ہے اور اسی لیے اپنی قوم سے حدود درجہ پیوستہ ہے۔ اس کے لیے دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں۔ ایک جاپانی اور دوسرا غیر جاپانی۔ یہ معاشرہ سمورائی تصورات پر قائم ہے۔ شنتو دیوتاؤں کا راستہ ہے اور شہنشاہ "تن نو" ہے جس کے معنی ہیں آسمانی کاشہنشاہ۔ شہنشاہیت پر جاپانی معاشرے کی نظریاتی بنیادیں قائم ہیں۔ سمورائی تصورات میں شرم، بہادری اور نیک نامی معاشرتی و جہذبی اقدار کا درجہ رکھتے ہیں۔ "ہن بو" بھی اس میں شامل ہے۔ ہن حصولِ علم ہے اور بو فوجی حرب ہے۔ نکوار جس کی علامت ہے۔ یہ وہ تصورات ہیں جن میں عالم گیر اخوت، آفاقیت، اخلاقی یا روحانی اقدار کا کوئی تصور نہیں ہے اور اسی لیے ان کے ہاں کوئی بڑا مفکر جیسے گوتم بدھ یا کنفیو شس پیدا نہیں ہوئے اور زمان کے ہاں مولا نا دہلوی، گوئٹے، غالب، اقبال یا امیگور جیسے شاعر پیدا ہو سکے۔ انھیں اثرات کی وجہ سے فکر و قلب سفر یا مابعد الطبیعیاتی تصورات جاپانیوں کے

مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے اور اسی لیے ان کی شاعری بھی کسی گہری فکر کسی گہرے فلسفے یا تصورات کا اظہار نہیں کرتی۔ انہی تہذیبی اثرات نے ان کے مزاج کی تشکیل کی ہے جس کا اظہار نہ صرف "ہائیکو" میں ہوتا ہے بلکہ ان کی دوسری اصنافِ سخن میں بھی ہوتا ہے اور اسی لیے ہائیکو شاعری ویسی ہے جیسی وہ ہیں نظر آتی ہے یعنی عام زندگی کے عام تجربوں کا دلچسپ اظہار۔ اس پس منظر کے ساتھ انہی ہم ہائیکو کی طرف آتے ہیں۔

ہائیکو جاپانی شاعری کی وہ مقبول صنفِ سخن ہے جو حیثیت کے اعتبار سے علی الترتیب ۵-۷-۵ تہجی رکنوں (Syllables) کے تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور موضوع کے اعتبار سے ان تجربات، مشاہدات اور خیالات کا اظہار کرتی ہے جن سے عام زندگی کا ایک نیا پہلو کسی خیال کا نیا رخ اور کسی بات کی نئی جہت سامنے آتی ہے۔ عام تجربے کے اسی نئے پہن کی وجہ سے ہائیکو پڑھ کر یا سن کر استغراب کے ساتھ لطف و مسرت حاصل ہوتے ہیں۔ اختصار ہائیکو کا شہن ہے۔ کنایا اس کا جوہر ہے اور اظہار کی جامعیت اس کا فن ہے۔ اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جاپانی شاعری میں آج سے تقریباً سو سال پہلے ہائیکو الگ صنفِ سخن کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ یہ اس طویل نظم کا ابتدائی حصہ تھی جسے جاپانی شاعری میں "ہانی کاٹی" کہتے ہیں اور اسی لیے اسے "ہوک کو" کہا جاتا تھا یعنی ہانی کاٹی کا ابتدائی حصہ۔ اس ابتدائی حصے کی یہ اہمیت تھی کہ اس سے طویل نظم کا مزاج اور اس کی جہت متعین ہو جاتی تھی۔ جیسے عربی شاعری میں غزل قصیدے کی تشبیہ کا حصہ تھی اور بعد میں ایک الگ صنفِ سخن بن گئی اسی طرح ہائیکو بھی انیسویں صدی کے اواخر میں ماسا کاٹسکی (۱۹۰۳-۱۸۶۷ء) کے زیر اثر، ۱۸۹۰ء میں، ہانی کاٹی سے الگ ہو کر ایک علیحدہ صنفِ سخن کے طور پر ابھری اور تیزی سے مقبول ہو گئی۔ اس صنفِ سخن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ۱۹۳۰ء میں جاپان اور چین کے درمیان جنگ چھڑی تو حکومت وقت نے پہل کی کہ ہائیکو شعراء اپنی شاعری سے جنگ کی حمایت اور حکومت کی مدد کریں۔ بہت سے شعراء نے حکومت کا ساتھ دیا لیکن کیمو یو نو ریشی ہائیکو شاعری کے بہت سے شعراء نے تعاون نہیں کیا تو بارہ شاعر گرفتار کر کے قتل بھیج دئے گئے۔ یہی

صورت ۶۱۹۳۱ میں دوسری جنگ عظیم کے دوران پیش آئی جب ۱۳ ہائیکو شاعر گرفتار ہوئے۔ پاکستان کے ہائیکو شعرا کو میرا خیال ہے ابھی خوف زدہ ہونے کی اس لیے ضرورت نہیں ہے کہ ابھی تو ہمارے ہاں اس کی ہیئت کا مسئلہ ہی طے نہیں ہوا ہے اور ابھی یہ صنفِ سخن بڑے طور پر ہماری صنفِ سخن بھی نہیں بن پائی ہے۔ اس وقت تو میں صرف اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے غزل اردو کی مقبول صنفِ سخن ہے اسی طرح ہائیکو جاپانی شاعری کی مقبول صنفِ سخن ہے اور گذشتہ سو سال میں اس صنف نے مختلف مغربی اثرات مثلاً رومانیت، فطرت پسندی، اشاریت اور پرولتاریت وغیرہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے ۶۱۹۳۷ میں جدید ہائیکو انجمن کے شعرا نے معاصر زندگی کے تجربوں سے ہائیکو کو ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ان شعرا نے موسم سے متعلق موضوعات کو ترک کر کے نظم آزاد کے اثرات کو ہائیکو میں شامل کیا لیکن یہ تین مصرعے جدید زندگی کی پیچیدگیوں کا بوجھ نہ اٹھاسکے۔

جاپانی نقادوں کا زاویہ نظر یہ ہے کہ ہائیکو نظم کسی بھی زبان میں لکھی جاسکتی ہے لیکن وہ اسی وقت ہائیکو کہلائے گی جب ہیئت و موضوع کی اس روایت کو سامنے رکھا جائے جسے جاپانی شاعر سامنے رکھتے ہیں۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ زندگی کے بھرپور گہرے تجربے ہائیکو کی ہیئت کی وجہ سے بیان نہیں کیے جاسکتے۔ یہ صنفِ سخن زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربوں کے اظہار تک محدود رہے گی اور یہی اس کا دائرہ ہے اور اسی دائرے میں ہائیکو شاعر اپنی کامیابی کا علم بلند کر سکتا ہے۔ ہمارے شاعر دو مصرعوں میں زندگی کے بڑے تجربوں، وسیع احساس اور گہرے جذلوں کا ہمیشہ سے اظہار کرتے رہے ہیں اس لیے زندگی کے عام اور سختے متھے اچھوتے تجربوں کو وہ آسانی کے ساتھ ہائیکو کے تین مصرعوں میں بیان کر سکتے ہیں۔ پھر اردو زبان میں قافیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے اور تہی رکن (Syllables) ہماری وزن و بحر والی شاعری سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی لیے ہائیکو کی ہیئت کے سلسلے میں ہمیں سوچ سمجھ کر پہلے سے طے کرنا ہو گا کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ بہر حال اردو شعرا کے لیے ہائیکو میں شاعری کرنا آسان ہی ہے اور مشکل

بھی۔ آسان اس لیے کہ جو بات سامنے آئے اسے تین مصرعوں میں بیان کر دیا جائے۔
مشکل اس لیے کہ ہائیکو کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تجربے کی تازگی ہو اور شاعر دنیا
کو ایک ذرا مختلف انداز سے دیکھ رہا ہو۔

ہائیکو کی تکنیک کے سلسلے میں 'میں' خاص طور پر اپنے شعر کی توجہ ایک پہلو کی
طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ ہائیکو جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں تین مصرعوں پر مشتمل ایک مختصر
نظم ہے۔ اگر ہمارے شعر ان تین مصرعوں کو دو حصوں میں واضح طور پر تقسیم کریں۔ پہلے حصے
میں کہی جانے والی بات ذہنی کو ایک سمت میں لے جائے اور دوسرا حصہ اسے بظاہر دوسری
طرف لے جائے تاکہ تخیلی فاصلہ دونوں حصوں میں باقی رہے لیکن جب تینوں مصرعے ایک
ساتھ پڑھے جائیں تو ان کے اتصال سے ایک ایسا نیا پہلو سامنے آئے جس سے پڑھنے
والا واقف تو تھا لیکن اس نے اس بات کو اس انداز سے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔
دونوں حصوں کے موضوعات بظاہر الگ الگ ہوں لیکن تخیلی سطح پر ان میں ربط موجود ہو۔
دونوں حصوں میں تخیلی فاصلہ نہ اتنا زیادہ ہو کہ بات مبہم ہو جائے اور نہ اتنا واضح کہ بات
سپاٹ ہو جائے اور لطفِ سخن جاتا رہے۔ ایک حصے سے ایک ایچ ابھرے اور دوسرے
سے دوسری ایچ ابھرے اور دونوں تخیل کی سطح پر اس طرح مربوط و پیوست ہوں کہ ایک حصے
سے دوسرے حصے کی تفہیم پیدا ہو پہلا حصہ دوسرے کی اور دوسرا حصہ پہلے کی اہمیت
برٹھائے۔ اردو شعر اپنی ہائیکو میں صنائعِ بدائع کا بھی استعمال کر سکتے ہیں کہ یہ ان کی میراث
ہے۔ موسم کے ذکر سے ایک طرف جاپانی ہائیکو کی روایت سے رشتہ جوڑا جاسکتا ہے اور
شعر میں کیفیتِ داخل کو پیدا کیا جاسکتا ہے۔ دیے بھی موسم ہمارے مشاہدے کا حصہ ہیں اور
ہمارے شاعروں نے ہمیشہ بہار و خزاں کو زندگی کا اشارہ بنایا ہے۔ نتیجی لہجہ (Syllable)
انگریزی و فرانسیسی کی طرح اردو زبان کی ساخت کا حصہ نہیں ہے لیکن ہمارے شعراء
مختلف بحر کے رکن کو تو ذکر ہائیکو میں استعمال کر سکتے ہیں۔

میں نے اردو ہائیکو کے وہ نمونے جو پڑھے ہیں جو جاپان ثقافتی مرکز نے شائع کیے ہیں
اور جن میں طبعِ زاوہ ترجمہ شدہ ہائیکو شامل ہیں۔ ان سب میں ایک بات تو یہ مشترک ہے کہ

یہ جاپانی ہائیکو کی طرح تین مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ بعض شاعروں نے پہلے اور تیسرے مصرعے میں قافیے کا التزام کیا ہے۔ بعض نے تینوں مصرعوں کو قافیے سے آزاد رکھا ہے۔ اکثر شعرا کے ہاں دوسرا مصرع پہلے مصرع سے بڑا ہے۔ بعض کے ہاں تینوں مصرعے مختلف لمبائی کے ہیں۔ بعض کے ہاں پہلا مصرع لمبا ہے اور دوسرا چھوٹا اور تیسرا درمیانی ہے۔ کہیں تینوں مصرعے برابر ہیں۔ یہ صورت ترجمے والی ہائیکو میں بھی ملتی ہے اور طبع نادر میں بھی۔ طبع زاد ہائیکو میں اکثر شعرا نے پہلے اور تیسرے مصرعے میں قافیے کا اہتمام کیا ہے۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ سوائے تین مصرعوں کے اردو ہائیکو میں ہیئت کی سطح پر کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہائیکو شعرا مل کر اس مسئلے پر تبادلہ خیال کریں اور اس کی ہیئت کو کوئی ایسی صورت دینے کی کوشش کریں جس سے ہائیکو کا مزید کامیاب تجربہ اردو شاعری میں کیا جاسکے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے تو اس میں ہر موضوع آسکتا ہے لیکن بنیادی طور پر ہائیکو کسی بڑے موضوع کے اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتی البتہ عام تجربے کے کسی نئے پہلوئے نئے رخ اور نئی جہت کا اظہار کامیابی سے کر سکتی ہے تین مصرعوں کو دو ٹکڑوں میں بانٹنے کا عمل مشہور انگریزی شاعر ایورا پاؤنڈ نے بھی کیا تھا اور کامیاب و پر اثر ہائیکو لکھے تھے۔ یہ خیال ہے کہ میں بھی یہی کرنا چاہیگا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ہائیکو کی ہیئت متعین کرنے کے لیے شعرا کا ایک اجلاس بلایا جائے جس میں تبادلہ خیال کر کے خصوصیت سے اس کی ہیئت اور مسائل پر بحث کی جائے۔ اب تک ہمارے ہاں ہائیکو کے نام سے جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ ہائیکو سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔ ہائیکو نہیں ہے۔

فن تدوین

فن تدوین ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہمارے ہاں بہت کم لکھا گیا ہے اور اب تک اس کے اصول و ضوابط اس طور پر مدقون نہیں ہو سکے کہ سب یکساں طور پر ان اصولوں پر عمل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ املا، روزِ اوقات اور اصطلاحات تراجم کی طرح یہ مسئلہ بھی قومی سطح پر ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ معذرت کے ساتھ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہم بحیثیت قوم مسائل کو سلجھانے کے بجائے الجھانے کا کام زیادہ تن دیں اور دل لگا کر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قومی زبان کا مسئلہ بھی آج تک ہم نے وجہ بے وجہ الجھا رکھا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ انگریزی زبان بین الاقوامی اور بڑی زبان نہیں ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ انگریزی زبان نہیں سیکھنی چاہیے۔ مسئلہ تو صرف اتنا سا ہے کہ قومی زبان کو دفتری زبان اور ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہونا چاہیے تاکہ اظہارِ مدعا کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے اور ہم دفتر اور بیرونِ دفتری بات ہر سطح پر سنبھالنے کی اہلیت کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔ حاکم و محکوم کی درجہ بندی ختم ہو جائے، ہماری تخلیقی صلاحیتیں، قومی زندگی کی ہر سطح پر پروان چڑھنے لگیں اور ہم قومی یک جہتی کی منزل کی طرف گامزن ہو سکیں۔

لفظ تدوین عربی زبان کا لفظ ہے جو فارسی و اردو میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تدوین کے معنی فارسی زبان میں "جمع نمودن و تالیف کردن" (منتخب اللغات ملاً عبدالرشید) کے ہیں اور اردو زبان کی "ذرا اللغات" میں بھی اس کے معنی "جمع کرنا، مرتب کرنا" دئے گئے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے "ایڈیشننگ" کا لفظ استعمال

ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کسی دوسرے کے کام کا طاعت کے لیے ایڈیشن تیار کرنا۔ یہ تو اس لفظ کے لغوی معنی تھے لیکن اب تدوین ایک ایسا فن بن گیا ہے جس میں بہت سی اہم باتیں بھی شامل ہو گئی ہیں اور اس کا دائرہ کار وسیع ہو گیا ہے۔ ہم فن تدوین کو تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

۱۔ نئی کتابیں یا تحریریں جب اشاعت کے لیے کسی ناشر یا مدیر کے پاس آتی ہیں تو وہ انہیں پڑھ کر یا پڑھوا کر ان کے املا کو ٹھیک کرتا ہے۔ ان کے رموز و اوقات کو درست کرتا ہے۔ حسب ضرورت پیرا گراف گھٹاتا یا بڑھاتا ہے۔ زبان دہیا کو صحیح و بہتر بناتا ہے۔ تکرار یا اعادہ کو دور کرتا ہے اور اسے اس صورت میں لے آتا ہے کہ قاری اسے آسانی کے ساتھ بغیر کسی الجھن کے پڑھ سکے۔ یہ فن تدوین ہے جس پر صاحب علم ایڈیٹر یا ایڈیٹر جنرل کرتا ہے اور اس کام کے لیے فن تدوین کے ماہروں کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے اشاعتی اداروں سے ایسے ماہرین عام طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں یا رسائل و جرائد میں وہ پچھڑپن نہیں پایا جاتا جو ہماری مطبوعات میں عام طور پر نظر آتا ہے۔ ایک ہی صفحہ پر ایک ہی لفظ کا املا دو طرح سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ مواد کی تکرار صفحات کو سیاہ کر دیتی ہے۔ ترتیب و ربط نہ ہونے کی وجہ سے تحریر سے وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ اچھی تدوین تصنیف کے حسن کو نکھار دیتی ہے۔

۲۔ اہم اور کلاسیکی مطبوعہ کتابوں کا نیا ایڈیشن تیار کرنا کہ ایک طرف اس کتاب کا ایسا ایڈیشن تیار ہو جائے جو نہ صرف مستند ہو بلکہ مختلف ایڈیشنوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں وہ بھی سامنے آجائیں۔ ساتھ ساتھ اس کے متن کی وضاحت کے لیے حواشی بھی دے دی جائیں تاکہ قاری زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے کتاب سے مستفید ہو سکے۔ ان حواشی کے ذیل میں وضاحت، اختلاف، نقطہ نظر کی تشریح، املا، رموز و اوقات، پیرا گراف، فرہنگ وغیرہ سب آجاتے ہیں مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی

کی مدد کی کتاب الطاف حسین حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" اسی ذیل میں آتے ہیں۔ لکھنا سو دا "مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی یا "لکھنا بے حرکت" مرتبہ ڈاکٹر افتاد حسن بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ایسی کتاب کو مرتب کر کے وقت صرف پہلے ایڈیشن اور مطبوعہ نسخوں کو ہی سامنے نہیں رکھا جاتا بلکہ مصنف کے زمانے یا قریب تر زمانے یا معتبر نقلی نسخوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یہاں بھی تدوین کا مقصد وہی ہے جس کا ذکر میں نمبر ایک کے ذیل میں کر چکا ہوں کہ کسی دوسرے مصنف کی کتاب کو اس طور پر مدون کر کے پیش کرنا تاکہ قاری مستند متن کے ساتھ کتاب سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔

۳۔ تدوین کی تیسری قسم میں اُن مخطوطات کی تدوین آتی ہے جو پہلی بار شائع کرنے کے لیے مرتب کیے گئے ہیں۔ یہاں بھی وہی ٹل ہوتا ہے جو مطبوعہ کتابوں کی تدوین میں ہوتا ہے لیکن یہ کام زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ اعلیٰ معیار کی تدوین کے لیے سب سے پہلے اُن سارے نسخوں کو دیکھا اور جمع کیا جاتا ہے جو موجود و معلوم ہیں۔ پھر مصنف کے اپنے ہاتھ کے نسخے کو یا ایسے نسخے کو جو مصنف کی نظر سے گزر چکا ہو یا مصنف کے قریبی دور کے نسخے کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی نقل تیار کی جاتی ہے پھر اس کا مقابلہ دوسرے نسخوں سے کر کے تعلیقات و اختلاف نسخ تیار کیا جاتا ہے۔ حواشی لکھے جاتے ہیں۔ مصنف اور اس کے دور کا تحقیق کیا جاتا ہے اور وہ ساری ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں جو اس مخطوطے کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کریں اور قاری اس تصنیف سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔ یہاں ترتیب اسلحا کو بھی خاص طور پر دیکھنا ہے۔

کتابت کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کر کے درست کرتا ہے۔ متن میں جو الفاظ رہ گئے ہیں اگر نسخہ صرف ایک ہی ہے تو انہیں بھی پورا کرتا ہے۔ اشعار یا حوالوں کے لیے متعدد کتابوں سے رجوع کرتا ہے۔ تحقیق زمانہ کے لیے کتب تواریخ و سیر کو کھنگالتا ہے۔ اگر کسی مخطوطے کا ایک ہی نسخہ موجود و معلوم ہو تو ترتیب تعلیقات و اختلاف نسخ کی دیدہ ریزی سے تو ضرور نچ جاتا ہے لیکن اس کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ باتیں میں نے ایک سانس میں ضرور کہہ دی ہیں لیکن ان میں سے ہر پہلو کے ایسے بے پیمانہ مسائل ہیں جن پر

تفصیل کے ساتھ ہیبت کچھ کہا جانا چاہیے۔ اس نوع کے مخطوطات کی تدوین کے سلسلے میں "دستور الفصاحت" از حکیم سید احمد علی خان یکتا کی تصنیف کا ذکر کیا جاسکتا ہے جسے امتیاز علی خان غزنی نے مرتب کیا ہے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ "مجموعہ نظریہ" مرتبہ حافظ محمود خان شیرانی یا تذکرہ مخزنِ نکات از قائم چاند پوری مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن کو مثل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اردو زبان کی پہلی معلوم تصنیف "مثنوی کدم را د پدم راؤ" کا ذکر میں یہاں اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ اسے میں نے خود مرتب کیا ہے۔ مخطوطات کی تدوین کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور مخطوطات کو مرتب کرنے کے فن کے کیا اصول ہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ایک الگ مقالے کی ضرورت ہے۔

فن تدوین کے بنیادی اصول تو کم و بیش یکساں ہیں لیکن نظم اور نثر کی کتابوں / مخطوطات پر ان اصولوں کا اطلاق مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ تدوین اور تحقیق کا بھی ہجرتی دامن کا ساتھ ہے تدوین بغیر تحقیق کے ممکن نہیں ہے۔ تدوین کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف صاحب علم ہو بلکہ متعلقہ علوم کی مختلف شاخوں پر بھی اچھی نظر رکھتا ہو۔ وہ ادب کی مختلف اصناف اور ان کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ لسانیات و قواعد زبان پر بھی نظر رکھتا ہو۔ اس دور کی تاریخ پر بھی عبور رکھتا ہو جس دور کے مخطوطے پر وہ کام کر رہا ہے اور وہ اس دور کے دوسرے مصنفوں سے بھی پوری طرح آگاہ ہو۔ قدیم و جدید املا، تذکیر و تانیث، متروک و مروج الفاظ سے بھی باخبر ہو۔ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ وہ کس نوع کے قارئین کے لیے یہ کام کر رہا ہے اور ان کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے قدیم دور کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضوں کا بھی پورا اندازہ ہونا چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ پیرا گراف کی کیا اہمیت ہے اور وہ کب اور کہاں قائم کیا جاتا ہے۔ کہاں اعراب لگانے کی ضرورت ہے۔ کہاں اوقاف کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ حوالے کیسے دیے جاتے ہیں۔ دوسروں کی تصانیف کے اقتباسات کو کیسے دہان میں لکھنا چاہیے۔ مختصر اقتباس اور طویل اقتباسات

کے خزانوں کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر اقتباس میں بیچ کے کوئی جملہ یا الفاظ چھوڑے ہیں تو نقطے لگا کر اسے کس طور پر واضح کرنا چاہیے۔ ذہنی دیانت داری اور معروضی انداز نظر، کام کے معیار کے لیے بنیادی شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔ بیان کا ایجاز و اختصار بھی اس لیے ضروری ہے کہ اس سے تحریر صاف و شفاف اور ابلاغ اعلیٰ سطح پر آجاتا ہے۔ یہی صورت حال پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالات کی ہے جو بغیر یکساں اصول کے مدون کیے جاتے ہیں اور اکثر مواد کا ایسا ڈھیر بن کر رہ جاتے ہیں جس پر تدوین کرنے والا کھڑا ہے اور تدوین کے اس بنیادی اصول کو رد کر رہا ہے جس کا بنیادی مقصد سوڈ کو قاری و طباعت کے لیے تیار کرنا ہے۔ ان مقالات کے لیے بھی اصول و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سب یکساں طور پر، ان کی افادیت کے پیش نظر، ان پر عمل کریں۔ اس طرح بھی اہل علم اور اساتذہ کو فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مشاعرے کی روایت

مشاعرے کی صدارت خاصا مشکل کام ہے۔ مشکل اس لیے کہ صدر کو ایک مخصوص جگہ پر بندھ کر بیٹھنا پڑتا ہے اور اس وقت تک بیٹھنا پڑتا ہے جب تک مشاعرہ اختتام کو نہ پہنچ جائے۔ پھر رستم بالائے رستم یہ کہ مستقبل میں جلسہ صدر گرامی قدر کو مسند پر بٹھا کر ایسے بھول جاتے ہیں کہ نہ صرف خاطر تواضع سے بلکہ مہمان نوازی کی رسم دنیا سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ یہ تو صدارت کا ایک پہلو تھا۔ اب دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ صدر گرامی قدر کو بے کم و کاست، ہر شعر تو جیسے سُنانا پڑتا ہے اور جب شاعر عزیز اپنے جگر پارے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترنم یا بے ترنم پیش کرتا ہے تو لحاظ کی آنکھ جھپک جھپک بھاری کے مصداق دل کھول کر داد بھی دینی پڑتی ہے۔

بہر حال یہ تو جناب صدر کا مسئلہ ہے جہاں تک مشاعرے کا تعلق ہے، مشاعرہ ایک ایسا تہذیبی ادارہ ہے جو صدیوں سے قائم ہے اور آج بھی، جب کہ رنگ و نیا بدل گیا ہے، یہ اُنسی طرح قائم و دائم ہے۔ مشاعرے ہماری تہذیبی، ذہنی اور سماجی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ یہ روایت اتنی قدیم ہے کہ اگر میں اس کی تاریخ اختصار کے ساتھ بھی بیان کرنا شروع کروں تو خود اردو ادب کی تاریخ کے چھ سو سال سامنے آجائیں گے جس میں حسن شوقی، قلی قلی شاہ اور ولی دکنی سے لے کر مرزا علی خاں آزاد، آبرو ناجی شاہ، حاتم، خواجہ میر درد، میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا تک اور محسنی، انشاء اور حرثی، ناسخ و آتش و دبیر سے لے کر غالب و ذوق، مولانا حالی اور محمد حسین آزاد تک سب شامل ہوں گے اور پھر ملت یہیں تو ختم نہیں ہو جائے گی۔ اقبال سے لے کر آج تک اس روایت

کی داستان مثنائی ہوگی۔ ایسی داستان جو دل چسپ بھی ہو اور دل آویز بھی جس میں روایت کے سارے گوشے سامنے آجائیں۔ یہ موضوع اتنا وسیع ہے اور اپنے اندر ایسے دل چسپ پہلو رکھتا ہے کہ جتنا اس پر سوچتا ہوں اتنا ہی موزع کا ذہن زما مذہال سے ماضی کی طرف سفر کرنے لگتا ہے جہاں میٹھے تیل کے چراغ کی کوسے راستہ صاف اور روشن نظر آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں اسے بیان کروں، لیکن پھر سوچتا ہوں کہ یہ بات بذاتِ خود مُشاعرے کی روایت کے مثنائی ہوگی کہ مُشاعرے میں کسی موضوع پر یکسو رہنا چاہئے، اس لیے میں مُشاعرے کے تعلق سے صرف اتنا کہوں گا کہ اچھے اشعار ہمارے جذبات کی اس طور پر ترجمانی کرتے ہیں کہ شعر شن کر زندگی کا بوجھ ہلکا اور ذہن ایسا تازہ دم ہو جاتا ہے جیسے ہم نے ابھی بھی غسل کیا ہو۔ اچھا شعر ہمارے ذہن کو نہلا دھلا کر پتھلوں کی طرح تازہ کر دیتا ہے یہ کیفیت ہر دوسری کیفیت سے الگ ہے۔ اگر آپ کریہ دیکھنا ہو کہ اس وقت مُشاعرے کے باطن میں کیا ہو رہا ہے تو آپ کسی مُشاعرے میں اشعار شن کر دیکھ لیجیے اور اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس وقت اہلِ معاشرہ کس کیفیت سے دوچار ہیں، ہوائیں کس رخ پر چل رہی ہیں تو کسی مُشاعرے میں یہ دیکھ لیجیے کہ سُنتے والے کس قسم کے اشعار پر داد دے رہے ہیں۔ مُشاعرہ مُریغ ہادُکما کا درجہ رکھتا ہے جس سے مُشاعرے کے باطن کی ہواؤں کے رخ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ پھر مُشاعرے ایک ایسی ذہنی تفریح کا درجہ رکھتے ہیں جس میں ذہن کو پورے طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے ورنہ عام طور پر جدید تفریحات میں دماغ کا استعمال کم سے کم تر ہو گیا ہے، مثلاً آپ سب ہر روز ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں، مگر کبھی آپ نے غور کیا کہ اس میں دماغ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ بس آنکھوں سے دیکھتے رہیے، کانوں سے سُنتے رہیے، باقی کام خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ مُشاعرے میں آپ کو نہ صرف دماغ سے بلکہ اپنے سارے وجود کے ساتھ شریک ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر کب مُشاعرے سے نطفہ اندوز نہیں ہو سکتے اور اسی لیے مُشاعرے میں اچھے اشعار شن کر آپ کی ذہنی محنت بہتر ہو جاتی ہے۔ پھر مُشاعروں میں اکثر ایسے دل چسپ واقعات بھی پیش آتے ہیں جو ساری عمر کے لیے آپ کے حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مجھ یاد آیا اور آپ بھی اس

واقعے سے نطف اندوز ہوں گے کہ لڑکیوں کے کسی کالج میں ایک مشاعرہ ہوا اور ایک
 اُستادِ الاساتذہ قسم کے شاعر نے بڑے دم خم کے ساتھ اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا۔
 ہمارے دل کی حسرت تجھ سے گواہ نازیں نکلی
 مگر جیسی نکلتی چاہیے ویسی نہیں نکلی!

اُستاد کو اس شعر پر خاصی داد ملی۔ داد کا سلسلہ ختم ہوا تو ایک طالبہ کھڑی ہوئی اور اُستادِ الاساتذہ
 سے نہایت شیریں آواز اور نیا زمانہ لہجے میں مخاطب ہو کر کہا "محترم و معظّم! مطلع خوب
 ہے بلکہ بہت خوب ہے، لیکن یہ تو بتائیے کہ اس میں بے چاری نازیں کا کیا تصور تھا؟"
 یہ جملہ سُنا تھا کہ سارا پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ وہ تو غنیمت جاننے کے آزادی
 نسوان کی تحریک کا زمانہ نہیں تھا اور نہ اگر یہ شعر آج پڑھا جاتا اور خواتین کی سمجھ میں کہیں
 اس طالبہ کی طرح یہ آجائے کہ اس نازین پر شاعر نے کتنا ظلم ٹھہرایا ہے تو وہ اس خیالی نازین
 کی حمایت میں جلوس نکالتیں اور مردوں کے خلاف ایسے نعرے بلند کر دیں کہ آسمان کا
 اپنی جگہ ٹھہرنا مشکل ہو جائے۔ بہر حال اچھا زمانہ تھا، خیریت سے گزر گیا۔

مجھے یاد آیا کہ ۱۹۴۵ء میں میرٹھ میں ایک انتہائی عظیم الشان مشاعرہ ہوا میں
 اُس وقت انٹر کا طالب علم تھا۔ اتنا بڑا مشاعرہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک نہیں دیکھا۔
 بزرگ عظیم کے کم و بیش سارے نامور شاعر ضریح تھے سوائے حقیقہ جالندھری کے کہ وہ
 ہندوستانی سپاہیوں میں مردانگی پیدا کر کے روزی کار ہے تھے اور اتنا پرست و گداز جگر
 نے یہ کہہ کر کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ میں جگر سے بڑا شاعر ہوں مجھے جگر سے زیادہ
 مُعاوضہ ملنا چاہیئے۔ مشاعرہ دو دن چلا۔ اس میں جوش بھی شریک تھے اور جگر بھی۔ جب
 حضرت جوش کی ہادی آئی تو رات کی سیاہی صبح کی سفیدی سے ملنے پر مائل ہو رہی تھی۔
 جوش نے رُباعیاں سُنانی شروع کیں۔ وہ ایک رُباعی سُنا تے، پھر ایک پان کھاتے، اگلے دن
 میں پیک کرتے اور پھر ایک رُباعی سُنتے۔ اس طرح انھوں نے دس بارہ رُباعیاں سُنائیں
 اور پھر کہا کہ بس اب ختم۔ لوگوں نے اصرار کیا، انھوں نے پھر پان کھایا، اگلے دن میں پیک
 کی اور پھر ایک رُباعی سُنا دی۔ دو چار رُباعیاں اسی طرح سُنا کر انھوں نے کہا "بس اب بہت"

ہو چکا : کچھ دیر پہنچال میں خاموشی رہی۔ اسی اثناء میں پیچھے کی صفوں سے ایک پہلوان کھڑا
گھوسی، کندھے پر بنیان ڈالے، کھڑا ہوا اور آواز بلند کہا : ”حضرت جوش کا جُستہ ذہن
میں رکھیے“ پہلوان ایک اور چوڑی، تھوک کے : ”اس تجلے کا سُنا سنا کر پٹیل
قہقہوں سے گونج اٹھا اور انہی قہقہوں میں مشاعرہ ختم ہو گیا۔

جوش کی بات پہلی ہے اور وہ اب مرحوم بھی ہو گئے ہیں تو ایک بات اور سن لیجیے۔
جوش صاحب نے مجھے، مولانا اعجاز الحق قدوسی اور پیر حسام الدین راشدی کو گھر پر
بٹلایا۔ ہم پہنچے تو وہ منتظر تھے، کہیں باہر سے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم میں سے کسی
نے کہا کہ حضرت ! اپنی وہ تازہ نظم ”بول اک تارے تھن جھن جھن“ سنا دیجئے۔ جوش
صاحب نے آواز دی : ”ذرا بیگ بھیج دو“ اندر سے جواب میں آواز آئی : ”ابھی
تو بیچ کر آ رہے ہو اب پھر شروع کر دیا“ یہ اُن کی نیکم تھیں۔

اب رات خاصی بھیگ چلی ہے اور شاعران کرام اور آپ سب حضرات شاعرانہ
کیفیت میں اس درجہ سرشار ہیں کہ اب میرا مزید کچھ کہنا مصلحت وقت کے خلاف
ہے۔ آپ کو متوجہ کرنے اور شاعرانہ کیفیت سے دو چار کرنے کا کام میں نے خطبہ
صدارت سے اُسی طرح کر دیا ہے جس طرح ٹیکسپیر اپنے ڈرامے کے پہلے ایکٹ کے پہلے
سین میں کرتا تھا۔ اب میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس محفل شعر و سخن میں شریک ہونے
کے لیے کمر بستہ ہو جائیں جس کے لیے آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ
سب شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ شاعرے کے آداب اور اس کی
روایت سے واقف ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ سب نہ صرف مہمان نواز ہیں بلکہ شاعروں
سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ جب ایسی محفل ہو تو خطبہ صدارت کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے
اور دیکھیے جیسے ہی یہ بات میں نے آپ سے کہی غالب کا شعر ذہن کے درجوں سے جھانکنے
لگا۔ آپ بھی سن لیجیے !

جو یہ کہے کہ رنجہ کیوں کہ ہر شک فارغ گفٹہ غالب ایک بار چڑھ کر سے سُنا کر پٹا

بچوں کا ادب

بچوں کے ادب کے سلسلے میں بات کرنے سے پہلے ایک بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ والدین کا عام طور پر اپنے بچوں کی پرورش اپنی خاندانی روایت، اپنے مزارع، اپنے خیالات و عقائد کے مطابق کرتے ہیں۔ مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ اسی لیے مسلمان ہوتا ہے اور ہندو کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ اسی لیے ہندو ہوتا ہے۔ آخر یہ کیوں نہیں ہوتا کہ ہندو کے گھر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان بن جائے؟ جیسے یہ ایک حقیقت ہے اسی طرح ہمارے ہاں بچوں کے ادب کا مسئلہ بھی اسی بات کا ایک پہلو ہے۔ اس صورت حال میں یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بچے کو ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے مہیا کریں جن سے ہمارے خیالات و عقائد کے مطابق اس کے ذہن کی نشو و نما ہو سکے۔ کئی عمر میں جب ہم اپنے بچوں کو ایسی کتابیں مہیا کرتے ہیں جو بحیثیت والدین ہمارے خیالات و عقائد کی نفی کرتی ہیں تو ہم دراصل اس عمل سے اسی مشائخ کو کاٹ رہے ہوتے ہیں جس پر ہم کھڑے ہیں۔ سارے معاشرے پر نظر ڈالیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہم اپنے بچوں کو ایسی کتابیں مہیا کرتے ہیں جن سے ہم اسے وہ نہیں بنانا چاہتے جو دراصل اسے بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کتابیں عمدہ کاغذ پر رنگ برنگی تصویروں کے ساتھ اچھی جلی عبارات میں لکھی ہوئی ہر عمر کے بچوں کے لیے بازار میں عام طور پر دستیاب ہوتی ہیں۔ اگرچہ کتاب نہ بگاڑے تو وہ صرف تصویروں سے لطف اندوز ہو کر کتاب سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یہ کتابیں ہم اچھی قیمت دے کر خریدتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے مصنفوں کی کتابیں نہایت خراب کاغذ پر، بغیر پائے، رنگ تصویروں کے ساتھ جب بازار میں نظر آتی ہیں تو انھیں والدین نہیں خریدتے اور یہ کتابیں بیرونی کتابوں

کے مقابلے میں اسی لیے کم فروخت ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں بچوں کے باقاعدہ مصنف خال خال نظر کرتے ہیں جب کہ بیرونی زبانوں میں بچوں کے مصنفین الگ ہوتے ہیں جو بچوں کی نفسیات پر اپنی قوم کی تاریخ و مزاج پر اور عہد و جدید کے تقاضوں سے اس طرح واقف ہوتے ہیں کہ ان کی کتابیں بچوں میں مقبول ہوتی ہیں۔ انھیں اپنی زبان پر پورا عبور حاصل ہوتا ہے۔ وہ عبارت میں کسی قسم کی غلطی نہیں کرتے اور ہر عمر کے بچوں کے ذخیرہ الفاظ کو سامنے رکھ کر اسی انداز سے کتابیں لکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں مصنفین عام طور پر باہر کی کتابوں کا چربہ امارتے ہیں اور چربہ بھی اس انداز سے کہ اس میں نہ لطف بیان ہوتا ہے نہ لطف قصہ۔ یہ میں عام طور پر بازار میں ملنے والی کتابوں کی بات کر رہا ہوں چند مخصوص کتابوں کی نہیں۔ ان کتابوں کا جو عام طور پر لکھی جا رہی ہیں ہماری تہذیب سے ہماری تاریخ سے ہمارے ورثے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا جیسا کہ ایک زمانے میں مشہور تھا کہ بگڑا شاہ طرغیہ گو ہو جانا تھا اسی طرح ہمارے یہاں ناکام ادیب بچوں کا ادب بن رہا ہے۔ میں نے اسی نقطہ نظر سے بچوں کی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ عام طور پر تیسرے درجے کے لکھنے والے ایسی کتابیں تصنیف کر رہے ہیں جن سے بچوں کی پیدائشی ذہانت مجروح ہوتی ہے اور بچوں کی فطری صلاحیتیں نشوونما نہیں پاتیں اور بڑے سوال تو کیا چھوٹے سوال بھی ان کے ذہن میں پیدا نہیں ہو پاتے۔

بچوں کے ادب کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ بچوں میں تخیل، تجسس اور تہیئہ کو ابھارے۔ یہ وہ بنیادی صفات ہیں جن پر ہمارے لکھنے والوں کو توجہ دینی چاہیے۔ وہ سرانجام یہ ہے کہ وہ ایسی عبارت میں اپنی بات بیان کریں جو کم سے کم لفظوں میں کہنے کی طرح صاف و شفاف ہو جس میں زبان درست ہو، بیان چست اور دل چسپ ہو۔ ایسی کہانیاں لکھی جائیں جن کا اپنی تہذیب اپنے لوگ ورثے اپنی روایت اپنی تاریخ سے گہرا تعلق ہو۔ ایسی کہانیاں جو بچوں کے تخیل کو نئی دنیاؤں کی طرف لے جائیں۔ ایسی دنیاں جن کو دریافت کرنے کی طرف ان میں مہم بنی کا جذبہ پیدا ہو، غور

کیجیے تو کج کی نسل ہماری اپنی روایت سے بڑی حد تک کٹ چکی ہے۔ ہمارے قدیم ادب سے وہ ناواقف ہے۔ باہر کی زبانوں کے ادیب اپنے قدیم ادب کو طرح طرح سے بچوں کے لیے پیش کرتے ہیں جن سے ان میں اپنے ادب 'اپنی تہذیب سے گہری دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً آج بھی اگر بچوں کے مصنفین اپنے قدیم ادب کو کھنگالیں تو انہیں بہت سی کتابوں کے لیے مواد میسر کرے گا۔ ایسا مواد جس سے بچے گہری دلچسپی لیں گے۔ مثلاً انوار سہلی، اخلاق محسنی، سیاست نامہ، الفیاضی اور ان سب سے زیادہ طلسم ہجر میں ایسا مواد موجود ہے جس کے استعمال سے بچوں کے خیال، تخیل اور تحریر کوئی دستہ دی جا سکتی ہیں جس سے ہم بچوں میں اپنے ادب و تہذیب سے گہری دل چسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ کتنے مصنفین ہیں جنہوں نے بچوں کے لیے سفر نامے لکھے ہیں، کتنے مصنفین ہیں جنہوں نے جانوروں کے مشاہدات پر قلم اٹھایا ہے، پاکستان کی پراسرار وسعت کو موضوع بنایا ہے یا ہم جونی کو مشہدات نما میں موضوع بنا کر پیش کیا ہے، کتنے مصنفین ہیں جنہوں نے بچوں کے لیے علامتی کردار تخلیق کیے ہیں؟۔

ایسی بے شمار باتیں ہیں جو اس سلسلے میں کہی جا سکتی ہیں۔ اس وقت میں اس موضوع پر تفصیل کے کچھ نہیں کہنا چاہتا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ہمیں چاہیے کہ ہمارے بہترین لکھنے والے محنت کے ساتھ بچوں کے لیے لکھیں۔ وہ بچے جو ہمارے ہیں اور جو ہمارا مستقبل ہیں اور جو اس ملک عزیز کو دوبہ بنائیں گے جو ہم انہیں بنا رہے ہیں۔ اس طرح ناشرین کو چاہیے کہ وہ ہر عمر کے بچوں کے لیے کتابیں لکھوائیں اور انہیں اس طور سے شائع کریں کہ بچے ان کی طرف متوجہ ہوں، انہیں شوق سے پڑھیں۔ بچوں کو اتنی بڑی تعداد میں کتابیں پڑھنے کے لیے چاہئیں کہ اگر ہم سب مل کر کھٹے گا پر درگم بنائیں تو بھی ان کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ بچہ بہت تیزی سے کتابیں پڑھتا ہے۔ ایک کتاب عام طور پر دو چار دن میں پڑھ ڈالتا ہے اور پھر نئی کتاب کا طلب گار ہوتا ہے اس کی ضرورت پوری کرنا ہمارا قومی و اخلاقی فرض ہے۔

اس وقت جو عالم طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بچپن سے اپنے بچوں کو کتابیں پڑھنے کی عادت نہیں ڈالتے۔ انھیں ضرورت کے مطابق کتابیں دیا نہیں کرتے۔ ان میں کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا نہیں کرتے اور جب عمر مکمل ہوتی ہے تو ہم بچوں کی عادات مطابق مطالعہ مذکوروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس لیے اس وقت لکھنے والوں سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ محنت سے اوجہ سے بچوں کے لیے کتابیں لکھیں۔ بچوں کے لیے کتابیں لکھنا بڑوں کے لیے کتابیں لکھنے سے کم مشکل نہیں ہے اور ساتھ ہی ناشرین سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ بچوں کی کتابیں بہت محنت و توجہ سے چھاپیں۔ اس میں منافع بھی ہے اور کار خیر کا عمل بھی۔ یہ ایک ایسا کام ہے جسے بغیر کسی تاخیر کے اب ہمیں فوراً شروع کرنا چاہیے۔ ایسی کتابیں ہرگز شائع نہ کریں جس سے معاشرے میں چوراپکٹوں، ڈاکوؤں، ظالموں، جاہلوں اور نفسیاتی مریضوں کا اضافہ ہو، جن سے ہماری اخلاقی تہذیب پر ہاد ہوں اور جن سے ہمارے بچے خراب ہوں۔

جدید افسانے کے بالے میں

اس وقت میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو افسانے پر پیغمبری وقت آچکا ہے۔ وہ افسانہ نگار جنہوں نے تیسری، چوتھی یا پانچویں دہائی میں لکھنا شروع کیا تھا اب اپنے عروج پر پہنچ کر یا تو نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں یا پھر اب خود کو دھڑا رہے ہیں۔ نئے لکھنے والے، جو ادب کی دنیا میں پچھٹی یا ساتویں دہائی میں داخل ہوئے، انھیں علامتی افسانوں کا بھیڑپا اٹھانے گیا۔ ان کے افسانوں میں نہ علامت نے روشنی کی اور نہ تحریر کے حسن نے اثر پیدا کیا۔ یہ ایک تجربہ تھا جو ہوا اور ادب میں تجربہ ہونا چاہیے اور ہوتے رہنا چاہیے۔ لیکن یہ تجربہ، تجربہ کی منزل سے آگے بڑھ کر تحقیق فن کی سرحدوں تک نہ پہنچ سکا۔ چند افسانوں کے علاوہ، عام طور پر علامتی افسانے تحقیقی سطح پر کم زور اخبار اور علامت نگاری کی ناکامی کی داستان سناتے ہیں۔ بعض افسانہ نگاروں نے افسانے کو نثری نظم بنانے کی کوشش کی لیکن افسانہ نہ تو شاعری ہے اور نہ نظم ہے۔ اس لیے افسانہ اپنے منصب سے ہٹ گیا۔ ہم گزشتہ دس سال میں کسی علامتی افسانہ نگار کی کسی ایک کہانی کا نام نہیں لے سکتے جسے ہم ادب کا شاہکار کہہ سکیں اور تاریخ ادب اسے اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کہا ہے کہ اردو افسانے پر پیغمبری وقت آچکا ہے۔ ابلاغ ہر ادبی تحریر کی فنی ضرورت ہے۔ ایک ابلاغ وہ ہے جیسا کہ منٹو کی کہانیوں میں ملتا ہے یا عصمت چغتائی، واجدہ نگہ بیدی، کرشن چندر اور غلام عباس کے ہاں ملتا ہے۔ کہانیوں کے ذریعے زندگی آپ کے خون میں اُتر کر گردش کرنے لگتی ہے۔ ایک ابلاغ وہ ہے جو علامتی ہونے کے باوجود اپنے قاری کو گرفت میں لے لیتا ہے جیسا انتظار حسین کے افسانے ”شہرِ فسوس“ میں یا ”آخری آدمی“ میں جو

غور کرنے سے قاری تک پہنچ جاتا ہے لیکن وہاں بھی نثر کا حسن اور اظہار کی تخلیقی قوت بنیادی طور پر اپنا کام کرتی ہے۔ تیسری قسم ابلاغ کی وہ ہے کہ افسانہ نگار افسانے کو علامتی بنانے کے لیے اس میں ابہام کو اس طور پر شعوری طور سے شامل کرتا ہے کہ افسانہ پڑھنے والے سے اس کے اچھے ادبی ذوق کے باوجود ابلاغ نہیں کرتا۔ کائنات کے افسانوں کو غور سے پڑھنے سے ایک اچھے قاری کو ابلاغ کی دولت ہاتھ آجاتی ہے اور اس کے افسانوں کی نثر تخلیق کی سطح پر پُر اثر اور بامعنی رہتی ہے۔ ایک ایک لفظ نیا نکلا۔ ایک ایک جملہ اپنی جگہ جمایا۔ یہ سلیقہ ہمیں جدید اردو افسانہ نگاروں میں کم کم نظر آتا ہے بعض افسانہ نگاروں کے افسانوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو نثر کی روایت اور اس کے مزاج سے کم دیش بے خبر ہیں۔ انھیں اظہار پر اس لیے قدرت حاصل نہیں ہے کہ انھیں اپنی بات اس زبان میں جس میں وہ لکھ رہے ہیں کہنے کی نہ مشق ہے اور نہ وہ مطالعہ حراچی تحریر کے لیے ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے نئے افسانہ نگاروں کو اچھی نثر لکھنے، اس کی مشق کرنے اور اردو ادب کی کلاسیکی اور جدیدہ تحریروں کو تسلسل کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نیا تخلیق نہیں ہو سکتی۔ لیکن گزشتہ چند سال سے ہمارے بعض لکھنے والوں میں اس کا احساس پیدا ہوا ہے اور اب افسانہ علامت سے ہٹ کر زندگی کی ظہر دوبارہ لوٹ رہا ہے۔ اب علامت بجائے جدید افسانے کا ماتمی ہے اور زندگی سے تعلق تو افسانے کا نیا دھماکا ہے۔

آخر میں نئے افسانہ نگاروں سے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ کراچی شہر پاکستان کا سب سے بڑا اور ایک جدید صنعتی شہر ہے۔ جدید صنعتی شہر کے سارے مسائل مصائب اس شہر کے خون میں گردش کر رہے۔ اس کے چتے چتے پر کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ وہ کہانیاں جن میں انسانی مسائل اپنے گہرے دکھوں کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ ہمیشہ آواز ہیں۔ وہ نفرتیں جو خون آلود ہیں۔ وہ تعصبات جو بظاہر ناقابل عبور ہیں۔ وہ سڑکیں جن پر دھوپ ہی دھوپ ہے اور وہ گلیاں جن میں کبھی سورج کی کرن نہیں پہنچتی۔ وہ شفا خانے جہاں موت کا کرب کر دینے لے رہا ہے۔ وہ معاشرہ جو رشوتوں پر چل رہا ہے۔ وہ عوام جو بے آواز ہیں، وہ جاگیر دار اور سرمایہ دار جو عوام کو کھاتا ہے ہیں۔ سیاست کا

سوانگ رچلنے والے وہ بے اخلاق لوگ جو نفرتوں کے گرم خون پر پل رہے ہیں اور نفرتوں کے سانچوں کا زہریلا نسل کے خون میں شامل کر رہے ہیں۔ وہ مفاد پرست جو غلام کو بے شعور اور نابینا رکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ صاحبان اختیار جو تاریخ کو نظر انداز کر کے صرف اپنے بے زندہ ہیں۔ وہ سفاک مافیاء انسانی قدروں کا خونی ہے۔ یہ شہر جدید صنعتی زندگی کی حقیقی کہانیوں کا شہر ہے۔ آپ اس شہر کو دیکھیے۔ یہ آپ کی کہانیوں کا مستطریح ہے۔ اس عمل سے آپ نیا افسانہ پیدا کریں گے۔

(۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء)

عزیز احمد — ایک جائزہ

۱۹۷۸ء میں پر بہت بھاری گندرا بہت سے نام ورا سب دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے جدا ہو گئے۔ ابتدا پر و فیروز محمد حسن عسکری کی وفات سے ہوئی تھی۔ یہ جنوری کا مہینہ تھا اور اس کا ڈراپ سین پر و فیروز عزیز احمد کی وفات پر ہوا۔ یہ دسمبر ۱۹۷۸ء کا مہینہ تھا۔ انیس ناگ بات یہ ہے کہ عزیز احمد کی وفات کی خبر کراچی کے صحت ایک اخبار میں پہلی اور وہ بھی اتنی مختصر تھی کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اُس شخص کی وفات کی خبر ہو سکتی ہے جس نے تقریباً چالیس سال انہایت سنجیدگی کے ساتھ ادب و علم کی خدمت میں گزارے اور اپنی سدا بہار تخلیقات و تصنیفات سے زمان و ادب کو مالا مال کیا اور اردو ادب کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادبیات کی سطح پر لانے کے لیے دو کام کیا جو تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ عزیز احمد اردو کے اُن چند ادیبوں میں سے ایک تھے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اور جن کی تحریریں دنیا بھر کے علمی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔

خواتین و حضرات ! یہ تعلقات عامہ اور اشتہار بازی کا دور ہے۔ اشتہار کے سہارے جس طرح صنعت کار اپنی گھٹیا مصنوعات بھی بازار میں فروخت کر سکتا ہے اور غریب نے والا اشتہار کے جادو کے اثر سے اُسے اعلیٰ اور مثالی چیز سمجھتا ہے اسی طرح ادب و فن میں بھی اب اشتہار بازی نے چھ اور بڑے اعلیٰ و ادنیٰ حقیقی و غیر حقیقی، اعلیٰ اور نقل کا امتیاز مٹا دیا ہے۔ میرا نے کئی لکھنے والوں کو کہتے سنا ہے کہ صاحب مرنے کے بعد ہماری تحریریں کا کیا ہوا گا۔ اس سے ہمیں کیا واسطہ۔ ہمیں تو اس سے مطلب ہے کہ ہماری زندگی میں ہمارے لکھے ہوئے الفاظ کیسے کہتے ہیں؟ یہ وہ دوکان دارانہ ذہنیت ہے جس نے تخلیق اور علم و ادب کو اس کے

منصب سے ہٹا دیا ہے۔ اسی لیے آج ہمارا ادب اخباروں کے صفحات پر تخلیق ہو رہا ہے۔ اس میں بھی کوئی بڑائی نہیں تھی اگر نکلنے والا نامی دوکان دار بن کر صرف پکری پڑھانے کی ذہنیت کا شکار نہ ہوتا۔ اسی لیے آج کی کہر کو دفعتاً میں ادیب، دانشور، عالم اور بظاہر ادیب، بظاہر دانشور اور بظاہر عالم میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ سید راہاؤڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "غیر سنجیدہ فن کار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ سنجیدہ وغیر سنجیدہ فن کار میں تیز نہ ہونے دے۔" اسی ذہنی منظر نے سنجیدہ و حقیقی فن کار عزیز احمد کی عظمت کو ہماری نظروں سے اوجھل رکھا اور جیسا کہ فتح محمد ملک صاحب نے بتایا ہے کہ ایک سابق پروفیسر اور حال پورہ کریٹ نے نظم کرسی میں لکھ کر یہ کہہ دیا کہ وہ "صاحبی آدمی" تھے۔ فتح محمد ملک نے اس پر بھی بتایا ہے کہ عزیز احمد کی حرکت آلا راتصنیف "اقبال" ایک نئی تشکیل کو ایم۔ اے کے نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جس نے ہمارے معاشرے کی تہذیبی، فکری اور تخلیقی فضا کو زہر آلود کر رکھا ہے۔ سنجیدہ فن کار قدر شناسی سے اسی طرح بے نیاز ہوتا ہے جس طرح عزیز احمد تھے۔ عزیز احمد نے کبھی نام و نمود یا اشتہار بازی کے ذریعے شہرت بٹرانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ایک سنجیدہ فن کار کی طرح ہمیشہ کام کو اہمیت دی اور جب تک زندہ رہے کام اور صرف کام کرتے رہے۔ میرے اور عزیز احمد کے تعلقات کی تاریخ بائیس تیس سال پہلے ہوئی ہے۔ اس قلم عرصے میں میں نے انھیں اپنے بارے میں کبھی دُور کی چیز نہیں دیکھا۔ اگر کبھی ان کے فن یا ذات کے بارے میں کوئی گفتگو میں کرتا تو ان کے چہرے پر نئی نئی دُور کی دُور کی طرح حیا کی مٹخنی دوڑ جاتی۔ ان میں ایک سچے فن کار اور بڑے ادیب کا ایسا انکسار تھا جو اس دور میں خال خال نظر آتا ہے۔

عزیز احمد ۱۹۱۳ء کو ماہ بنگی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں جامعو عثمانیہ سے بی۔ اے اور ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا اور اسی سال جامعو عثمانیہ میں انگریزی کے پیکچر مقرر ہوئے جہاں ترقی کر کے کچھ عرصے کے بعد ریڈر اور پھر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں عزیز احمد پاکستان گئے اور حکومت پاکستان کے قلم و مطبوعات کے محکمہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس محکمے سے وہ ۱۹۵۷ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ لندن

یونیورسٹی کے اورینٹل اور افریقن اسٹڈیز کے اسکول میں اردو اور ہندی اسلام کے شعبے میں لیکچرر مقرر ہوئے جہاں وہ ۱۹۶۲ء تک رہے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو کر ٹورانٹو یونیورسٹی (کناڈا) کے شعبہ اسلامیات سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں پروفیسر بنادیا گیا جس پر وہ ساٹھ سال تک فائزرہے۔ وہاں ان کے کام کی اہمیت و وقعت کے پیش نظر انھیں رائل سوسائٹی آف کناڈا کا فیلو مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی آف لندن نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا۔ عزیز احمد پہلے پاکستانی تھے جنھیں یہ اعزاز ملے۔ یہ اعزاز عزیز احمد کے لیے ہی باعث فخر نہیں تھا بلکہ خود پاکستان کے لیے بھی باعث افتخار تھا لیکن کتنے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے اور کتنے لوگ ہیں جو علم و ادب کے اس مرتبے پر پہنچے ہیں اور اپنی تصانیف سے پائے ادب و ذہن پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

عزیز احمد کئی زبانیں جانتے تھے۔ فرانسیسی اور جرمنی کے علاوہ انگریزی ان کے لیے علمی اظہار کی زبان تھی، فارسی ان کی تہذیبی زبان تھی اور اردو ان کی تخلیقی زبان تھی۔ ان سب زبانوں پر وہ بہت اچھی قدرت رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۹ء میں وہ لندن کے ایویں کی ایک سینیلائی کا لٹرنس میں شرکت کے لیے فرینکفرٹ آئے تھے اور میں پاکستان سے گیا تھا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے حکومت ہند کے نائب صدر اور مشہور فلسفی رادھا کرشنن آئے تھے۔ شام کو ایک دعوت میں، جو صدر جرمنی کی طرف سے سارے مندوبین کو دی گئی تھی، میں رادھا کرشنن ایک نہایت حسین فوجوان ایرانی لڑکی سے بہت دیر سے اور بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسرت دیدنی تھی۔ اس شمع مصل کو اور بہت سے پردوں نے بھی گھبرکھا تھا۔ وہ فارسی اور فرانسیسی جانتی تھی۔ عزیز احمد صاحب نے فارسی میں اس کا نام پوچھا۔ اس نے منیزہ بتایا۔ میں نے ہم سن کر فردوسی کا مصرع پڑھا۔

منیزہ منم دخترا فراسیاب

وہ ہنسنے لگی۔ اس کے فوراً بعد عزیز احمد پہلے فارسی میں اور پھر فرانسیسی میں اس سے بڑی روانی سے باتیں کرتے رہے اور وہ باتیں اتنی دل چسپ تھیں کہ کچھ ہی دیر بعد عزیز احمد شمع

بن گئے اردو پروانہ، اُس دن عزیز احمد نے بے شمار فارسی اشعار سنائے۔ خیر یہ تو جملہ "مستغز" تھا۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ مرحوم کو جتنی زبانیں آتی تھیں ان پر انھیں مکمل قدرت تھی۔

عزیز احمد کی شخصیت اتنی گونا گوں ہے کہ اس کے تعارف کے لیے ایک طویل مقالے کی بھی نہیں بلکہ پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ عزیز احمد نے اپنی قلم کاری کا آغاز نکلش اور تراجم سے کیا۔ ان کے دو ناول "ہوس" اور "مرمر اور خون" ۱۹۴۳ء تک شائع ہو چکے تھے۔ اسی سال انھوں نے ابن سینا کے ڈرامے "لوگ ریٹ بلڈز" کا مختار اعظم کے نام سے ترجمہ کیا اور ایک منظوم ڈرامہ "عمر خیام" بھی لکھا۔ مارسلو کی "بوطیقا" اور دانٹے کی Divine Comedy کا ترجمہ "طربہ خداوندی" کے نام سے کیا۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے اپنا تیسرا ناول "مگرچہ" لکھا جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا جس کا ہیرو ٹیم آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کر کے تربیت کے لیے لندن جاتا ہے۔ یہ کردار جب بین الاقوامی پس منظر میں زندگی گزارتا ہے تو کیا طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔ نعیم کے کردار میں اس دور کے نوجوانوں کے تمام رجحانات و میلانات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ناول کے اعتبار سے یہ اردو کا ایک کامیاب ناول ہے۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے اپنا ناول "گل لکھا جو" ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۲ء تک کشمیری معاشرے کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا وہ ناول شائع ہوا جسے آج ہم اردو زبان کے بہترین ناولوں میں شمار کرتے ہیں اور جسے ہم سب "ایسی بلندی ایسی پستی" کے نام سے جانتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں اس ناول کا ترجمہ پروفیسر رالف رسل نے انگریزی میں کیا جسے یونیورسٹی کو نے شائع کیا۔ ۱۹۵۰ء میں عزیز احمد کا آخری ناول "شبہنم" شائع ہوا۔ ان سب ناولوں میں عزیز احمد نے اپنے دور کی روح کو لفظوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اُس وقت خود عزیز احمد جوان تھے اور اُن کی عمر ۳۲ سال تھی۔ عزیز احمد کی ناول نگاری نے اردو ناول کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان ناولوں کے بغیر ہم اس دور کی معاشرت و رجحانات، اس کے تضاد اور کشاکش کا عرفان حاصل نہیں کر سکتے۔

اردو ادب میں یہ دور روایت شکنی کا دور تھا اور پرانی اقدار اور رسوم کے خلاف بغاوت کا ایک سیلاب تھا جو نوجوان نسلوں کے ذہنوں میں موجزن تھا۔ فرانٹز کے نظریے

جنس میں انسانی جبلت کے نئے امکانات نظر آ رہے تھے۔ ڈی۔ ایچ۔ لائٹس منٹو کا بھی بہرہ فائدہ عزیز احمد کا بھی۔ منٹو نے افسانوں کے ذریعے اود عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں انسان کی اس جبلت کو موضوع بنایا۔ ان ناولوں پر فرانسیسی حقیقت نگاری کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ان سب ناولوں میں ”فرد“ ہم ہے لیکن ”ایسی بلندی ایسی پستی“ میں ان کا زاویہ نظر بدل جاتا ہے اور وہ فرد کے مطالعے سے جاگیردارانہ معاشرے کی ہیئت اجتماعی کا اتنی فن کاری سے عطا کر کے ہیں کہ اس ناول میں فرد کا المیہ ایک تہذیب کا المیہ بن جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ محمد حسن عسکری مرحوم نے سرعامی ”اردو ادب“ لاپور میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ اردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے۔ اس دور میں جاگیردار امراء کی تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ سارے برصغیر میں یہی صورت حال تھی۔ یہی صورت ہمیں ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول ”شام لودھ“ میں نظر آتی ہے۔ ”ایسی بلندی ایسی پستی“ میں حیدر آباد کو کن کا طبقہ امراء موضوع بننا ہے اور ”شام لودھ“ میں لکھنؤ کا یہی طبقہ موضوع ہے۔ دونوں ناولوں میں انفرادی کردار ایک مخصوص تہذیب کے ذہن، انکسار اور نظام کے اجتماعی زوال کی کہانی سناتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناول ”شبشم“ میں پھر تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں وہ عشق کو ”گریز“ کے انداز سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان کے دل میں اب اپنی شکل بدل رہی ہے۔ اس کے بعد عزیز احمد نے کوئی ناول نہیں لکھا البتہ ایک تاریخی ناول ”نیور کا اردو“ میں ترجمہ کیا۔ اسی کے ساتھ تاریخ ان کے یہاں طویل افسانوں کا موضوع بننے لگی اور قدیم تاریخ جدید شعور کی ترجمانی کرنے لگی۔ ”زین تاج“، ”خندگب جستہ“ اور جب آنکھیں آہیں پوش ہوئیں“ ان کی وہ لازوال کہانیاں ہیں جنہوں نے اردو ادب کی میرٹ کو پیش پایا بنا دیا ہے۔ جلیلہ ہاشمی نے جب عزیز احمد کے ناول ”ایسی بلندی ایسی پستی“ کو دوبارہ شائع کیا تو ۱۸ نومبر ۱۹۷۶ء کو ایک خط میں مجھے لکھا کہ ”اُن سے لاشا فرمائیں کہ تین جلدیں مجھے روانہ کر دیں“ میں بہت ممنون ہوں گا۔ اُن سے یہ بھی لاشا فرمائیں کہ میری جو اردو دکتا ہیں وہ چاہیں دوبارہ شائع فرما سکتی ہیں۔ خاص طور پر میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے آخری تحریری دور کے طویل افسانے، جو زیادہ تر ”نیادوز“ میں شائع ہو چکے ہیں، وہ ایک جلد میں جمع کر کے شائع فرمائیں اور اگر آپ خود اس جلد کا ”دیباچہ“ لکھیں تو میری بڑی عزت افزائی ہوگی نہ پھر یہ ہوا کہ جلیلہ ہاشمی یہاں ہوئیں اور

اس کے ساتھ ان کا اشاعتی منصوبہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک اور خط میں عزیز احمد نے مجھے لکھا کہ ”وہ حصہ جو ”نیادور“ میں میرے متعلق ہو گا اس میں ”تصورِ شیع“ اور ”جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں“ ضرور شامل کیجیے گا۔ یہ دونوں کہانیاں ”نیادور“ کے اگلے شمارے میں پھر شامل ہوئیں۔ ان کہانیوں میں عزیز احمد نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

عزیز احمد نے اپنے مختصر اور طویل افسانوں میں روایت، اساطیر اور تاریخی شخصیات کو موضوع بنا کر ان کے گرد ایسے افسانوی تار و پود بٹنے جن سے وہ شخصیتیں ایک نئے رنگ میں زندہ ہو کر ہمارے جدید شعور کا حصہ بن گئیں۔ یہ افسانے تہذیبی اور وایتی سرمائے کو جدید زمانے سے ہم آہنگ کرنے کا بہترین اظہار ہیں۔ جدید دور ماضی میں خود کو کیسے تلاش کر سکتا ہے اس تخلیقی عمل کی یہ افسانے خوب صحت اور بہترین مثالیں ہیں۔ زریں تاج، ”تصورِ شیع“ ”مدنِ سینا“ اور صدیاں تک حیات، ”جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں“ اور خدنگ جستہ کو اردو ادب میں اتنا بڑا مزہ حاصل ہے کہ کج تک ایسے افسانے اردو میں کوئی اور نہیں لکھ سکا۔ یہ افسانے اپنے فنی حسن، کمال اختصار اور طرزِ ادا کے لحاظ سے دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ عزیز احمد کا اصل فن یہ ہے کہ وہ موجودہ شخصیات یا تاریخی کردار اور علامات کو اپنے زمانے کے جذبات و احساسات کے ساتھ اتنی فنی چابک دستی کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ روایت کا سلسلہ و در سلسلہ اس کی گہرائیاں اور اس کی وسعت سمٹ کر زمانہ حالی میں آجاتی ہیں۔ عزیز احمد نے ان افسانوں میں کلاسیکی حسن کو چھو لیا ہے۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے: ”رقصِ ناتھم“ اور ”بیکار دن“ بیکار راتیں“ شائع ہو چکے ہیں۔ اگر عزیز احمد کچھ اور نہ بھی کرتے تو ان ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے اردو ادب میں زندہ رہتے۔ لیکن ایک بڑے ذہن کی طرح ان کا ذہنی سفر جاری رہا۔ وہ کسی منزل پر تھک کر نہیں بیٹھے بلکہ ہر منزل سے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے نئے سفر کا آغاز کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد اب ان کی تخلیقی، علمی و ادبی زندگی کے نئے سفر کا آغاز ہوا ہے۔

عزیز احمد کی پہلی تنقیدی تصنیف ”ترقی پسند ادب“ نے اپنے دور میں وہ کام کیا جو بہت کم کتابیں کرتی ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب نئے خیالات، میلانات اور رویوں کا سیلاب

کیا ہوا تھا اور اس سیلاب میں تعصبات کا کوئی کرکٹ اور پارٹی لائن کاریت خاصی مقدار میں
 بہہ کر چکی تھی۔ عزیز احمد نے معروف ذہنی انداز سے اس دور کے میلانات کا تجزیہ کیا۔ اس کتاب
 نے اس دور کے کھنچنے اور پڑھنے والوں کو بھرے غور کرنے اور مسائل و رجحانات کا جائزہ
 لینے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے ماضی اور روایت کی اہمیت پر زور دیا۔ تخلیق کے لیے
 فن، ہیئت اور بیان کی اہمیت واضح کی، ادب اور پروپاگنڈا کو الگ الگ خانوں میں رکھا۔
 اس تصنیف میں انھوں نے حقیقت نگاری اور انقلاب کے نئے رجحانات کا تجزیہ
 کرتے ہوئے فن کو سہاست و تعصب کی بھیئت نہیں چلنے دیا۔ عزیز احمد کی سب سے بڑی
 خوبی یہ تھی کہ وہ ایک معروف ذہنی اور کھلا و ماخ رکھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کو خانوں
 میں نہیں بانٹا بلکہ اُسے ایک اکائی کے طور پر دیکھا جو ہر دم رواں دواں آگے بڑھتی رہتی ہے
 اور جس میں حال کی طرح ماضی بھی ضمیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کو بھی انھوں نے کھلے
 ذہن سے دیکھا ہے اور "اقبال" ایک نئی تشکیل "میں جس طرح اقبال کا مطالعہ کیا ہے،
 جس طرح اقبال کے ذہن سے متعلق ان تمام مباحث کو سمجھا ہے، جس طرح اقبال کے فن اور خیال
 کی وضاحت کی ہے، آج بھی یہ کتاب اقبال پر ہزاروں لاکھوں صفحات لکھے جانے کے باوجود ایک
 ایسی اہم کتاب ہے جس کے بغیر اقبال کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے دور میں اقبال کا
 الیہ یہ ہے کہ ہم نے ان کا مطالعہ ایک مجاہد کی حیثیت سے کیا ہے اور اس طرح اس فکر کو جسے
 اقبال نے تشکیل دے کر آگے بڑھایا تھا، ہم نے بند باندھ کر وہیں روک دیا ہے۔ فکر انسانی
 تنقیدی نظر سے ابھرتی ہے، تجزیہ سے نشوونما پاتی ہے، اختلاف و تضاد کے تضاد سے
 آگے بڑھتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں صرف سجادہ نشینوں اور محامدوں کے ذہن سے نہیں بلکہ خود
 اقبال کی طرح کھلے ذہن سے زندگی اور فکر کا مطالعہ کرنے سے نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔
 جب تک ہم اپنے موجودہ رویے کو نہیں بدلیں گے، ہمارا معاشرہ اسی طرح خود غرضیوں، نسلی
 پستیوں، ذہنی فریب، اترسم کے تعصبات اور بے سرو پا جذبات کی دلدل میں دھنسا رہے گا۔ یہی
 کھلا ذہن عزیز احمد کو فکر و تحقیق کی طرف لے گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ برہمنی ذہن انسان دوستی کے
 حوالے سے انھیں اپنے عظیم تمدن اور تہذیب کے ورثے سے دور کر کے خالص ہندوستانی

اساطیر کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اقبال نے اپنی فکر و شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو ان کی تہذیب و تمدن کے ورثے سے نہ صرف باخبر کیا تھا بلکہ علمبرو حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر ایک نظام فکر کو تشکیل دینے کے لیے بے شمار مسائل اٹھائے تھے۔ ان مسائل کا جواب اور حل کی تلاش ہمارا فریضہ تھا۔ ہم یہ فریضہ کھلے ذہن سے پورا کر سکتے تھے لیکن مجاہدوں نے ہماری نسل کے ذہن کو خوف سے گندا کر دیا اور فکر اقبال کے ارتقا کو روک دیا۔ کیا فکری سطح پر یہ ہمارا قومی المیہ نہیں ہے؟

۱۹۵۷ء کے بعد عزیز احمد نے خصوصاً مسلمانوں کی تہذیب اور فکر کا مطالعہ شروع کیا۔ اب وہ ادب سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ان کا آخری افسانہ "قیری دلبری کا بھرم" "نیا دور" کراچی کے شمارہ نمبر ۲۵-۲۶ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں لکھی۔ اب انھوں نے انگریزی زبان میں مضامین اور تصانیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا جن کا موضوع مسلمانوں اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ تھا۔ جب ان کی پہلی کتاب Studies In Islamic Cul-

ture in the Indian Environment ہوئی تو علمی حلقوں

میں اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب Islamic-

Modernism In India and Pakistan شائع ہوئی اور

Self Statement In India and Pakistan شائع ہوئی

تو بین الاقوامی حلقوں میں ان کی علمی و تحقیقی حیثیت محکم ہو گئی۔ اس عرصے میں انھوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے جو بین الاقوامی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کی دو اور قابل ذکر تصانیف An Intellectual History of Islam in India اور

History of Islamic Sicily بھی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں اٹلی کی

حکومت نے آخر الذکر کتاب پر انھیں انعام دیا۔ عزیز احمد کی یہ خواہش تھی کہ میں

Islamic Modernism - Studies in Islamic Culture

in India and Pakistan کا اردو میں ترجمہ کروں۔ وہ جس محنت سے لکھتے

تھے اس محبت کا جواب میں نے کبھی انکار سے نہیں دیا اور وعدہ کر لیا۔ بہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ یہاں میں یہ بتانا چلوں کہ "اسلامک موڈر نزم" کا ترجمہ میں نے بہت پہلے مکمل کر لیا تھا اور "اسلامک کلچر" کا تقریباً ایک تہائی ترجمہ جو چکا ہے۔ جب تک عزیز احمد زندہ تھے، مجھے چھاپنے چھپانے کی جلدی نہیں تھی۔ لیکن اب جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، میں اپنی پہلی فرصت میں اس فریضے سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔ عزیز احمد کی یہ وہ تصانیف ہیں جن میں انھوں نے مطالعہ تاریخ اور اس کے تجزیے کے ذریعے جدید اسلامک فکر کا سراغ لگانے میں وہ کام کیا ہے جس کا آغاز سرسید نے کیا تھا اور جس کو اقبال نے ایک خاص نقطے تک پہنچایا تھا۔ جب تک ہم اپنی جڑیں اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنی حقیقی فکر میں تلاش نہیں کریں گے ہم کسی ایسے صحت مند معاشرے کو جنم نہیں دے سکتے جہاں ایک طرف دولت کی مساوی تقسیم سے معاشرہ خوش حال ہو جائے اور جہاں عدل و انصاف سب کے لیے یکساں ہو اور دوسری طرف جہاں علم و ادب، فکر و تہذیب کی روشنی سے معاشرے کا ذہن منور ہو سکے۔ عزیز احمد کی کتابیں ہمارے فکری راستے کو بہت دور تک طے کرا رہی ہیں۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کے خط میں انھوں نے لکھا تھا "دیوان حسن شوقی ایڈیٹر نصرانی اور گلشن عشق بھیجنے کا شکریہ ادا کر سکا۔ فردوسی سے سرطان میں مبتلا ہوں۔ تین آپریشن ہو چکے ہیں۔ آخری آپریشن ہو کر جس کے ذریعے سرطان کو نکال دیا گیا اور اب باقی ورثہ میں پھرے پڑھا رہا ہوں لیکن مرض کے دوبارہ عود کر آنے کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔ جب ہسپتال میں تھا دو غزلیں لکھیں جو ذرا قنوطی ہیں۔ فارسی غزل کا دوسرا شعر ملحدانہ بھی ہے اور عارفانہ بھی۔ معلوم نہیں اس کی اشاعت سے پاکستان میں ہنگامہ برپا ہو گا یا نہیں۔" وہ شعر انھوں نے اپنے قلم سے کاٹ دیا تھا اور "تیار" میں شائع نہیں ہوا۔ آج آپ بھی وہ شعر سن لیجیے :

اوکہ ہرجاست، بیک خانہ خواہد گنجید
شد ز انعام جہی نکجہ چہ ویراں افتاد

منظہر جانخاناں، میر دردو، پہلے شاہ اور اقبال ہوتے تو یہ شعر سن کر عزیز احمد کو سینے سے لگا لیتے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۷۶ء کے خط میں لکھا: ”جتنی محبت اور اخلاق سے آپ پیش کرتے رہے ہیں اس کی میں مرتے دم تک قدر کرتا رہوں گا۔ فی الحال تو کام کر رہا ہوں اور اگر خدا نے چاہا احمد سلطان دوبارہ عود نہ کرنے پایا تو شاید کچھ دن زندہ رہوں۔ ویسے نہ زندگی کی کوئی خاص خواہش ہے نہ مرنے کا کوئی خاص ڈر۔ جب اللہ کی مرضی ہو، میں راضی برضا ہوں۔“ ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء کے خط میں لکھا: ”میں بدستور زندگی اور موت کے درمیان معلق ہوں۔ جب تک چل رہا ہوں چل رہا ہوں۔ آپ جیسے شخص شد بہت یاد کرتے ہیں۔ ایک نئی غزل ہوئی ہے جو ”نیا دور“ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اس غیر مطبوعہ غزل کے چار شعر آپ بھی سنیں گے۔ دیکھیے عزیز احمد ہم سے کیا کہہ رہے ہیں!

گھبرا کے ہم تو عرصہ جاں سے نکل گئے
بزم جہاں طلسم جنان سے نکل گئے
کب سے تھے ہم امیر شب دروز و ماہ و سال
قید زمان و بند مکان سے نکل گئے
تھا جنبش زبان و قلم کا یہ ماحصل
ناگفتہ حرف تھے کہ زبان سے نکل گئے
یاروں کو بزم لالہ رُخاں ہی میں چھوڑ کر
ہم خاک بن کے کوئے بتاں سے نکل گئے

اُدھر کئی جہینے سے اُن کا خط نہیں آیا تھا۔ میں بھی مصروف تھا۔ دسمبر میں میں نے انہیں خط لکھا۔ غیریت درد یافت کی اور پاکستان گئے کا پروگرام لے چھا۔ وہ خانوش تھے اور دعا مانگ رہے تھے:

ہے یہ دعا کرتا کہ تم کو ادب تک نہیں لے سکتا
علم و ادب کے افسر و اورنگ دوستو

لیکن مجھے تو اپنے خط کے جواب کا آج تک انتظار ہے۔

خواتین و حضرات! یہ میں نے عزیز احمد کے بابائے مین کوئی مضمون نہیں لکھا
ہے۔ صرف ایک شریعت النقص، منکسر المزاج، عالم فاضل اور ایک بھولے بسرے انسان
کی یاد تازہ کرنے کے لیے ان کے کام کا تعارف کرایا ہے تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ
عزیز احمد کی وفات سے قومی و ملی سطح پر ہمارا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ کاش ہم اس
نقصان کا احساس کر سکیں؟

میراجی۔ ایک مطالعہ

فیض احمد فیض اردو زبان کے وہ شاعر تھے جن کے حوالہ سے یہ زبان اور اس کی شاعری ان انجان بستیوں میں بھی پہچانی گئی جہاں ہمارے دوسرے شاعر اور ادیبوں کے نام اور کام کا گزیر تک نہ ہوا۔ فیض نے شاعری میں ایک ایسی منفرد آواز کو جنم دیا جو دوسرے پہچانی جاتی تھی اور اس آواز میں کچلی ہوئی دنیا کے عوام کا کرب شامل کر کے اسے سب کے دلوں کی دھڑکنوں میں جذب کر دیا۔ فیض احمد فیض، میراجی اور ن۔م۔ راشد کے ہم عصر بلکہ ہم عمر تھے۔ ن۔م۔ راشد ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ فیض ۱۹۱۱ء میں اور میراجی ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف اپنے دور کے اثرات کو قبول کیا بلکہ اردو میں نئی شاعری کی طرح ڈالی۔ یہ تینوں شعراء امین الگ الگ رنگوں کے علمبردار ہیں اور یہ تینوں رنگ مل کر اردو شاعری کو ایک نیا تناظر فراہم کرتے ہیں۔ ایک بڑے معاصر فیض احمد فیض نے اپنے دوسرے بڑے معاصر میراجی کے بارے میں لکھا تھا کہ :

”ان کی نشر کی ماہیت اور فضا ان کی نظم سے قطعی مختلف ہے۔ میراجی کے ذہن کا جو عکس ان کی نشر میں ملتا ہے بعض اعتباراً ان کی شاعرانہ شخصیت کے قریب قریب مکمل فنی کرتا ہے۔۔۔۔۔ ان کی تخلیق کا یہ حصہ تمام تر اسی پاسان عقل کی رہنمائی میں لکھا گیا ہے جسے وہ بظاہر عقل شعر کے قریب نہیں پھکنے دیتے۔“

یہی میراجی، جن کی وفات کا اتالیسواں (۳۹) اور ولادت کا ستترواں (۷۷) سال ہے،

آج کے "فیض معیوریل" یکسر کا موضوع ہیں۔

میراجی، جن کا اصل نام محمد شہناز اللہ ثانی ڈار تھا، منشی محمد مہتاب الدین کے ہیں ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پہلے "ساحری" تخلص کرتے تھے لیکن ایک ہنگامی لڑکی میرا سین کے یک طرفہ عشق میں گرفتار ہو کر، جیسا کہ شیخ سعدیؒ نے گلستان کے باب و ہجہ میں لکھا ہے کہ در عہد جوانی چنان کہ افتد والی، میراجی تخلص اختیار کر لیا اور آج ہم انھیں اسی نام سے پہچانتے ہیں۔ میراجی کی ذات سے ایسے ایسے واقعات وابستہ ہیں کہ ان کی ذات عام آدمی کے لیے ایک انسان بن کر رہ گئی ہے۔ ان کا حلیہ اور ان کی حرکات و سکنات ایسی تھیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے سلسلہ ملا متیہ میں بیعت کر لی ہے۔ لمبے لمبے بال، بڑی بڑی مونچھیں، گھٹے میں ایک سو ایک موٹے داؤں کی دو گز لمبی مالا شیر وانی جس کی کھنیاں ہمیشہ پٹلی ہوئی ہوتی تھیں، اور نیچے بیک وقت تین چٹونیں، اوپر کی جب پٹی ہو گئی تو نیچے کی اوپر اور اوپر کی نیچے بدل جاتی۔ شیر وانی کی دونوں جیبوں میں بہت کچھ ہوتا تھا۔ کچھ ڈھلے ہوئے چھوٹے، ایک پائپ، کاغذ میں پائپ کا دیسی تمباکو، پان کی ڈبیا، ہو سو پینک دو آئیں..... کاغذوں اور بیاضوں کا پلندہ بغل میں دابے بڑی سڑک پر پھرتا تھا اور چلتے ہوئے ہمیشہ ناک کی سبید دیکھتا تھا۔ ناک جھانک کر وہ کفر خیال کرتا تھا۔ بازار میں کسی سے مذاق نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر اپنے محلے اور اپنی سوسائٹی کے ماحول کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا..... اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے لیے شعر کہے گا۔

سذات حسن منو نے لکھا ہے کہ "میراجی تین گولے تھا جن کو بڑھکانے کے لیے اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی..... ان خارجی اشاروں نے ہی اس پر ایک ازلی اور ابدی حقیقت کو منکشف کیا تھا۔ حسن و عشق اور موت اس تشریٹ کے تہم اقلیدری زاویے صرف ان تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے، لیکن حسن و عشق کے انجام کو چونکہ اس نے فیکسٹ خوردہ عینک سے دیکھا تھا جس کے شیشوں پر تر پڑے تھے..... اس کے سارے وجود میں ایک ناقابل بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا اس طور پر کہ ہر نقطہ اس کا نقطہ آغاز ہے اور وہی

نقطہ انجام۔ حسن عشق اور موت۔ یہ یوں چمک کر میراجی کے دجہ میں گول ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ میراجی کے ہاتھ میں تین گولوں کے بجائے دو گولے دیکھ کر منٹو نے پوچھا کہ تیسرا گولہ کیا ہوا تو میراجی نے جواب دیا ”برخوردار کا انتقال ہو گیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور ہو جائے گا۔“

الطاف گوہر نے پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن مختار صدیقی کے ہمراہ وہ میراجی کے گھر گئے۔ مختار صدیقی نے کھڑکی کے قریب جا کر آواز دی ”میراجی صاحب“ اندر سے آواز آئی ”آئیے ہم اندر گئے۔ متوسط گھر کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ بول کے جھوٹے سے گلی کی بو کمرے میں آگئی۔ میراجی نے کہا ”یو آر ہی ہے۔ ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں“ اور یہ کہہ کر انھوں نے یکے بعد دیگرے پانچ سات بیڑیاں سسکا گئیں اور دو دو چار چار کس لگا کر کمرے میں ادھر ادھر بھٹک دیں۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ”پوتا میں ایک مشاعرہ پورا تھا۔ بڑے عظیم الشان پہانے پر۔ جوش، انجک، فراق سبھی تھے۔ میراجی کئے اور حاضرین کی طرف پیڑ کر کے پڑھنے لگے۔“ نگری نگری پھر اسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔

یہ اور اسی قسم کے بے شمار واقعات آپ کو ان تحریروں میں ملیں گے جو ان کے دوست احباب نے میراجی کے بارے میں لکھی ہیں۔ یہ سب واقعات انتہائی دلچسپ ہیں۔ آپ بھی ان سے یقیناً لطف اندوز ہوئے ہوں گے لیکن ان واقعات نے ایک طرف میراجی کو افسانہ بنادیا اور دوسری طرف شاعری کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس کا رخ ان کی ذات کی طرف کر دیا۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ میراجی کی تخلیق سے میراجی کی طرف سفر کیا جاتا اور پھر اس کے ساتھ ذرا سفر واپسی یعنی میراجی سے پھر تخلیق کی طرف۔ یہاں عمل الٹا ہوا۔ تعمیرِ میراجی نے اپنی مشہور تصنیف ”اس نظم میں“ کے دیباچہ میں خود لکھا ہے کہ شاعر کے نام کی طرف نہیں بلکہ کام کی طرف دیکھا جائے۔

آئیے اب کہن کے حلیے، ان کے گولوں، ان کی بغیر جیب کی پتلون، ان کی لٹوں، ان کی مالا، ان کی شراب نوشی اور عجیب و غریب حرکات کو چھوڑ کر ان کے کام کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان واقعات کو سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر یہی ڈھونگ رہا ہے اور

شاہد انھوں نے تخلیقی سطح پر کوئی خاص کام نہیں کیا۔ اس تصویر سے ایک غیر ذمہ دار اور
 مجنون انسان کی تصویر ضرور ابھرتی ہے، جو میراثی یقیناً نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے
 چراغ کی جتنی کو دو فوں سروں سے یقیناً جلا یا اور صرت ۲۷ سال کی عمر میں ۳ نومبر ۱۹۴۹ء
 کو مر گئے۔ اس مختصر سی عمر میں میراثی نے اتنا کھاکر آج صرت اُن کی کلیاتِ شاعری ہی ۱۰۰
 صفحات پر مشتمل ہے اور حال ہی میں اردو مرکز لندن سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی تصانیف
 میں جہاں مشرق و مغرب کے نغمے (۱۹۵۸ء)، اس نظرمیں (۱۹۴۳ء)، نگار خانہ (۱۹۵۰ء)
 خیمے کے آس پاس (۱۹۶۳ء) شامل ہیں وہاں میراثی کے گیت (۱۹۴۳ء)، میراثی کی نظمیں
 (۱۹۶۳ء) گیت ہی گیت (۱۹۴۳ء) پابندِ نظمیں (۱۹۶۸ء) اور تین رنگ (۱۹۶۸ء) شاعری
 کے وہ مجموعے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا اور اسے اس
 راستے پر ڈال رہا جس پر وہ آج کھامزن ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے نثر میں بھی اتنا لکھا کہ
 اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آئے گی۔ شاعری کی طرح ان کی نثر کو بھی
 یکجا و مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ میراثی کی پوری تخلیقی شخصیت سامنے
 آجائے اور نئی نسل کو معلوم ہو سکے کہ میراثی نے جدید ادب کو کن نئے امکانات سے روشناس
 کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ انسانیا اور پُر اذامکانات کام ہے کہ بعض لوگوں نے طویل عمر
 پا کر اور باقاعدہ زندگی گزار کر بھی انجام نہیں دیا۔ میراثی از سر تا پا تخلیق تھے۔

اس سوال نے مجھے کثرتِ نشان کیا ہے کہ آخر اس ساری تخلیقی سنجیدگی اور گہرے
 تحقیقی انہماک کے باوجود انھوں نے یہ حلیہ کیوں بنایا اور ساری عمر اپنی زندگی اس طور
 سے کیوں گذاری۔ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اُس دور میں جب وہ ادب کی
 دُنیا میں کچھ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے ارد و دوسری زبانوں کے شعرا کے
 کلام اور حالات کا گہرا مطالعہ کر رہے تھے، انھوں نے اپنے تخلیقی کرب و اضطراب کے
 پیشِ نظر یہ سوچا کہ اگر وہ مجھ ہی کریں جو دوسرے عظیم شعرا نے کیا ہے تو لوگ نہ صرف اُن کی
 طرف متوجہ ہوں گے بلکہ ان کی شہرت تیزی سے چاروں طرف پھیل جائے گی۔ اس وقت
 میراثی کی عمر ۲۲-۲۳ سال تھی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ عمر خواب دیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔

اس زمانے میں چنڈی داس ان کا محبوب شاعر تھا۔ چنڈی داس نے رامی دھوپن کے عشق کیا۔ میراجی نے میراسین کے عشق کا افسانہ بنا دیا۔ بودلیئر دوستوں کو دشمن بنانے میں بددلتی رکھتا تھا۔ میراجی بھی اس سے کم نہیں تھے۔ "مشرق و مغرب کے نغمے" میں میراجی نے بودلیئر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے کئی نظمیں اپنی ہی ذات کے لیے لکھی ہیں۔ میراجی نے بھی ابتدائی دور کی شاعری اپنی ذات کے لیے کی۔ بودلیئر کے بارے میں میراجی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ لاشعور کا شاعر تھا۔ وہ نئے احساسات، نئے لہجے، نئے انداز بیان اور نئی زبان کا شاعر تھا۔ یہی کام میراجی نے بھی کیا۔

بودلیئر نے سماج کے خلاف احتجاج کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ اپنا سر منڈوا کر اس پر ہزارنگ پھر وا دیا اور احتجاج کی عبارت سر پر لکھ کر اور ایک سیکڑے کو دھاگے میں باندھ کر پیرس کے ایک دستوران کے باہر کھڑا ہو گیا اور سیکڑے کے مخاطب ہو کر احتجاج کرتا رہا۔ میراجی نے بھی ایک بار اسی قسم کی وضع اختیار کی۔ اخلاق احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ "میراجی نے دلی میں جب ایک مرتبہ نیا سال آنے پر احباب کے اصرار پر نیا سوٹ پہنا اور اپنا وہ چارلی چپلن والا جوتا بھی بدل ڈالا اور کلارک گیبل کی وضع کی موچکیں بھی حذف کر دیں تو ان سب کو بھی حیرت ہوئی جن کے اصرار پر وہ سوٹ بونڈ بنے تھے اور سب نے سمجھا کہ نیا سال میراجی کے نئے لباس سے شروع ہو رہا ہے لیکن جب پوری طرح ٹپ ٹپ ہو کر انھوں نے سر پر استرا پھر وا دیا اور چاند سے سر پر بھی نوائر مینٹ کرایا اور وہ سالانہ جو قمیض کے اندر رہتی تھیں باہر کوٹ کے کالر پر پہن لیں تو ان کے مغربیوں کو کہنا پڑا کہ کوئی لباس میراجی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

بودلیئر نے اپنی ماں کو لکھا "کبھی کبھی مجھے قین قین دن بستر پر لیٹے رہنا پڑتا ہے کیونکہ میرے پاس دھلے ہوئے کپڑے پہنے کو نہیں ہوتے یا کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ سچ پوچھ تو شراب اور افیون کا ستون کا کھکا بدترین دامن ہے۔ پچھلی دفعہ جب آپ نے مجھے مہربانی سے ۵۰ فرانک بھیجے تھے تو میں نے دو روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دو روز یعنی ۴۸ گھنٹے وہ منہ میراجی اپنے دوست عبداللطیف کو ایک خط میں لکھتے ہیں "رات کو روز دفتر میں سوتا

تھا۔ معنی ریہرسل روم میں۔ آج اس کی چابی وقار صاحب کی جیب میں ان کے ساتھ چلی گئی۔ جب سے آپ گئے ہیں صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا مختار اپنے حساب میں ہوٹل سے کھلا دیتا ہے۔ دوپہر کا کھانا دشوانندن لپے گھر سے لا دیتا ہے۔ مانگ کر کھاتا ہوں اور قرض کی شراب پیتا ہوں۔ اللہ ایک اور خط میں لکھا ہے "تین دن بھوکا رہنے سے طبیعت صاف ہو گئی۔" اللہ بود لیبیر ساری عمر قرض خواہوں سے جان نہ چھڑا سکا۔ میراجی بھی ساری عمر قرض لیتے رہے۔ ان میں پشمان بھی شامل تھے جو انھیں ساری عمر ڈھونڈتے رہے۔ ایڈگر ایلن پو کے بارے میں میراجی نے لکھا ہے کہ "کوئی اسے شرابی کہتا ہے۔ کوئی اعصابی مریض، کوئی اذیت پرست اور کوئی اجنبی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے اور ان رنگ رنگ خیال آرائیوں کی وجہ سے اصلیت پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ اٹھائے نہیں بنتا ہے۔" اس وقت جب میراجی نے یہ الفاظ لکھے تو میراجی ایک نادر مل سے انسان تھے لیکن جب ان تصورات کو انھوں نے اپنا کر زندگی کے روپ کو بہرہ بنایا تو آج ہم بھی ان کے بارے میں یہی کہہ رہے ہیں جو انھوں نے ۲۲-۲۳ سال کی عمر میں ایڈگر ایلن پو کے بارے میں کہا تھا کہ "ایڈگر ایلن پو مر چکا ہے۔۔۔" شاعر مذکور اپنی ذات اور شہرت کے لحاظ سے تمام ملک میں پہچانا جاتا تھا لیکن کہیں بھی اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ بلکہ اب ملاحظہ فرمائیے کہ جب میراجی کا انتقال ہوا تو اختر الایمان نے بتایا کہ ان کے جنازے میں گنتی کے چار آدمی تھے۔ اختر الایمان، مہندر ناتھ، مدھو موہن اور ان کے ہم زلف سدن۔

پو کی بیوی کے بارے میں میراجی نے لکھا ہے کہ اس کی بیوی ایک ایسا سایہ بن جاتی تھی جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ سایہ میراجی کی شاعری میں اسی نوع کی علامت بن کر بار بار آیا ہے۔ میراجی نے لکھا ہے کہ ایڈگر ایلن پو عورت کے بھائے عورت کے تصور کی پوجا کرتا تھا۔ اللہ میراجی کی شاعری کے بارے میں نقادوں نے لکھا ہے کہ "میراجی کو تصور سے پیار ہے۔ تصور میراجی کا آدرش ہے۔ منظر بھی منظر بن کر نہیں تصور بن کر شاعری میں آتا ہے۔" ختم

”ہاں تصور کو میں اپنے بنا کر ڈو لہا
 اسی پردہ کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا
 بند جوتا ہوا اٹھتا ہوا دروازہ ہے
 ہاں یہی منظر لہر بہر بلاغت اب تو
 آئینہ خانے میں آنکھوں کے جھلکتا ہے مدام“ ۱۱

یہ سب حوالے میں نے اس لیے دیے تاکہ یہ بات آپ کے ذہن نشیں کر سکیں
 کہ میر تقی کے تخلیقی ذہن کی تشکیل کے دور میں انھوں نے اپنے پسندیدہ اور بڑے شعرا کی
 وہ سب حرکات و سکنات، جو انھیں اچھی لگیں، اختیار کر لیں اور اپنی زندگی کے روپ کو
 بہروپ بنالیا۔ اس طرح انھوں نے مستفاد معرکہ کو اپنی ذات میں جمع کیا اور اس جمع آوری
 سے اپنے خارجی وجود کو آلود کر لیا۔ بودلیئر، ایڈگار آلن پو، باسنے، لارنس، میلہ سے لے کر چٹوپا
 وغیرہ سے شادائشہ ثانی ڈانے میر تقی کو تخلیق کیا اور پھر ساری عمر اپنے تخلیق کیمے ہوئے میر تقی
 کے روپ بہروپ میں وہ ایسی زندگی بسر کرتے رہے جیسی کہ انھوں نے ان کی زندگی کے تضاد
 پہلوؤں کا ایک ایک ثبوت ”مشرق و مغرب کے نئے مے ملا ہے۔ اسی لیے میر تقی کے
 مطالعہ کے لیے ان کی یہ کتاب دنیاوی اہمیت کی حامل ہے۔

میر تقی کی پیدائش (۱۹۱۲) اور وفات (۱۹۳۹) کے درمیان دنیا دو عالم گیر جنگوں
 کا شکار ہوئی جس کے نتیجے میں سارا معاشرتی، فکری و معاشی نظام درہم برہم ہو گیا اور
 سارا روایتی اخلاقی نظام، سماجی اقدار اور انسانی رشتے ٹوٹ پھوٹ کر بے ربط و بے معنی
 ہو گئے۔ مغلوب قومیں آزادی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام
 آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ قدیم و جدید کی حدیں نمایاں ہونے لگیں۔ روایتی و قدیم اقدار سے
 بغاوت ایک عام دھماکا بن گیا۔ مادکس، فرامو اور آئن سٹائن کے نظریات نے نئے معاشی
 انسانی، ذہنی اور سائنسی علوم کے امکانات دکھ دیے۔ برصغیر بھی اس بدلے ہوئے تناظر
 سے متاثر ہوا اور یہاں بھی صورت حال تیزی سے بدلنے لگی۔ افلاس، مایوسی، بیروزگاری
 اور بے یقینی نے نوجوان نسل کو گھیر لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مستقبل گم ہو گیا ہے۔ میر تقی

بھی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بے یقینی بے روزگاری اور بے معنی رسمی اخلاقیات سے پریشانی ان کے لیے ایک زندہ حقیقت بھی تھی اور احساس کا حصہ بھی۔ میراجی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے لفظوں اور روپ بہ روپ سے دوسروں کو دکھا بھی دیا۔ میراجی نے لکھا:

”مستقبل سے میرا تعلق ہے نام سلاہ۔ میں صرف دو زمانوں

کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال۔ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے
رہتے ہیں اور میری عملی زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔“

اگر اس زاویے سے میراجی کے فکر و عمل کو دیکھیے تو وہ بامعنی نظر آتے ہیں بغیر مستقبل کے زندگی گزارنے والا نوجوان اس معاشرے میں اسی انداز سے اور اسی طرح زندگی گزار سکتا تھا۔ میراجی کا خارجی روپ ان کے داخلی وجود کا نتیجہ تھا اور اس طرح میراجی اس معاشرہ کے عام نوجوان کی روح کا زندہ اور جیتا جاگتا پیکر تھے۔ انھوں نے نہ صرف لفظوں سے بلکہ اپنے خوابوں کے ساتھ اپنی زندگی کو جس سانچے میں ڈھالا وہ بے مستقبل نوجوان کی ترجمان تھی۔ کیا ہم اسے بغاوت نہیں کہیں گے؟ کیا کوئی نوجوان اپنی روح کے اظہار کے لیے رسمی اخلاقیات میں گھرے ہونے کے باوجود یہ صورت اختیار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے جس کا اظہار میراجی نے کیا!۔ ذرا میراجی کے حلیے کو ان کے انوکھے روپ بہ روپ کو اس نقطہ نظر سے بھی دیکھیے تو آپ کو ان کے خارجی و داخلی وجود کے اظہار میں گہری معنویت نظر آئے گی۔ اسی لیے میراجی نے اپنے دوست عبداللطیف کو ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں لکھا:

”میں وہی چھوڑ کر بمبئی کے گرد و نواح میں ہوں۔ پہلے دفتری

میزوں پر سوتا تھا۔ اب فرش پر براجمان ہوتا ہوں۔ خود
کو کبھی معمولی اور کبھی پہنچا ہوا بڑا فقیر تصور کرتا ہوں اور دنیا شاید مجھے
بھکاری سمجھتی ہے۔ سچ ہے سماج کے فرائض جس طرح دنیا انھیں سمجھتی
ہے میں نے جس طرح میں انھیں سمجھتا ہوں، پورے نہیں کیے۔ لیکن

میں نے اپنی جسمانی زندگی سے زیادہ جس قدر ذہنی زندگی بسر کی ہے اس کا لحاظ کسے ہو گا؟ ۱۰۰

”ذہنی زندگی“ کی بات کر کے اسی خط میں میری جو کچھ لکھتے ہیں اس سے سارے سماجی و فکری نظام کے خلاف بغاوت کا پہلو واضح طور پر اجاگر ہوتا ہے:

”افسوس یہ بھی ایک سوال ہے اور سوال بھکاری کی دوسری عادت۔“

کیا میں کبھی اس قابل نہ ہو سکوں گا کہ سوال کے سنبھالنے اپنے آپ کو فیصلے کا اہل ثابت کر سکوں۔ ہر عزیز ترین چیز کے نام پر ہتھ ہوں کر یہ احساس کتری نہیں، یہ وہی ”جراثیات“ ہیں جس نے میرے احساسات اور خیالات کو تو نغیس بنایا لیکن جو میرے واقعات روزمرہ کو دنیا کی نظریں میں نغیس نہ بنا سکے۔ میں ’دوں‘ مہینوں بلکہ بعض دفعہ ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ سال تک نہیں نہایا کرتا۔ دنیا کو یہ بات بری معلوم ہوتی ہے اور میں اسے سمجھتا ہوں۔ میرے کپڑے اکثر میلے دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا بڑا مانتی ہے، میں جانتا ہوں۔۔۔ بعض دفعہ خالی پیٹ زیادہ شرب پینے سے صبح مجھے اپنا بستر خود گھیرا محسوس ہوتا ہے تو میں اپنی زندگی کے اونچے نیچے کے ساتھ یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ اس حالت کے دیکھنے والے چاہے میرے دوست یا خیر خواہ ہوں یا کوئی اور، ان کی طبیعت منقض ہوگی۔ مگر یہ بات اسوجھنے کے باوجود اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس تمام صورت حال، اس سلسلے، اس نظام حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے؟ زیادہ تر لوگ مجھے خود غرض دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۰۰

اس اقتباس سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ میرا جی جو کچھ کر رہے تھے یا جو کچھ انھوں نے کیا وہ بے خبری میں نہیں بلکہ شعور کی سطح پر کیا ہے۔ بڑے سوال یعنی نظام حیات، کائنات کا مقصد کیا ہے؟ انھیں پریشان کر رہے تھے۔ اپنے معیار زندگی کو بلند کرنا ہرگز ان کا مسئلہ نہیں تھا وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ نظام جس کے خلاف وہ احتجاج اور بغاوت

رات اندھیری بن ہے سونا کوئی نہیں ہے ساتھ
یون جھکولے پیڑ ہلائیں، تھر تھر کانپیں بات
دل میں ڈر کا تیر چھٹا ہے ایسے پر ہے ہاتھ
رہ رہ کر سوچوں یوں کیسے پوری ہوگی رات؟

.....

کیسے اپنے دل سے مٹاؤں برہ انگن کا رنگ
کیسے جھکاؤں پر پریم، پہیلی کیسے کروں سجوگ
بات کی گھڑیاں بیت نہ ہاتیں ڈور ہے اس کلاسیا
دور درسیں ہے یتیم کا اور میں بدلے ہوں بھیس تھے

بھیس بدل کر میرا جی دور درسیں کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے غزل سمیت
شاعری کی ان تمام اصناف کو ترک کر دیا جن سے معاشرہ مالاںس تھا۔ بخور و اور اوزان
کے سادے مروجہ نظام کو بھی توڑ دیا۔ (بخور و اوزان کے تعلق سے میراجی کی شاعری کے
ایک الگ مطالعہ کی ضرورت ہے) نئی ہیئت اور شعری پیکر کا نظام انیسویں صدی کی جدت
مغربی شاعری سے لیا اور آزادی کے اس احساس کے ساتھ حقیقت و احساس کو اپنی شاعری
میں سمو دیا۔ گیت اور آزاد نظم نئی نئی ہیئتوں کے ساتھ وہ نئی اصناف سخن تھیں جن سے میراجی
نے اپنی نئی شاعری کا بندر راہیں آباد کیا۔ اس حقیقت و احساس میں تجبوتی اخلاقیات کو
توڑنے کا جذبہ بھی شامل تھا اور جدید نفسیات سے زندگی میں جنسی پہلو کی بنیادی اہمیت کا شعور
بھی شامل تھا۔ ہمدردی شاعری نے اس پہلو کو اب تک نظر انداز کر کے رسمی اخلاقیات کا ساتھ
دیا تھا۔ میراجی نے اسے بھی توڑ دیا۔ اس نئے بندر راہیں کے لفظیات کی نئی دنیا آباد ہوئی۔
رموز و کنایات، تعلیمات و علامات بھی نئے کئے اور یہ سب چیزیں نئی ہیئت اور آزاد
نظم کے چمکے میں کھل اٹھیں۔ اس سے طرز و اسلوب، زبان و بیان سب بدل گئے، نئی
سپاہیں اور نئی حقیقتوں کے اظہار نے شعری گرفت کو مضبوط کر دیا۔ یہ یقیناً وہ شاعری نہیں

نئی، اردو شاعری کے قارئین جس کے عادی تھے۔ بدلتی اور ملتان سے ملاقات اور شعری پیکروں کے استعمال کا جو شعور میراجی نے حاصل کیا تھا اسے نئی اردو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا اور انسان کی داخلی دنیا کی بے باک خواہشات اور رنگ، سچی، حقیقی تصویروں کو اپنی شاعری میں جرات مندانہ کے ساتھ اُجاگر کر دیا۔ اسی کے ساتھ نئی نظم داخلی جذبات اور نفسیاتی حقیقتوں کا اظہار بن گئی۔ مغربی طرز احساس کا اپنے تہذیبی طرز احساس کے ساتھ تخلیقی سطح پر جو امتزاج میراجی نے کر دکھایا وہ اتنا مشکل اور بڑا کام تھا کہ یہ کام کسی اور سے نہیں ہوا۔ فیض نے یہ کام نہیں کیا۔ راشد نے بھی یہ کام نہیں کیا۔ ان کا تعلق غزل کی روایت سے کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتا ہے اور ماوراء کی شاعری میں تو اختر شیرانی اور اردو غزل و شاعری کا عکس و اثر بہت نمایاں اور گہرا ہے۔ اسی امتزاج، انی ایکٹ نے شعور و شاعری نئے موضوعات، نئی علامات اور لفظیات نے میراجی کی شاعری میں ابہام کو جنم دیا۔ جب ہر چیز نئی ہو، جب دو طرز احساس تخلیقی سطح پر شیر و شکر ہو رہے ہوں، جب نئی ہیئت میں قدیم طرز احساس یا قدیم ہیئت میں نیا طرز احساس نمودار ہو رہا ہو تو ابہام ایک فطری عمل ہے۔ جب میراجی نے شاعری شروع کی تھی تو یہ ابہام بہت گہرا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے یہ عام شعور کا حصہ بنتا گیا ابہام کا رنگ بھی ہلکا پڑ گیا اور آج جب ہم اس شاعری کو پڑھتے ہیں تو یہ زیادہ رواں، صاف اور پُر اثر نظر آتی ہے۔ آج اس رنگ نے نئی نسلوں کی شاعری میں اُتر کر اپنی اجنبیت دُور کر دی ہے۔

اس ابہام کا ایک اور وجہ یہ ہے کہ جنس ان کے اس پہلے سفر کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ میراجی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میری نظموں کا نمایاں پہلو ان کی جنسی حیثیت ہے۔ جنس کے بارے میں یہ بات واضح رہے کہ جنس ابہام کے پردوں میں چُھپ کر ہی جمالیاتی سطح کو چھو سکتی ہے۔ میراجی نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت جنس کی بات کرنا مرد و اخلاقیات کی سطح پر ایک ناپسندیدہ فعل تھا۔ اردو شاعری میں محبوب اس لیے بھی مذکور تھا کہ پردہ نشین محبوب کے پردہ کا پورا خیال دکھا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو شاعری کا

محبوب کہاؤں کے کاندھوں پر ڈولی میں سفر کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اختر شیرانی نے پہلی بار عورت کا نام لے کر اظہارِ عشق کیا۔ بدلے ہوئے مزاج کی صدی میں یہ ایک نیا اندازِ سخن تھا۔ سلمیٰ اور ریحانہ کے ساتھ اختر شیرانی کی شاعری بھی شہرت کے بام پر چڑھ گئی لیکن غور سے دیکھیے تو اختر شیرانی کے ہاں بھی محبوب کا حرف نام ہی لیا گیا تھا۔ جنس اس کا موضوع ہی نہیں تھا۔ میراجی نے نہ صرف عورت کو بلکہ جنس کو اردو شاعری میں داخل کیا اور ہمارے شعور کا حصہ بنا دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ

”جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو جن قدرت کی بڑی نعمت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گندتی ہے اس لیے ردِ عمل کے طور پر میں دُنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور۔۔۔ جو میرا آدرش ہے۔“

یہاں دو لفظ ”ردِ عمل“ اور ”آدرش“ قابلِ توجہ ہیں۔ ردِ عمل سماج اور اس کی اقدار کے خلاف اور پھر علمِ بغاوت بلند کر کے اس اظہار کو اپنا آدرش بنانا۔ اس سفر میں میراجی نے ہندی شاعری کی طرف رجوع کیا جہاں اظہارِ عشق عورت کرتی ہے۔ جہاں ایک طرف کوشن مراری اور گوپوں کی جمالیاتی و جنسی روایت موجود تھی اور ساتھ ساتھ بارہ ماسہ کی روایت بھی موجود تھی۔ جہاں موسموں کے تعلق سے فطری جنسی اضطراب اور تقاضوں کا اظہار کر کے پیا کو یا د کیا جاتا ہے۔ یہ سفر اور یہ موضوع زندگی کے وسیع داخلی رشتوں کے حوالے سے ایک نیا سفر تھا۔ میراجی جب اس راستے پر چلے تو ایک طرف اختر شیرانی کی شاعری فضا میں تحلیل ہو گئی اور جنس میراجی کی انفرادیت بن کر ان کی شاعرانہ شہرت کا نشان بن گئی۔ اسی لیے میراجی نے علامات، تعلیمات و کنایات ہندی شاعری سے لے کر اسے اردو شاعری کی روایت میں جذب کر دیا اور جنس کو ابھام کے لطیف پردوں میں چھپا کر ایسی شاعری کی جیسی کہ وہ ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب انگارے شائع ہو جس میں جنس کو موضوع بنایا گیا تھا اور معاشرے نے نشر میں یہ بے باکی و گستاخی دیکھ کر اسے ضبط کر لیا تھا ابھام

کے پردوں میں چھپی ہوئی میراجی کی شاعری کو ضبط کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس پس منظر میں دیکھیے تو میراجی کی شاعری کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ دانش و فیض کی شاعری کا باقاعدہ سفر ہی اسی زمانے میں شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس موضوع، نئی ہیئت اور آواز و نظم کے شعوری تخلیقی سطح پر استعمال کے پیش مدیراجی اور صرف میراجی ہیں۔ دانش و فیض ظاہر و بیان میں اردو و فارسی روایت کے استعمال کر کے اپنا رشتہ اس سے قائم رکھتے ہیں لیکن میراجی اس روایت کے بقاوت کر کے رد عمل کے طور پر ہندی شاعری کی روایت سے نانا جوڑ لیتے ہیں۔ ڈی ایچ لارنس، 'پروڈیئر، ایڈیٹر، پبلشر' ملازمے اور فرانڈ کی جدید نفسیات کو اردو ادب کے مزاج و رنگ میں شامل کر دیتے ہیں۔ منٹو بھی اپنے مخصوص انداز میں اپنے اضافوں مثلاً کالی شلوار، دھواں وغیرہ میں اس رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی کا افسانہ لہجہ، حسن عسکری کا افسانہ بھیلن بھی اپنے طور پر یہی کام کرتا ہے لیکن میراجی کا کام ان سب سے بڑا تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر آپ ان کی نظمیں: 'دکھ دل کا دارو'، 'سرگوشیاں'، 'سجواں سرسراہٹ'، 'دورو نزدیک'، ایک تصویر تن آسانی'، 'اب جو بارے سنگ آستان'، 'افق و غیور پڑھ لیجیے۔ روزن'، 'کھو کی'، 'دروازے جس ہی کے اشارے ہیں۔ میراجی نے اس شاعری سے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کر کے نئے امکانات کے دروازے کھول دیے۔ اسی لیے وہ آج بھی اہم شاعر ہے۔ اس سلسلے عمل میں انھوں نے اردو شاعری کی روایت سے پورے طور پر نانا نہیں توڑا بلکہ اسے بدل کر نیا روپ دے دیا۔ روایت کے بدلنے کے عمل میں جب صورت و احساس بدلنے میں تو روایت سے دور ہونے یا اس کے ٹوٹنے کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن جب نیا احساس پائی ہیئت مروج ہو جاتے ہیں تو پھر روایت کی کرنیں اس میں سے پھوٹنے لگتی ہیں اور وہ روایت ہی کا نیا روپ نظر آنے لگتی ہے۔ میراجی کے ہاں یہی ہوا ہے۔ آپ میراجی کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ اردو شاعری نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ یہ فرد کہیں گے کہ یہ روایتی اردو شاعری سے مختلف شاعری ہے۔ میراجی نے قافیہ کی پابندی بھی کی ہے اور اسے توڑا بھی ہے۔ نظم محری کو بھی استعمال کیا ہے اور

نظم آزاد کو بھی۔ ہیئت کے بھی تجربے کے ہیں اور اظہار احساس کے بھی۔ یہ وہ کام ہے جو آگے پیچھے کی دو یا دوسے زیادہ سلیس کرتی ہیں۔ میراجی نے ایک مختصر سی زندگی میں یہ سارا کام خود کر دکھایا اور ۱۹۴۹ء میں جب وہ مرے تو نئی شاعری مقبول و عام ہو کر نئی نسل کا حصہ بن چکی تھی۔ ۱۹۴۴ء کے قریب ان کا پہلا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ ان کا پہلا مجموعہ ”میراجی کی نظمیں“ جو اس سفر کی یاد ادستانا ہے، ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔

اس سفر میں خود میراجی نے ورنلی اور تنہائی کے علاوہ کچھ نہ پایا۔ اس سفر کو پورا کر کے اب وہ ”دوسرے سفر“ کی تیاری میں لگ گئے۔ پہلے سفر میں اس سے زیادہ آگے جانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ میرے پاس ایک نقشہ ہے جس کی ایک نقل بیدار سخت صاحب نے اخترالایمان سے لے کر مجھے بھجوائی ہے۔ اس نقشے میں میراجی اپنے نئے مجموعے مرتب کرنے پر غور کرتے نظر آتے ہیں اور ان مجموعوں میں وہ کلام شامل کرتا چاہتے ہیں جو ۱۹۴۳ء — ۱۹۴۷ء تک انھوں نے کہا تھا۔ اس نقشے میں وہ اپنی پہلی نظموں یعنی ”میراجی کی نظمیں“ پانچ خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ خانہ نمبر ۱ جنسی، خانہ نمبر ۲ وہیم، خانہ نمبر ۳ رومانائی، خانہ نمبر ۴ جاڑائی اور خانہ نمبر ۵ آنچے نام نہاد ترقی پسند۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تقسیم میں جنسی نظمیں کم و بیش صرف میں فی صد ہیں۔ ”میراجی کی نظمیں“ سے بعد کے کلام میں ”جنس“ پوری زندگی کی اکائی کا ہمزو لاینفک بن کر داخل جذبہ بن جاتی ہے اور میراجی کا راستہ نہیں روکتی۔ اب وہ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور ”عمل“ کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ عمل تغیر کا ستارہ ہے۔ عمل سماج کو انجماد سے حرکت کی طرف لے جاتا ہے۔ اور پیٹے دن رات بن کر میراجی کے سامنے آتے ہیں :

میلے کپڑے کی طرح ملکی ہوئی تصویریں

بیٹے دن رات مرے سامنے لے آتی ہیں

.....

بات کیا ہے کہ وہ جیون جس کو

مشعلیں اپنے اجالے ہی سے دکھلاتی تھیں

دوبہاں کی لہر کے ک نرم جھکولے ہی سے جاگ اٹھا ہے

رات چھلنی تھی مگر

رات بھی دن کی طرٹ نود کو لے آئی ہے ۲۷

میراجی کی نظم "اجنتا کے غار" تخی قوتِ عمل کا اظہار ہے۔ اسی نظم کے نام سے وہ اپنا نیا مجموعہ مکلام مرتب کرنا چاہتا تھے۔ اس مجموعہ کا دیباچہ بھی انھوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ اب وہ پرانی جھٹ جاتی ہے اور امید کی نئی کرن جگمگانے لگتی ہے۔ نظم "ایک منظر" کی یہ چند سطریں دیکھیے۔

میراجی ہم سے کیا کہہ رہے ہیں !

ابھی اچانک ایک ہل میں ایک نوحہ ایک نغمہ بن کے ایسے گونج اٹھے گا

کہ دل کہے گا "میں بھی ہوں !"

ابھی اچانک ایک ہل میں اس پہاڑ ہی سمہار موت کی گٹا سمٹ کے جا پھینے گی

اور حیات کی دھنک بھی جگمگائے گی ۲۸

ان کی ایک اور نظم جس کا عنوان ہی "ایک نظم" ہے اس بات کا اظہار ہے کہ وہ اب ساج سے مل کر ایک ہونے کی گہری تخلیقی خواہش رکھتے ہیں !

ایک نظم

اے پیارے لوگو !

تم دور کیوں ہو ؟

کچھ پاس آؤ ،

آؤ کہہ دو میں

یہ سب ستارے

تمار کیوں کے

اس پار ہوں تھے

لے پیارے لوگو!

میں تم سے مل کر

بہتر بنوں گا،

لے اکیلے

یوں روتے روتے

آنسو ہیں مجھے

اور کچھ نہ ہو گا

تم پاس آؤ

پھر دیکھ لیں گے

دنیا ہے کیا کچھ

اور دین کیا ہے

پھر جان لیں گے

ہر سانس کیسے

آنکھیں جھپکتے

اُن رٹ بناتھا

لیکن محبت

یہ کہہ رہی ہے

ہم دور ہی دور

اور دور ہی دور

چلتے رہیں گے۔ اللہ

یہ بات قابل ذکر ہے کہ آخری ہند میں تہذیب موجود ہے۔ نظم ”بہاؤ“ میں میراجی زندگی کے آثار چڑھاؤ اور نشیب و فراز کو پیش کر کے زندگی کی گھمبیر بنا کو واضح کرتے ہیں۔ یہاں بھی قوتِ عمل اپنا اظہار اور موت پر زندگی کے غالب آنے کی خواہش کا اظہار کر رہی ہے :

گذرتی رہی زندگی جس طرح
گھٹنے ہوئے ریگتے ریگتے
جب آئے تو کاش آئے موت اس طرح
گھٹنے ہوئے ریگتے ریگتے

میں اک ہل میں اس کا گلا گھونٹ کر
گھٹنے ہوئے ریگتے ریگتے
پر معمول گلا سے چھوڑ کر پست پر
گھٹنے ہوئے ریگتے ریگتے ۱۹
دربارے مل کر ساگر بننے کی خواہش بھی اسی نئے احساس کا اظہار ہے جس کا اظہار نظم ”پردہ“ میں ہوا ہے :

پھر ساگر میں مل جاتے ہم
اور مل کر دھوم مچاتے ہم
یہ رغبت ہمیشہ گلاتے ہم
”سب گیا فی ہی اظہار ہے“
سیکھ کیا ہو

جب ایسا ہو

ہم اور دوسرے تم اور میں

”تنہا فی ایک دل چسپ نظم ہے جس میں وہ سکون سے ہنگامے کی طرف جانا چاہتے ہیں۔

سکون انجھا دے اور ہنگامہ عملِ حیات ہے :
 سکون دور ہو جائے، ہنگامہ پیدا ہو، ہنگامہ شور مچتا ہے
 سامنے آئے، پہل میں سکون دور ہو جائے لیکن
 مرے دل کے گہرے سکون میں ہوا سر سرانے لگی ہے
 نظم ”یگانگت“ میں میراجی کے ان یہ احساس جاگنا ہے کہ جو شے کیلی رہے اس
 کی منزل فنا ہی فنا :

زمانہ ہوں میں، میرے ہی دم سے اُن مٹ تلسل کا تھو لارواں ہے،
 مگر مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے
 یہ کیسے کہوں میں

کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آکر ملتے ہیں ۱۳۳۵ھ

یہ میراجی کا سفر واپسی تھا جو ۱۹۳۳ء میں شروع ہوا اور ۱۹۳۸ء تک جاری رہا
 اور انھوں نے اپنی وضع کردہ نئی روایت شعری کو اردو شاعری کی روایت کے ساگر سے
 ملادیا، لیکن اس تخلیقی سفر میں وہ بدحال ہو چکے تھے، ڈکھ بھوگئے، بھوگئے، گھٹنے گھٹنے
 ریگئے ریگئے، ۱۳ اسپتال میں انھوں نے ایک نرس کی کلائی چھاڑ لی۔ جب میراجی کو بھلنے
 کی کوشش کی گئی تو انھوں نے کہا کہ وہ ایسا علاج پسند نہیں کرتے جس سے ان کے ٹوکوپلیکینز
 Complexes ختم ہو جائیں اور جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں وہ نہ لکھ سکیں۔ ۱۳۳۵ء تخلیق
 تخلیق۔ یہی میراجی کا آندرش تھا۔ ساری عمر وہ اسی کے حصول میں لگے رہے اور اردو شاعری کا
 نئی ہیئت نئے موضوعات نئے جذبے نئے احساسات سے مالا مال اور نئے جدید دور میں
 داخل کر کے ہمیں کے ایک اسپتال میں رہ گئے۔ راشد نے میراجی کی وفات کے تقریباً بیس سال
 بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میراجی اس زمانے کے سب سے قابل ذکر اسب سے زیادہ
 جدت پرست اسب سے زیادہ لہ خیز دہن کے مالک اور سب سے منفرد شاعر تھے۔ ۱۳۳۵ء میں نے
 آج کی گفتگو میں اسی میراجی کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

حوالے

- ۱۔ مشرق و مغرب کے نئے ، میراجی ، اکادمی پنجاب (ڈرہٹ) لاہور ، ۱۹۵۸ء ص ۸۔
- ۲۔ "میراجی ، خلیل صافی ، فنون لاہور ، اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۱۹۵-۲۰۰
- ۳۔ "تین گولے" سعادت حسن منٹو ، "گنگے فرشتے" مکتبہ جدید لاہور
- ۴۔ میراجی ایک قصور ، الطاف گویر ، "تحریریں چند" اسلام آباد ۱۹۸۸ء ص ۱۰۵
- ۵۔ میراجی کی شخصیت ، ایضاً ، ص ۱۱۳
- ۶۔ میراجی کو بچنے کے لیے ڈاکٹر جمیل جاہلی ، تنقید اور تجربہ ، مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۹۷ء اور نیلا دور کراچی شمارہ ۲۱۰-۲۲۔
- ۷۔ مریاجہ "اس نظم میں" ، میراجی ، ساقی بک ڈپو ، دہلی ۱۹۳۳ء ص ۱۱
- ۸۔ مشرق و مغرب کے نئے میراجی ، ص ۱۶۲
- ۹۔ میراجی ، اخلاق احمد دہلوی ، پھر وہی بیان اپنا ، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۹ء ص ۱۷۵۔
- ۱۰۔ مشرق و مغرب کے نئے ص ۱۷۳
- ۱۱۔ "شعر و حکمت" مرتبہ ڈاکٹر مفتی تبسم حیدر آباد دکن ۱۹۸۸ء ص ۹۴-۹۵
- ۱۲۔ ایضاً ، ص ۱۰۶۔
- ۱۳۔ ایضاً ، ص ۲۳۰۔
- ۱۴۔ ایضاً ، ص ۲۲۲۔
- ۱۵۔ ایضاً ، ص ۲۳۰۔
- ۱۶۔ ایضاً ، ص ۲۳۱۔
- ۱۷۔ میراجی کو بچنے کے لیے ڈاکٹر جمیل جاہلی تنقید اور تجربہ ، ص ۲۳۰
- ۱۸۔ کلمات میراجی ، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جاہلی ، اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء ص ۱۰۸۔
- ۱۹۔ میراجی کا نغمہ ، میراجی ، ساقی بک ڈپو ، دہلی ۱۹۳۳ء ص ۱۲

- ۲۰ شعر و حکمت، ص ۱۰۲
- ۲۱ ایضاً، ص ۱۰۳
- ۲۲ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری، ساقی بک ڈپو دہلی ۱۹۳۳ء
- ۲۳ کلیات میراجی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل عالمی، اردو مرکز لندن، ۱۹۸۸ء، ص ۳۳-۳۴
- ۲۴ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری
- ۲۵ میراجی کی نظمیں، میراجی، ساقی بک ڈپو ۱۹۳۳ء، ص ۱۳-۱۵
- ۲۶ کلیات میراجی، "اجتہاد کے غار" ص ۱۴۸-۱۸۹
- ۲۷ ایضاً، ص ۱۹۵-۱۹۶
- ۲۸ ایضاً، ص ۱۹۴-۱۹۸
- ۲۹ ایضاً، ص ۲۰۱-۲۰۲
- ۳۰ ایضاً، ص ۲۰۵-۲۰۶
- ۳۱ ایضاً، ص ۲۰۹-۲۱۰
- ۳۲ ایضاً، ص ۲۳۴-۲۳۸
- ۳۳ میراجی کے ساتھ ایک شام، انشرویو انشروالایمان مرتبہ تصدق سہاروی، مطبوعہ شب غزن، الہ آباد، دسمبر ۱۹۹۷ء شمارہ ۶۷، ص ۵۷
- ۳۴ ایضاً، ص ۵۵

حسن عسکری کے افسانے

محمد حسن عسکری کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب وہ عارضی طور پر انگریزی پڑھانے کے لیے میرٹھ کالج آئے تھے۔ شیر والی پہنے ہوئے۔ پان کی لالی سے ہونٹ رچے ہوئے، ہاتھ میں کتابیں، آنکھوں پر عینک اونچی پیشانی، تیل سے جھے ہوئے بال اور مانگ نکلی ہوئی یہ ہوا رنگ، چمکتی روشن آنکھیں، چہرے پر بخیدگی، چھریا بدن، دلے تلے، خاموش، کھوٹے کھوٹے سے۔ اپنے خیالات میں مگن۔ بہت بہت کلاس سے نکل کر سائنس کے کمرے کی طرف ہمارے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ حسن عسکری ہیں۔ میں نے پوچھا وہی عسکری صاحب جن کے افسانے ساقی، ادیب لطیف اور ادبی دنیا میں شائع ہوتے ہیں اور وہ جو ہر جیسے "ساقی" میں "بھگلیاں" لکھتے ہیں۔ بتانے والے نے کہا یہ تو معلوم نہیں البتہ یہ مشہور ادیب ہیں۔ میں نے انھیں حیرت و حشر سے دیکھا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ میں تھوڑا سا طالب علم تھا۔ شوقِ ادب زندگی کا محور تھا اور ادیب بننے کا خواب زندگی کی تعمیر تھی۔ عسکری صاحب کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ ادیب کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ان کے کہنے سے میرٹھ میں جیل پہل ہی ہو گئی۔ دائرۂ ادیب کی نشستوں میں گرمی آگئی۔ جیسے جیسے وقت گذرا عسکری صاحب سے تعلقات بڑھنے لگے۔ کالج میں ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی پڑھاتے تھے اور پروفیسر کرار حسین اور پروفیسر طور احمد رزمی بھی۔ صفحہ سیم ایم اے کر چکے تھے۔ قیصر زیدی ان سے بھی پہلے تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ امتحانِ حسین ایم اے کے آخری سلسل میں اور سلیم احمد ایف اے میں پڑھ رہے تھے۔ احمد بھائی بھی کالج میں تھے عسکری صاحب فرسٹ ایئر کی کلاس لیتے تھے جو بہت بڑی تھی۔ ان کی آواز پتلی اور پڑھانے کا بھی شہ پہلا تجربہ تھا۔ ان کے طرح طرح کی شراتیں کرتے۔ خود چاتے اور وہ سب کچھ کرتے جو انھیں نہیں

کرنا چاہیے۔ ہم سب نے ملے کیا کہ جب عسکری صاحب کلاس میں جائیں تو ہم سب مختلف دروازوں پر کھڑے رہیں اور کچھ اندر جا کر بیٹھ جائیں تاکہ ان کی اخلاقی مدد کی جاسکے۔ کچھ ہفتے اسی طرح گزرے اور پھر فخر الاسلام صاحب واپس آ گئے جن کی خصوصی پر عسکری صاحب کام کر رہے تھے۔ عسکری صاحب کالج سے تو الگ ہو گئے لیکن میرٹھ ہی میں رہے۔ محلہ مشائخان میں ان کا قیام تھا۔

۱۹۳۶ء-۱۹۳۷ء میں عسکری صاحب نے پروفیسر احتشام حسین کے ایما پر اردو تحریک کی تیاری کی۔ رسید یہ تھیں، چندہ جمع ہوا لیکن ابھی جلے کا پروگرام بن ہی رہا تھا کہ گورنر مکنیشٹر میں ہندو مسلم فسادات ہو گئے۔ بہار اٹھکڑ اور دہلی کے فسادات نے سارے برصغیر کی صورت حال کو بدل کر رکھ دیا اور پنجاب کے فسادات نے رہی ابھی کمر کو پورا کر دیا۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے اب بہت قریب سے سنائی دینے لگے تھے۔ اسی زلزلے میں عسکری صاحب نے اپنا ایک "مضمون" "میری" دائرۃ ادبیہ میں پڑھا۔ یہ آخری نشست تھی جس میں شریک تھا۔ مضمون کے بعد بحث کا آغاز ہوا۔ پروفیسر شوکت سہزاداری مناظرہ کے ماہر اور دسارے شہر میں منطقی مشہور تھے۔ انھوں نے کا بڑ توڑ عسکری صاحب کے مضمون پر اعتراضات کیے اور عسکری صاحب کو اس طور پر گھیرا کہ نکلنا مشکل ہو گیا۔ عسکری صاحب کچھ دیر تو بحث میں شریک رہے۔ آخر میں زحاکو کہنے لگے: "سہزاداری صاحب! آپ سے بحث کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ آدمی مانجا سوتے۔"

۱۹۳۷ء کے اوائل میں عسکری صاحب نے ایک افسانہ لکھا اس کا ذکر وہ کئی ہفتے سے کر رہے تھے۔ پہلے کئی بار عسکری صاحب سے افسانہ سنانے کی فرمائش کی لیکن وہ ہر بار طرح دے گئے۔ یہ وہی افسانہ تھا جو اسی سال "دوا اور افسانوں کے ساتھ" "قیامت بھر کا آب آئے ناکے" کے نام سے کتابی صورت میں ساتی بک ڈپو سے شائع ہوا۔ اس وقت تقسیم ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور فسادات کی آگ ہماروں طرف بھڑک رہی تھی۔ یہ کتاب بھی فسادات کا شکار ہو گئی۔ چند کاپیاں پاکستان ضرور پہنچیں اور ختم ہو گئیں۔ "قیامت بھر کا آب آئے ناکے" عسکری صاحب کا آخری افسانہ تھا۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان گئے اور لاہور میں ٹک گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ وہ از سر تازہ پاکستانی فکر کے حامل تھے جس کا اندازہ اُن خطوط سے بھی کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر آفتاب احمد خان اور صدر شاہین و ممتاز شیریں کے نام لکھے اور جواب تخلیقی ادب اور نیا دور کراچی میں شائع ہو چکے ہیں۔

عسکری صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”شاید میری فطرت کے آریائی اور سامی عناصر ایک دوسرے سے متصادم ہو رہے ہیں۔ ایک طرح سے یہ جنگ کج کل پوری دنیا میں جاری ہے لیکن“ آذری کا زمانہ کتنے تک کلچر کی حفاظت کے لیے شاید سمیت ہی کچھ زیادہ مفید ہے۔ ادب میں بھی ڈاکٹر احتسامیہ ”جزیرے ص ۲۷۷“ پاکستان آکر عسکری صاحب نے اسی فکر کو آگے بڑھایا۔ پاکستانی ادب کی شناخت کی بحث اسی انداز نظر کا نتیجہ تھی اور اُس کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں سامیت کا عنصر بڑھتا اور گہرا ہوتا گیا اور وہ افسانہ نگاری سے دور اور فکر و خیال سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

حسن عسکری کے افسانوں کی کل تعداد گیارہ ہے۔ ۲۰ اٹھ افسانے ”جزیرے“ کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ماقی بک ٹرپورٹی سے شائع ہوئے جس میں ستمبر ۱۹۳۹ء سے فروری ۱۹۴۳ء تک کے افسانے شامل ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں اُن کا دوسرا مجموعہ ”قیامت ہر کتاب کئے ذاکئے“ کے نام سے شائع ہوا جس میں تین ”افسانے“ شامل ہیں۔ ”ڈاکٹر آذر“ اور ”گنٹھلیوں کے دام“ ۱۹۴۳ء میں لکھے گئے اور تقریباً سو تین سال بعد ان کا آخری افسانہ لکھا گیا جس کے نام پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ گویا ستمبر ۱۹۳۹ء سے فروری ۱۹۴۷ء تک تقریباً ساڑھے سات سال کا عرصہ حسن عسکری کی تخلیقی زندگی کا افسانہ دور رہا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے وفات (۱۹۷۷ء) تک کوئی افسانہ نہ لکھنے کے باوجود، اُن کے افسانوں کے حوالے اور ان کا ذکر مختلف مضامین میں آتا رہا اور عسکری ہمیشہ افسانہ نگار ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ ان کے افسانے جدید اردو افسانے کی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ شعور کی رو سے وہ بنیادی تکنیک

ہے جسے عسکری نے زحرف متعارف کرایا بلکہ نہایت غریب سے بھرا اردو فنکشن کے لیے نیا۔ راستہ گھولا اور اردو افسانے کو مغرب کے افسانے کے دائرے میں داخل کر دیا۔ حرام جادی (۱۹۴۱ء) اور چائے کی پیانی (۱۹۴۱ء) اس ٹیکنیک کی بہترین مثال ہیں۔ ۱۹۴۳ء کو سامنے رکھ کر اس کے بعد افسانے اور فنکشن کو دیکھیے تو آپ کو اس ٹیکنیک کے واضح اثرات نظر آئیں گے۔ اردو افسانہ میں حسن عسکری کی یہی تاریخی و تخلیقی اہمیت ہے۔

عسکری کے افسانوں کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان میں پلاٹ نہیں ہوتا لیکن داخلی و خارجی کیفیات کا حقیقت پسندانہ جزئیاتی اظہار ایسے توازن سے خیر و خشر ہو جاتا ہے کہ پلاٹ نہ ہوتے ہوئے بھی کہانی پورے خود و خال کے ساتھ ابھر کر قاری کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ اسی کے ساتھ تنہائی کا احساس، انفسانی کش مکش اور جنسیت کا فطری اظہار ایک طرف افسانے کی دنیا میں رنگ بھرتا ہے اور دوسری طرف ان کرداروں کو ابھارتا اور نمایاں کرتا ہے جن کے ارد گرد افسانے کا تار و پود بٹا گیا ہے۔ اسی لیے "حرام جادی" کی انجلی اور "چائے کی پیانی" کی دلدلی ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

حسن عسکری کے افسانوں کے اسلوب میں حقیقت نگاری، اشاریت اور تخیل سب کچھ ایک ساتھ ملے جلے ہوئے ہیں۔ یہ روایتی معنی میں رواں اسلوب نہیں ہے بلکہ ایک آہستہ کرد اسلوب ہے جس میں توازن بھی ہے اور شہر آؤ اور ضبط بھی۔ پہلی نظر میں یہ کھردرا اور خشک سا دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل یہ اس مخصوص ٹیکنیک کے فنی تقاضوں کے لحاظ سے کیٹا اسلوب ہے۔ اس میں زبان و بیان، اردو مرو و تلفظ و لہجہ بھی دی استعمال کیا گیا ہے جو اس کردار کی پوری طرح ترجمانی کر سکے۔

حسن عسکری نے تجزیے کے اختتام پر میں لکھا ہے کہ "اب اردو ادب کو تخلیق سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے" اور یہ بھی لکھا ہے کہ تخلیق اور تنقید جہاں مل کر ایک ہو جاتی ہیں وہ کیری کچھ اور پرہیزی ہے۔ تخلیق اور تنقید کے اس اتحاد کی ایک مثال ان کا "افسانہ" میلاد شریف ہے۔ انٹیلیوں کا دام کو بھی اسی ذیل میں رکھا جاسکتا ہے اور

دوسری بہتر مثال ”ذکر اوز“ ہے۔ ہیروڈی کا وہ راستہ جو حسن عسکری نے ۱۹۴۳ء میں دکھایا تھا آج بھی اسی طرح کھلا ہے اور کسی ایسے نئے ذہن کا منتظر ہے جو تخلیق اور تنقید کو ملا کر ہیروڈی کی سطح پر ایک کر سکے۔

حسن عسکری کے افسانوں کے دو فزں مجموعے گزشتہ چالیس سال سے کم یاب بلکہ نایاب تھے۔ اردو ادب کی نئی نسل ان افسانوں کی تاریخی اہمیت اور گہرے فنی اثرات سے کم و بیش ناواقف ہے۔ اب جو یہ افسانے ”محمد حسن عسکری کے افسانے“ کے نام سے چھپ کر دوبارہ سامنے آرہے ہیں میرا خیال ہے کہ اردو افسانے کے تعلق سے حسن عسکری کی تاریخی خدمات کا دوبارہ چرچا ہوگا اور ہمارے نئے افسانہ نگار یہ بھی دیکھیں گے کہ تنقیدی شعور سے جدید اردو افسانے کو کاٹ کر ہم نے ”علامت“ کو کیسی گہری کھائی میں دھکیل دیا ہے۔ حسن عسکری کے افسانے اس کھائی سے نکھنے میں ہماری مدد کریں گے۔

(۲۰ مئی ۱۹۸۷ء)

افسانہ نگار ابو الفضل صدیقی

جناب ابو الفضل صدیقی اردو زبان کے وہ ممتاز افسانہ نگار ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی لیکن اس دھڑے کے باوجود ان کا تذکرہ عام تنقید کی مضامین میں اٹاکم آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی کہانیاں عام طور پر طویل یا مختصر طویل ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے افسانے برصغیر پاک و ہند کے وسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کا عرف ایک حصہ چار مجوزوں کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ایک مجموعہ ”اہرام“ کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا اور اس کے ۴۳ سال بعد ان کے ایک ساتھ تین مجموعے ”آئینہ“، ”انسان“ اور ”جوالا مکہ“ کے نام سے اوائل ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئے۔ ان تینوں مجموعوں کے صفحات کی تعداد تو ۸۷۷ ہے لیکن ان میں صرف چودہ افسانے شامل ہیں جب کہ ابو الفضل صدیقی نے کم و بیش دوسو سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ ایک ناول ”تغزیر“ کے نام سے ۱۹۴۶ء میں اور دوسرا ”سرور“ کے نام سے ۱۹۵۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں کتابت کی اس قدر غلطیاں تھیں کہ اسے پڑھنا آسان نہیں تھا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ان کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ ”چار ناولٹ“ کے نام سے شائع ہوا جس میں اردو ادب کی چار شاہکار کہانیاں شامل تھیں۔ یہ مجموعہ بھی اب کم پاب ہے۔ ان کے افسانے ”چڑھت سورج“ کو بہم دنیا کی عظیم کہانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس پر ابو الفضل صدیقی کو یو نیسکو کا بین الاقوامی انعام بھی ملا۔ ۱۹۸۳ء میں ان کے افسانے ”گل زمین کی تلاش میں“ کو منقوش صدارتی ایوارڈ ملا۔ ان کا ناول ”حرنگ“ جس کی چھ قسطیں بنیاد و ر کراچی میں آج سے آٹھ دس سال پہلے شائع اور مقبول ہوئیں، ابھی زیر طبع ہے۔ یہ ضخیم ناول نشوونما کے موضوع پر

لکھا گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اردو میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ابوالفضل صدیقی کی بشکل دس فی صد تحریریں کتابی صورت میں شائع ہوئی ہیں اور نوے فی صد تحریریں یا تو مختلف رسائل کی زینت ہیں یا ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صدیقی صاحب خط شکستہ میں لکھتے ہیں اور ان کا مسودہ نئی نسل کے بے علم کاتب عام طور پر پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی لیے ان کی اشاعت مدیران کرام کے لیے ایک لاپرواہی مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اگر ابوالفضل صدیقی کی سب تحریریں یکجا ہو کر سامنے آجائیں تو آپ سب حضرات میرے اس جملے سے اتفاق کریں گے جس سے میں نے اپنی بات کا آغاز کیا تھا۔

ابوالفضل صدیقی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھے وہ جاگیردارانہ ماحول تھا جس کا اپنا انتظام صدیوں سے برصغیر میں رائج تھا۔ راجہ اور رعیت کا یہ اثر رشتہ حاکم و محکوم کا رشتہ تھا۔ زمیندار و جاگیردار اس کے نمائندے تھے۔ یہی ماحول ابوالفضل صدیقی کے ہاں پورے شعور اور پورے رجائو کے ساتھ اس طور پر آیا ہے کہ ان کے افسانوں میں یہ زندگی پوری طرح چلتی پھرتی اور حقیقی جانتی نظر آتی ہے۔ اپنی کہانیوں میں انھوں نے ایسے ذوق کردار پیش کیے ہیں کہ یہ کام بہت کم افسانہ نگاروں نے اس انداز سے کیا ہے۔ ابوالفضل صدیقی صاحب کی ان کی نسل میں قاضی عبدالستار اسی روایت کو گتے بڑھاتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ برصغیر کے دیہات کی حقیقی زندگی کیا تھی۔ وہاں کی تہذیب کی نوعیت کیا تھی۔ اس کا نظام اقتدار کیا تھا۔ وہاں کے لوگ کس طرح سوچتے اور چیزوں اور ان کے رشتوں کو کس طرح دیکھتے تھے تو آپ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کو پڑھ لیجیے۔ وہ آپ کو اس تہذیب کی تہ و ثلث زندگی اس کے مسائل اور کلچر سے پوری طرح روشناس کر دیں گے۔ ہم نے اپنے سماج کی تنظیم کے لیے اب تک ادب کو استعمال ہی نہیں کیا ہے اسی لیے ہم اپنے ادب کی صحیح قدر و قیمت سے بھی پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ یہی جاگیردارانہ تہذیب کج بھی ہمیں پاکستان کے طول و عرض میں اسی صورت میں نظر آتی ہے جس صورت میں وہ ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں میں موجود ہے۔

ابو الفضل صدیقی جاگیردار اور ماحول کے پروردہ عزورہی لیکن اس کے باوجود وہ اس طور پر عوام کی نمائندگی کرتے ہیں کہ انسانیت کا چراغ روشن ہو کر لوہے سے گشتا ہے۔ ان کے افسانوں میں انسان زندہ رہتا ہے۔ رحم اور انسانیت کی قدریں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور زمیندار کسان عوام و خواص کے کردار اپنے حقیقی خدو خال کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ پریم چند نے بھی دیہات کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تھا لیکن پریم چند کے ہاں صرف پچھلے طبقے کے مسائل عام طور پر ابھر کر افسانے کا تار و پود بنتے ہیں۔ پریم چند کے مقلدوں میں ابو الفضل کے ہاں سارا دیہات اپنے پورے طبقاتی نظام کے ساتھ ساری زندگی کو جلوں میں لے کر ابھرتا ہے اور دیہات کی زندگی کو پوری واقعیت اور پھیلاؤ کے ساتھ ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ انھوں نے خاص طبقے کا فرد جوتے ہوئے بھی حرامی قوتوں کو کامیاب ہوتے دکھایا ہے اور مرے طفت بات یہ ہے کہ اس میں کوئی نقص باری ہے اور نہ کوئی بندھا کا خار مولا ہے۔ زندگی جیسی کچھ ہے اسے تحلیل کی آنکھ سے دیکھ کر پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے ان کے ابتدائی دور کے افسانوں کے بارے میں کج سے تقریباً ۱۵ سال پہلے لکھا تھا کہ دیہات کے موضوعات پر لکھنے والوں میں پریم چند کے بعد ابو الفضل صدیقی دوسرے اہم لکھنے والے نئے افسانہ نگار ہیں لیکن ساتھ ساتھ شنگار کی حیثیت سے وہ پریم چند سے بہتر لکھنے والے ہیں اور ان کا جمالیاتی شعور انھیں ایک مختلف افسانہ نگار بنا دیتا ہے۔ فی الحقیقت یہی ابو الفضل صدیقی کی انفرادیت اور یہی ان کا امتیاز ہے۔

میں اس وقت ابو الفضل صدیقی کی افسانہ نگاری پر تفصیل سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور نہ میں ان کے مخصوص اسلوب اور زبان و بیان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تو میں چند نکیریں نکالنے کو ان کا ایک خاکہ پ کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ ابو الفضل نے ۱۹۳۶ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۴۹ء سے وہ مسلسل لکھ رہے ہیں جب ان کا افسانہ ”سولج کا شکار“ دہلی دنیا لاہور میں شائع ہوا۔ اس وقت دنیائے

ادب میں دو درجہ نمایاں تھے۔ ایک رومانوی رجحان اور دوسرا حقیقت نگاری کا رجحان۔ رومانوی رجحان کے افسانوی ادب کے نمایندہ سہارہ جیدر بلدرہم، ل احمد سلطان جیوش اور نیاز فتح پوری وغیرہ تھے اور حقیقت نگاری کے نمایندہ پریم چند تھے۔ ابوالفضل صدیقی نے اپنے معاصرین علی عباس حسینی اور اعظم کرپڑی کی طرح یہ دونوں اثرات قبول کیے ہیں لیکن ۱۹۳۶ء کی تحریک کے زیر اثر رومانوی اثر کم ہو گیا ہے اور سماجی شعور، طبقاتی تقسیم اور حقیقت نگاری کے اثرات غالب آ گئے ہیں۔ ابوالفضل نے اس میں یہ اضافہ اور کیا کہ نشر کو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ زندگی کی حقیقتوں سے ملا دیا ہے۔ اسی لیے وہ دوسرے افسانہ نگاروں سے پہلے بھی مختلف تھے اور آج بھی مختلف ہیں۔ وہ اردو زبان کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔

ابوالفضل صدیقی سے پہلے تو ہماری پوری صدی کی مخصوص تہذیب اور اس تہذیب کی مخصوص تصویر ان کی باتوں کی لہروں سے وجود پانے لگتی ہے۔ میں انھیں کم دیش تیس سال سے جانتا ہوں اور میں نے انھیں ہمیشہ ایک ایسا انسان پایا جس کے پاس دل دروند بھی ہے اور احساس غم گساری بھی۔ چھوٹے بچوں سے وہ ٹوٹ کر پیار کرنے والے۔ میرے ہاں آتے ہیں تو سب سے پہلے بچوں سے ملتے اور ان سے کھیلتے ہیں۔ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ جب ان سے نمٹ لیتے ہیں تو پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ میری دو سلیس ان کے سلنے پر دان چڑھی ہیں۔ جب سے ڈاڑھی چھوڑی ہے تو کپڑوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں ورنہ میں نے ہمیشہ انھیں اہتمام سے سلے اور سلنے سے پہننے ہوئے کپڑوں میں دیکھا ہے۔ گھٹنوں سے نیچی ڈھیلی ڈھالی شیر وانی۔ ایک ہرکا سفید ہاتھ مار، سیاہ لٹپی۔ کلائی پر گھڑی انگلی میں گلوٹی اور انھیں ہڈا سا دال، چہرے پر رعب اور متانت، قدرے چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ کشادہ پیشانی، سا نولا رنگ، بڑا دانہ، چٹلی ٹھوڑی لمبی ناک کسی حد تک لمبوتر چہرہ، چھریاں، رخساروں کی ہڈیاں بھری ہوئیں اور عمر کی بھریاں چہرے پر پھیلی ہوئیں۔ دانت بے دانت۔ ملیں گے تو سکراہٹ اور خوش کی روشنی وجود کے افق سے ظاہر ہونے لگے گی۔ باتیں کرتے ہیں تو ایسے جیسے افسانہ سنا رہے ہوں۔ واقعات کے بعد واقعات کا ایک سیل رواں ہو جاتا ہے۔

شکار کے رہا، ہتھیاروں کے عاشق، گھوڑوں کی ہر اول کے رازوں۔ میں نے ایک ڈائری دی اور کہا کہ اس میں گھوڑوں کے اعضاء، قسبیں اور سلاخوں کے نام لکھ دیجیے۔ لکھے جنہے کئے تو سینکڑوں الفاظ ڈائری میں درج کر کے دے گئے اور جو باتیں رہائش و ہنسی زبانی سناتے رہے۔ کہنے لگے کہ میاں! گھوڑا اور بھوڑا ہاتھ پھیرنے سے بڑھتا ہے۔

شام کو آجائیں تو گھنٹوں بیٹھے اُن لکھے افسانے منہ زبانی سناتے رہتے ہیں۔ بعض محیر العقول اور بعض ناقابل یقین۔ میں نے اور یکم سہنی زمن نے کئی بار منصوبے بنائے کہ ان کی تصدیق کریں گے لیکن جب تصدیق کا موسم آتا تو ہم بھول جاتے۔ ایک دن کئے۔ کہنے لگے ”میاں! کیا نئے خان بہادر لگے ہیں؟“ میں نے پوچھا ”خان بہادر؟“ — کہنے لگے۔ ”میاں! یہ جو بھونکنے کی آواز آرہی ہے؟ کیا نئے کتے پال لیے ہیں؟“

ابو الفضل صدیقی کو گھوڑوں کے علاوہ کتے پالنے کا بھی شوق رہا ہے۔ رسولان سے شکار کھیلا ہے۔ ہار کے اسٹیشن ماسٹر کو بھی کتے پالنے کا شوق تھا۔ ان کے پاس کہیں سے اعلیٰ نسل کے سفید کتوں کا ایک جوڑا آیا۔ ابو الفضل صاحب کو کتے اتنے پسند کئے کہ بچوں کی فرمائش کر دی کہ کئی بار کہا مگر اسٹیشن ماسٹر مال گئے۔ جب پانی سر سے گذر گیا تو ابو الفضل صدیقی کے اندر کا زمیندار جاگ اٹھا۔ اس کے کتے چوری کرادیے اور جب کتے ان کے پاس پہنچے تو اسی رات ان کے سارے جسم پر گہرا سیاہ خضاب لگوادیا۔ خضاب ایسا کھلا کہ خود کتے بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکے۔

ایک دن کہنے لگے۔ ”میاں! دیکھو! مرغادو طرح سے اذان دیتا ہے۔ عام مرغاد کہتا ہے دانا گاؤں۔ دانا گاؤں۔ لیکن بعض مرغے منحوس ہوتے ہیں اور جب اذان دیتے ہیں تو کہتے ہیں چو پٹا گاؤں۔ چو پٹا گاؤں۔ جو مرغادو چو پٹا گاؤں کی ہانگ لگاتا ہے تو اس کے مالک سے نہ صرف مرغالے لیا جاتا ہے بلکہ چاول، انجی اور کھویرا بھی لیا جاتا ہے تاکہ دباؤں کے تدارک کے لیے اس منحوس مرغے سے نہجات حاصل کر لی جائے۔ اور میاں! دیکھو! عام طور پر کسان کا مرغادو چو پٹا گاؤں کی ہانگ لگاتا ہے اور زمیندار کا مرغادو دانا گاؤں کی۔ پھر میں دیکھا اور شرارت آمیز ہنسی سے کھلکھلا اٹھے۔

پچھلے سال ۱۹۸۶ء میں دو مہینے ایسی گرمی پڑی کہ ساری خلقت خدا ترانہ ترانہ
پکار اٹھی۔ ایک دن آئے۔ کہنے لگے۔ ”میاں! معلوم ہے یہ گرمی اتنی مسلسل اور
اتنی شدید کیوں پڑ رہی ہے؟ یہ یوں دو سال کا سال ہے اور یوں دو سال چیت دو مہینے
کا ہوتا ہے بہت دیر مانتے سے پسینہ پونچھتے رہے اور اس بات کی وضاحت
کرتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۳ء میں وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتے تھے کہ مئی ۱۹۷۵ء
ان کی وفات کا مہینہ ہے۔ ہم نے بہت سمجھایا۔ کہنے لگے میری پیدائش پر پڑتے نے
جو زائچہ بنایا تھا اس میں یہی لکھا ہے۔ میں نے پوچھا۔ بڑے بھائی! کیا سارے
واقعات اسی طرح صحیح ثابت ہوئے ہیں جس طرح زائچے میں لکھے ہیں۔ کہنے لگے سب تو
ہیں لیکن خاصی تعداد میں صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ میں مختار زمن، ابن الحسن، بیگم سلی
زمن انھیں سمجھاتے۔ کچھ اثر بھی ہوتا مگر دو ایک دن میں پھر زائل ہو جاتا۔ ۱۳۲۵ھ مئی ۱۹۷۵ء
کی رات کو بارہ بجے ہم ان کے ہاں پہنچے اور کہا کہ ہم موت کے فرشتے کی تلاش میں آئے
ہیں۔ کیا وہ اچکا ہے یا آنے والا ہے؟ وہاں کے اور یہاں کے وقت میں تو کچھ
فرق نہیں ہے؟ بہت ہنسے۔ پھر ہمارے ساتھ گھر کے باہر سرسبز پر ٹپکتے
رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر کا بوجھ اتر گیا ہے اور وہ اب ہلکے پھلکے ہو گئے
ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ۱۳۲۵ھ مئی ۱۹۷۵ء کی رات کو گذرے اب بارہ برس ہوتے
آ رہے ہیں اور ابو الفضل صدیقی اسی طرح افسانے بنانے میں مصروف ہیں۔
خدا انھیں عمر و روح عطا فرمائے۔ انھوں نے اپنے قلم سے اردو ادب کو مالا مال
کیا ہے اور اسے ایسی کہانیاں دی ہیں جنہیں ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں
کر سکتی۔ ان کے پاس ۱۲۲ قلم ہیں جن کے وہ بلا شرکت غیرے مالک ہیں اور
ابھی ایک ایک قلم سے انھیں کئی کئی کہانیاں لکھنی ہیں۔

یہاں تک پہنچا تو مجھے اٹھارویں صدی کے ایک شاعر حسن الدین خان یاد آیا

کا ایک شعر یاد آیا۔ آپ بھی سن لیجئے اور مجھے اعجازت دیجیے۔

ہماری بھی کہانی نکل یہاں یوں ہی بنا دیں گے
کہ جیسے آج ہم لوگوں کے افسانے بناتے ہیں

(۲۹ مارچ ۱۹۸۷ء)

ابو فضل صدیقی کے آخری لمحات

ہم اسے بزرگ افسانہ نگار جناب ابو فضل صدیقی ۱۹ ستمبر ۱۹۸۷ء مطابق ۲۲ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ کے دن شمالی ناظم آباد کے حنیف اسپتال میں اودنکے گریس منٹ تیسرے پیر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آنا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۸۷ء کو دن کے سادھے بارہ بجے انھوں نے اپنا نیا افسانہ مکمل کیا اور بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی ہے۔ ڈوہائی بجے انھوں نے کاغذ اور قلم لیا اور اس پر اپنے ہاتھ سے لکھا کہ ”میری زبان ٹوٹ گئی ہے“ یہ کاغذ ان کے بھتیجے اور افسانہ نگار نذر الحسن صدیقی کے پاس محفوظ ہے۔ اسی وقت ان کے پوتے ڈاکٹر ندیم کو اطلاع دی گئی اور انھوں نے ابو فضل صدیقی صاحب کو حنیف اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کرادیا۔ دائیں طرف فالج کا اثر ہو چکا تھا۔ شام کو انھوں نے پھر کاغذ قلم کے لیے اشارہ کیا جو انھیں مہیا کر دیے گئے۔ کم زور دے گرفت انگلیوں سے کاغذ پر انھوں نے کچھ لکھا جو مشکل سے پڑھا جاسکا۔ اس پر انھوں نے میرا نام لکھا تھا۔ نذر الحسن نے مجھے مطلع کیا اور میں فوراً اسپتال پہنچا۔ وہ نیم بے ہوش تھے لیکن دماغ کام کر رہا تھا۔ مجھے دیکھا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اشکبار ہو گئے اور اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ میں ہاتھ لے کر اسے دبایا۔ بہت دیر میں وہاں رہا۔ پھر ان کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی چھٹی اور وہ شاید سو گئے۔ ۱۹ ستمبر کو میں پہنچا تو میں نے کہا بڑے بھائی! سچ آپ کی اتنی دیر سال گرہ ہے، مگر وہ ماہ و سال سے بے نیاز تھے۔ جب تک وہ اسپتال میں رہے میں کم دبیش روز جانا رہا لیکن ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ فالج کا اثر باقی تھا۔ اسی عرصے میں دل بھی متاثر ہوا۔ پیشاب بند ہونے کی تکلیف بھی شروع ہو گئی۔

غذا ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء سے بند تھی۔ موت ڈرپ کے ذریعے گلو کو زائد دوائیاں دی جا رہی تھیں۔
 ناک کے ذریعے سوپ نلکی سے پیجا یا جا رہا تھا۔ یہی حالت بدستور قائم رہی۔ سڈاکٹروں نے بتایا
 کہ عمر کی وجہ سے دواؤں کا وہ اثر نہیں ہو رہا ہے جو ہونا چاہئے۔ بلٹرم پریشر اور نبض کی رفتار
 بھی ناہموار تھی۔ ذرا سی دیر میں بڑھ جاتی، ذرا سی دیر میں گھٹ جاتی۔ ۱۲ ستمبر کو ان کا بلڈ
 پریشر اچانک گرنے لگا اور اتنا کم ہو گیا کہ کم و بیش صفر تک آ گیا۔ ڈاکٹر دوڑے۔ دل کی حرکت
 بند ہو چکی تھی۔ الٹ پلٹ کروا کر، دبا کر، بھینچ کر اسے پھر سے متحرک کیا اور آکسیجن کی ٹنکی سانس
 کے لیے لگا دی۔ دو دن وہ اسی حالت میں رہے اور ۱۴ ستمبر کو اپنے معبود حقیقی سے جا
 ملے۔ ۲۸ اگست کو آخری بار وہ میرے گھر گئے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کے
 جمعہ میرے ہاں آتے بچوں سے کھیلتے۔ ان سے لڑتے۔ کبھی ان کو رٹاتے کبھی ہنساتے اور
 ایسے خوش ہوتے جیسے دو جہاں کی دولت ان کے ہاتھ آگئی ہے۔ پہلے وہ میرے بڑے
 بیٹے خاور سے اسی طرح کھیلتے تھے اور اب وہ خاور کے بچوں سے اسی طرح کھیلتے تھے۔
 ان کے ہاتھ کی بید ہر کچھ جھیننے کی کوشش کرتا اور اس طرح بچوں میں آپس میں لڑائی مچ جاتی۔
 وہ بہت دیر تک یہی تماشہ کرتے اور کرتے رہتے۔ چلتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے کہ
 میرے پاؤں کم زور ہو رہے ہیں لیکن میں گھر سے بیڈ کی طرح پیدل آیا ہوں اور اب اللہ کی
 طرف جاؤں گا۔ یہ ان کے معمول کا آخری جمعہ تھا اور بدھ ۱۲ ستمبر ان کی تخلیقی زندگی کا
 آخری دن تھا جب انھوں نے اپنا آخری افسانہ مکمل کیا۔ وہ لکھنے کے لیے پیدا ہوئے تھے
 اور آخر وقت تک لکھنے کے عمل میں مصروف رہے۔ قابل رشک ہیں وہ لوگ جو جس
 کام کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں وہی کام دل لگا کر لگنے کے ساتھ لگن جو کرتے رہتے
 ہیں۔ پھر غلطیوں ان کے قدم چومتی ہیں اور شہرت ان کو ہر دم سلام کرتی ہے۔ ابو الفضل
 صدیقی اردو زبان کے بڑے افسانہ نگار تھے۔ اتنے بڑے کہ اردو ادب کا مورخ ان کے
 نام اور کام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ سلطان حمید رجوش اور منشی پریم چند کے قریب
 کی سانس سے تعلق رکھتے تھے جن میں علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری کے نام آتے
 ہیں۔ انھوں نے جاگیر دارانہ تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں اردو ادب کو دی ہیں اور جس طرح

عوام کے دکھ درد اور مسائل ان کی تحریروں میں ابھرے ہیں، اس طور پر کسی افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتے۔ ان کی نصف سے زیادہ تحریریں غیر مطبوعہ ہیں۔ متعدد افسانے اردو رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ ”اہرام“ ان کا پہلا مجموعہ تھا جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۷ افسانے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں ”چار ناولٹ“ نامی مجموعے میں ان کے چار عظیم ناولٹ پاکستان میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد مکتبہ اسلوب کراچی سے ان کے تین مجموعے (آئینہ انصاف، جوالا مکہ) ایک ساتھ شائع ہوئے جن میں افسانوں کی کل تعداد چودہ ہے۔ ”سرور“ ان کا ناول تھا جو سلطان سنڑ کراچی سے شائع ہوا تھا ”زنگ“ نامی ضخیم ناول ابھی کتابت کے مرحلے سے گذر رہا ہے۔ کم و بیش ان کی دو سو کہانیاں ’خاکے اور تحریروں‘ ایسی ہیں جو ابھی تک یا تو غیر مطبوعہ ہیں یا کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئیں۔ ہمیں مل کر ان کی ساری تحریروں کو یکجا و مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادب کا یہ انمول سرمایہ محفوظ رہ جائے اور گنے والی نسلیں ان سے مستفیض ہو سکیں۔

۲۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو سلطان حیدر جوش نے ان کے پہلے افسانوی مجموعے ”اہرام“ کے تعارف میں لکھا تھا کہ ”میری دعا ہے کہ ابو الفضل صاحب دنیا کے ادب میں اس طرح چمکیں جس قدر ان کی بڑی چمک دار آنکھیں“ ڈولنے تک محدود رہنے والی مستقل سکراہٹ اور مطالعہ کرنے والی نظریں چاہتی ہیں اور ماشاء اللہ ان کی بلند و بالا سرخ و سپید ہنستی کیلئے آزاد و آزادانہ جوالا کا تقاضا ہے۔“ اور ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو سفید واڑھی نے ان کے چہرے کو لڑائی بنا دیا تھا۔ بڑی چمک دار آنکھیں مسکڑ کر چھوٹی ہو گئی تھیں اور سرخ و سپید رنگ پیلا اور میلہ ہو گیا تھا۔ یہی ان کی بھرپور زندگی کے طویل سفر کا نقطہ انجام تھا لیکن جب میں نے چادر اٹھا کر ان کے چہرے کو دیکھا تو دیواروں سے اترنے والی دھوپ کی طرح وہ سکراہٹ اب بھی ان کے ذہان پر محفوظ تھی۔ وہ شاید بات کرنا چاہتے تھے مگر وہ بات کرنے کی منزل سے بہت لگے جا چکے تھے اور ان آنسو ڈل سے بھی بے نیاز تھے جو ارد گرد کھڑے افراد خاندان

بہوئیں ایشیاں، پھوٹے، نواسیاں، بھائی بھتیجے ان کی جدائی پر نالہ و درد کے ساتھ بہا رہے
تھے۔ نذر الحسن صدیقی مجھ سے چمٹ کر رونے لگے اور میر کا یہ شعر میرے ذہن کے
دریچے سے بھاگنے لگا:

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

(۲۴ ستمبر ۱۹۸۷ء)

جمیلہ ہاشمی کے دوناول

(۱)

جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول ”چہرہ بہ چہرہ رد بہ رو“ ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم سب کو پڑھنا چاہیئے۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے اس ناول میں ایک ایسی متنازعہ لیکن عظیم ہستی کو موضوع بنایا ہے جس کا نام کج ننگ خود ایک افسانہ ہے۔ اس سلسلے، جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں، ایک ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی جو حق کی تلاش میں ساری زندگی سرگرداں رہی اور حق کی تلاش ہی میں جان دے دی۔ حق ہی اس کا محبوب تھا جس کے غم بہر میں وہ ساری عمر تڑپتی رہی۔ آنکھیں جب محبوب کو دیکھتا چاہیں تو پھر کسی اور کو دیکھنے کی حمت نہیں کرتیں۔ اُس نے رسم پرست معاشرے میں ایک عورت ہوتے ہوئے بھی وہ کام کیا جو ایرانی معاشرے میں اس وقت بہت دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اس نے فرسودہ قدردوں کو تشکیک کی نظر سے دیکھا اور انھیں سوال ہٹا کر معاشرے کے شعور کو بیدار کر دیا۔ جب اپنی خادمہ پانی کو قریب بلا کر اُس نے کہا: ”تم نے کسی خدا کو دیکھا ہے؟“ تو خادمہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

قرۃ العین طاہرہ نے پھر کہا — ”تم یہ سوچتی ہو کہ خدا کو نہیں دیکھ سکتیں، جو ہر شے میں جاری و ساری ہے، جو سب جگہ موجود ہے۔“
اور جب پانی نے یہ سنا تو کہا — ”آقا زادی! اگر خدا ہر شے کے اندر موجود ہے تو

میرے اندر بھی موجود ہوگا۔

قرۃ العین طاہرہ نے پھر کہا۔ ”کیا تم نے اس سے پہلے محسوس نہیں کیا کہ خدا تمہارے اندر موجود ہے۔ تم خدا کا ایک حصہ ہو۔“

بائی نے دلواؤں کی طرح جواب دیا۔ ”نہیں، یہذا آکا زادی نہیں۔ میں اب سوچنے کی جرأت کیسے کر سکتی ہوں۔ میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکتی ہوں۔ میں تو عرف بائی ہوں۔ ایک خادمہ! میرے اندر بھلا خدا کیسے آکر سکتا ہے!“

یہ سن کر وہ دھم سے گر پڑی اور کچھ کہیں نہ اٹھی۔ سچائی کا ایسی وہ تصور تھا جو قرۃ العین طاہرہ کا بنیادی مسئلہ تھا اور جسے وہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دینا چاہتی تھی۔ قرۃ العین اسی نئے شعور کی علامت تھی اور یہی نیا شعور قرۃ العین کے مہدی موعود کا ظہور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا ایران ہزار سال گذر چکے کے بعد امام غائب کے ظہور میں آنے کی پیشین گوئی کا انتظار کر رہا تھا۔ قاجاری سلطنت زیرِ زبر تھی اور ایران کی روح خود کو دریافت کرنے کے لیے بے چین تھی۔ قرۃ العین طاہرہ نے اس روح کو علی محمد باب کے روپ میں دیکھا۔ حکم ہوا۔ ”اتھو اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے اسے لوگوں کو دکھا دو۔“ اس نے سوچا کہ اب سیاہ رات کا سویرا ہو گیا ہے۔ باب کا مذہب ایران کا اپنا مذہب تھا۔ اپنی وحی اپنے قوانین۔ اس نے قرآن کریم کو اعراب سے آزاد کر دیا تھا۔ طاہرہ قائم آل محمد کی تلاش میں بہت دور نکل آئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کسی بڑے مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ یہ خدا داد ذہانت اُسے بڑی نہیں ملتی ہے۔ وہ ایران کے بے عمل حامد معاشرے کو دلائل عقل کی روشنی سے متحرک کر دینا چاہتی تھی۔ وہ ساری عمر اسی نئے شعور کے ساتھ زندہ رہی اور اسی شعور کا تخم سرزمینِ ایران میں بڑھ کر فنا ہو گئی۔

جمیل بائشی نے اسی عظیم عورت کی زندگی اور فکر و فلسفہ کو اپنے ناول کا موضوع

بنایا ہے جو آج کلٹی سے قرۃ العین تھی۔ قرۃ العین سے طاہرہ بنی۔ طاہرہ سے زرین تاج بنی اور پھر ام العالم بن گئی۔ اس موضوع پر یہ اردو زبان میں پہلا ناول ہے۔ عزیز احمد مرحوم نے قرۃ العین طاہرہ کو موضوع بنا کر ”زرین تاج“ کے نام سے ایک خوب عورت افسانہ لکھا تھا جو آج بھی اردو

کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس صدی کے اوائل میں مولانا عبدالحلیم شرر نے حسن صباح کی تحریک کو موضوع بن کر اپنا ناول ”لرد وی بری“ لکھا تھا جو آج بھی اردو کے اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ ”تاریخ“ انسانی فکر احمد وجہد اور شعور و عقل کا وہ خزینہ ہے جس سے سینکڑوں ناولوں کے تار و پود بنے جاسکتے ہیں، جس سے ٹہم لپے حال کو ماضی کی روشنی سے نمود کر سکتے ہیں۔ عزیز احمد نے ”زیریں تلخ“ اور ”جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں“ لکھ کر ہمارے دوز میں جدید تاریخی ناول لکھنے کی بنا ڈالی تھی۔ جمیل ہاشمی نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اب آنکھیں ہمارے نئے لکھنے والے تاریخ کو اپنے دور کے حوالے سے کیسے دیکھتے ہیں اور کیسے اپنے نئے ناولوں میں کھاتے ہیں۔ مریضانہ ذہن کی رومانیت کا زمانہ گزر گیا۔ اب ہمارے تخلیقی فن کاروں کو چاہیے کہ وہ بہر ناول نویسی کی موجودہ روش کے اس جذباتی دلدل والے دائرے کو توڑ کر باہر نکلیں اور اردو میں محنت و انہماک سے تاریخی ناول لکھنے کے ایسے نئے دور کا آغاز کریں جس میں ایک طرف ماضی حال سے آملے اور دوسری طرف ہمیں زندگی کا نیا شعور بھی ملے۔ ایسا شعور جو ہمیں ذہنی سطح پر نئے سفروں پر گاسائے اور ہم اُن جانی دنیاؤں کو دریافت کرنے پر نکل کھڑے ہوں۔ ہماری روح اس سفر کے لیے بے چین ہے۔ ہمارے ناول نگار اور ادیب و شاعر اس روح کو نئے سفر کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ ناول اس کام کے لیے سب اہم اور بڑا میڈیم ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ جمیل ہاشمی ہمارے لکھنے والوں میں وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے تاریخ کے حوالے سے اس سفر کا آغاز کر کے ذہن انسانی کے نہاں خافوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں وہ لگن ہے جو لکھنے والے کو ہر دم نئے سفر پر آمادہ رکھتی ہے۔ سفر حرکت کی علامت ہے۔ اُن جانی دنیاؤں کو جاننے کی خواہش کا نام ہے تخلیقی زندگی کا استعارہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے بائیس سال پہلے ان کا پہلا افسانہ جب ہفت روزہ ”لیل و نہار“ میں شائع ہوا تھا تو وہ افسانہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے بعد ان کے کئی افسانے ”لیل و نہار“ میں چھپے اور وہ سب کے سب مجھے اچھے لگے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ”داستان گزلاہو“ میں ان کا وہ ناولٹ چھپا جسے آج ہم ”آتش رفته“ کے نام سے جانتے ہیں اور حمار دو کے

چند اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا ناول "تلاش بہاراں" چھپا، جس پر انہیں "آدم جی انعام" ملا۔ اس عرصے میں انہوں نے بہت سی کہانیاں لکھیں جن میں سے بیشتر "نیادور" کراچی میں چھپیں اور جو کچھ بھی پڑھنے والوں کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بیشتر کہانیاں ان کے مجموعے "آپ بیتی جگ بیتی" میں شامل ہیں۔ پھر انہوں نے ایک ایسے موضوع پر ایک ناول "روہی" کے نام سے لکھا جو اس سے پہلے برصغیر کی کسی زبان میں موضوع ادب نہیں بنا تھا۔ ہمارے ملک عزیز کے اُس فنِ ودق صحرا کی کہانی، جسے ہم چولستان کے نام سے جانتے ہیں اور جو جغرافیائی اعتبار سے بھاول پور کا حصہ ہے۔ اس کے بعد جمیل ہاشمی نے تین اور ناول لکھے جو ۴۴ء، ۴۹ء میں "اپنا اپنا جہنم" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ جمیل ہاشمی کے لکھے کا اپنا انداز ہے۔ ایک اچھے فن کار کی طرح انسان اور انسانی رشتوں اور چیزوں کو دیکھنے کا اپنا ڈھنگ ہے۔ ان کے اسلوب پر "جو زفت کو نرڈ" کا گہرا اثر ہے۔ اب وہ "چہرہ بہ چہرہ رو برد" نے کر آئی ہیں۔ ان جاتی چیزوں کو جاننا ان کا مزاج ہے۔ آج کل وہ منصور صلاح کی زندگی اور فلسفہ و نقوت کو اس لیے پڑھ رہی ہیں تاکہ وہ انسانِ منصور کو از سر نو تازہ کر سکیں۔ جمیل ہاشمی کا سفر جاری ہے۔ وہ سفر جو فانی انسان کو فانی بنا دیتا ہے۔

جمیل ہاشمی کا تخلیقی مزاج یہ ہے کہ وہ "اسرائیل" کو جاپا سختی ہیں لیکن اس کا پروہ چاک نہیں کرتیں۔ ان کی روح میں شاعری ہے اسی لیے حقیقت ان کے ہاں افسانہ بن جاتی ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ رو برد" میں داستان گو نے تاریخ اور اس کے واقعات سے انحراف نہ کرنے کے باوجود تاریخ کو افسانہ بنا دیا ہے۔ یہ کوئی ایسا رومانی معاشرتی ناول نہیں ہے جس میں موثر سٹائل کی روانی، کارگی تیز رفتاری اور ہوائی جہازوں کا کٹر ہو بلکہ یہ ایران کی تاریخ کے اس دور کی کہانی ہے جب ایران کا سیاسی استحکام زوال پذیر تھا اور ایران کو ایک ایسی فکر کی ضرورت تھی جو اُسے دوبارہ متحرک کر کے فرسودہ اقتدار کی شدید گرفت سے آزاد کر سکے۔ جب مذہب محض ایک رسم بن جائے اور اس میں زندگی کو آگے بڑھانے کی قوت باقی نہ رہے۔ عدل و انصاف ختم ہو جائے جبر و استحصال

کے بوجھ سے غلام کی کمر لٹھٹے گئے تو ایسے میں علی محمد باب اور بہار اللہ جیسے کردار تاریخ کے اسٹیج پر ظاہر ہوتے ہیں جو رسم پرست معاشرے کے ہاتھوں خود تو فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہب کی رسم پرستی کا ثبوت پاشا پاش کر جاتے ہیں۔ جمیل ہاشمی نے اس ناول کو محنت اور لگن سے لکھا ہے۔ یہ ایک شکل ناول ہے جسے پڑھنے کے لیے آپ کو بھی محنت کرنی پڑے گی۔ وہ لوگ جو محنت سے بھاگتے ہیں اور چیزوں کو محنت سے دریافت کرنے اور جاننے کے عادی نہیں ہوتے انہیں اس ناول کے سمجھانے اُن کچھ شمیم ناولوں کو پڑھنا چاہیے جو محض صفحے پلٹنے سے سمجھ میں آ جاتے ہیں اور جرم عام طور پر تاجران کتب کے ہاں مل جاتے ہیں۔

”چہرہ بہ چہرہ و در و در“ کی نثر کے بارے میں بھی ایک بات کہنا چلوں۔ اس ناول کے بعض حصے خوب صورت نثر کے نمونے ہیں جو ہمیں مصنف کی باطنی کیفیت نے فکر و احساس کو ایسے آجاکر کیا ہے کہ ایک جان دار تصور ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ مثلاً یہ چند جملے سنئے:

”سماوار کے قریب بیٹھ کر تپش سے دھڑ دھکول پاتا ہے۔ روح غم انگیز واقعات کو بھلا دیتی ہے۔ دل کار و بار حیات میں پھر خوشی تلاش کر لیتا ہے کیوں کہ وقت بڑے سے بڑا زخم مندمل کر دیتا ہے۔ ہاں زخم بھر جاتے ہیں، مگر چٹان ٹوٹ جاتے تو یہاں کا وہ حصہ اسی طرح بد نما لگتا رہتا ہے اور اُسے صد ہاں اور قریب بھی درست نہیں کر پاتی۔“ (ص ۱۰)

اب اس سے بالکل مختلف مزاج کے یہ چند جملے سنئے:

”قومیں صفحہ ہستی سے ناہید ہوئیں اور خود اُن پر اُن کی بہتیاں اٹائی گئیں۔ طوفان بھیجے گئے۔ زمین و آسمان میں کہیں امان نہ ملے۔ خوارزم شاہی سلطنت تباہ ہوئی اور یا جوج ماجوج کی قوم نے مشرق سے نکل کر ساری بادشاہتوں کو آٹ ڈال دیا۔ بغداد ایک قصہ داستان بن گیا۔ کیا یہ عبرت کافی نہیں۔ اسپین و بلادِ مسجدیں رشیدی خوانی کو باقی رہ گئیں۔ مگر اولادِ آدم کسی دوسرے کے قصے سے سبق نہیں سیکھتی۔ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ سب کچھ اس پر ہوتے اس پر گزرتے۔ ہر زمانے کے سبق اس کے لپٹے پید اگر وہ ہونے چاہیں۔“ (ص ۶۵)

اس نشر میں ایک دوسرے سے مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک پر احساس جادی ہے۔ دوسرے میں تاریخ کو ایک دائرے میں سمیٹ کر یک جا کر دیا ہے۔ لیکن جمیل ہاشمی کے مزاج نے ان دونوں میں اپنے اندازِ نظر سے ایک ایسی خوش گوار ہم آہنگی پیدا کر دی ہے جس سے اندازِ بیان ٹوٹا اور تاثر گہرا ہو گیا ہے۔

اسی طرح اس ناول میں جاہاننا جاتیں آتی ہیں۔ یہ سب مناجاتیں خود جمیل ہاشمی کی تخلیق ہیں جو ایک طرف ناول کے تاثر کو ابھارتی ہیں اور دوسری طرف آج کی زبان میں انھیں "نثری نگین" بھی کہا جاسکتا ہے۔

(۱۰ مئی ۱۹۷۹ء)

(۳)

آج جمیل ہاشمی اردو دالوں کے لیے ایک ایسا نام ہے جس نے اردو فکشن میں اعتبار کا درجہ پانیا ہے۔ وہ اعتبار جو اچھا اور مسلسل لکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب جمیل ہاشمی کے لیے تعلقات عامہ، آرائش محفل یا حصولِ شہرت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کا وہ خوب ہے جس کی تعبیر ان کی کہانیاں ہیں۔ وہ کہانیاں جو زندگی کے باطن میں چھپی ہوئی ہیں اور صرف ان کو نظر آتی ہیں جو زندگی کے آئینے میں اپنے خجروں اور محسوسات کی جھلک اس طرح دیکھتے ہیں جیسے دو لہا دلہن آرمی مصحف میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ یہی جمیل ہاشمی کا تخلیقی عمل ہے جس میں اندھیارے آجواں میں اور روشنی ظلمت میں مل کر ایسے رنگ بناتے ہیں جن میں روشنی تاریکی کو اور اجالا اندھیارے کو بدل دیتے ہیں۔ اسی تخلیقی عمل سے وہ نظم پھوٹتا ہے جو جمیل ہاشمی کی نثر کو نورِ ظہور کے تڑکے کا سا رنگ اور سماں عطا کرتا ہے۔ یہ رنگ اور سماں ان کی نثر کو ایک ایسی نگین دیتا ہے جو اس دور کے دوسرے لکھنے والوں میں کبھی بھارا اور کم کم نظر آتی ہے۔ جمیل ہاشمی کی نثر میں یہ بات ہے ہمیشہ محسوس ہوتی ہے اور آج جب "دشتِ سُوس" پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو ہمیشہ کی طرح آج

بھی ان کی نشر کا مرنا جن مجھے نغموں پر گسالی لگا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ہاں بات کو کیسے نغموں تو یہی نظر ہو گئے کتاب کے عنوان پر پڑی جس کی ذیلی سرخی ”حسین بن منصور علاج۔“ ایک غنائیہ ہے اور اس کے تین حصوں کے نام۔ صدائے ساز، نغمہ شوق اور زمزمہ موت ہیں۔ یہ عنوانات جمیلہ ہاشمی نے اپنے تخلیقی مزاج اور اپنے احساسات کی مناسبت سے رکھے ہیں۔ ان سب میں نغمہ و ساز مشترک ہیں۔ اسی مزاج نے جمیلہ ہاشمی کی نشر کو ایک ایسا رنگ دیا ہے جس میں نغمہ شامل ہے اور ایک ایسا روپ دیا ہے جو ساز کی صدا سے دگ اٹھتا ہے۔

خواتین و حضرات! ہمارے دور میں ابھی نشر کھنے کا شوق ماند پڑ گیا ہے اور وہ ماند گئی شوق ہی نئی پناہیں تراشتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی نشر اپنی مدھمکے اور اپنی دھیمی شرلوں والی تنگی سے مسخ کرتی ہے۔ ان کے ہاں رو کی سبکی حقیقت نگاری والی نشر نہیں ملتی بلکہ نغمے میں رہی ہوئی وہ نشر ملتی ہے جس میں شاعری کی روح نشر کے قالب میں اُتر کر زندگی کی ذیبتی ہے اور عشق کا احساس اور اس احساس سے پیدا ہونے والا شوق مزرعِ گلاب ہی کہہ کر ان پگڈنڈیوں پر لے جاتا ہے جہاں منصور علاج کی طرح عشق کی نشانیاں، توفیق اور مہر پایا، ہجو ریوں کی منزل سے دور لے جا کر انا الحق سے قریب کر دیتی ہیں اور عاشقوں کے قبیلے با وضو ہد جلتے ہیں۔ منصور علاج نے کہا تھا، ”عشق ہی مزرعِ گلاب ہے اور عشق ہی مزرعِ زندگی ہے۔“ اور اسی سے جمیلہ ہاشمی کی تخلیقی قوت کا غیر اٹھتا ہے اور ایک ایسی نشر کو وجود بخشتا ہے جو چڑھنے والے کو سرشاری کی کیفیت میں لے جاتا ہے۔

خواتین و حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ دو دنوں وقت مل چکے ہیں۔ میں تو یہ بات کہہ کر آپ کی توجہ جمیلہ ہاشمی کی نشر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ نشر جس کی سمجھتی ہمارے دور میں سوکھ رہی ہے اور جس کی آب یاری پھر سے ہماری نئی نسل کو کرنی ہے۔ اس نشر کو محسوس کرنے کے لیے میں آپ کو چند جملے پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ آپ اسے سنیں اور دیکھیں کہ اس نشر کی خوشبو دوسری حقیقت نگاری والی نشر کی خوشبو سے کتنی مختلف ہے۔

”مسجد کا صحن نمازیوں سے پُر تھا اور میناروں پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں گھر گھر روشنی سے دھندلے سفید اُجالے میں اور پھر دھواں دھواں نیلے اندھیرے میں بدل رہی تھیں۔ موذن نے اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے پہلی سیرمی پر قدم دھرا اور وضو خانوں میں پانی رواں ہونے کی صدائیں آئیں اسکا روائوں کے سالار اونٹوں کو روکے رکھنے کا حکم دے کر سار باغوں کی معیت میں دالان درو دالان اونچی چھتوں سے مزین صحنوں میں داخل ہوئے۔ لوگ درود و سلام میں منہمک اور پھر خاموش ہو گئے۔ اذان کا جلال آسمانوں اور زمینوں پر منکشف ہوا۔ اونچے ایوان سبز و زار اور باغوں سے گھری بستی میں یہ مشکبو گونج ہوا کے ساتھ ساری پستیوں اور بلندیوں پر جاری و ساری بلند ہوئی۔

درویشوں کی ایک ٹکڑی اپنے فرغلوں کو سنبھالتی ہاتھوں سے نگاہ اٹھا کر ایک اندازِ مستان سے چلتی اپنے نعروں کے خوش کو اپنے سینوں میں دبائے ملوٹہ خانقاہ سے آکر نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو گئی۔ یہ غیاب و حضور کی کیفیت سے سرشار عجیب لوگ تھے کہ جب سجدے کے لیے ٹھککتے تو انھیں اٹھنے کا ہوش نہ رہتا۔ جب اٹھتے تو امام کی آواز سنائی دینے کے باوجود دھڑکے رہتے۔ یہ کسی نماز میں سرشار تھے؟

نمازی اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہے تھے جب انھیں نماز کا ہوش نہیں تھا تو یہ جماعت میں کیوں شامل ہوئے تھے؟ آج سے پہلے ایسی کسی جماعت نے نماز میں شرکت نہ کی تھی جو امام کے پیچھے اپنی الگ نماز میں مشغول ہو۔ خانقاہ میں یہ کہاں سے وارد ہوئے تھے؟

اس نثر میں آہستہ پن ہے نغمگی ہے اونچی لے میں نرم آواز رس گھولتی ہے۔ اس میں تخیل سے جان دار تصویریں بنانے کی قوت موجود ہے۔ یہ تخلیقی نثر ہے۔ جمیل ہاشمی فکشن نگاروں کی جدید نسل میں اسی لیے امتیاز رکھتی ہیں۔

(۳ جنوری ۱۹۸۳ء)

جمیلہ ہاشمی کے آخری لمحات

۷ ارنوہر ۱۹۲۹ء کو گوجرہ میں پیدا ہونے والی جمیلہ ہاشمی ۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء کو لاہور میں وفات پا گئیں۔ یہ سب کچھ یوں اچانک ہوا کہ قضا و قدر کی اس سفاکی پر یقین نہیں آتا، جیسے مرنا نہ ہو چیل جھپٹا ہو۔ چیل اپنی اور زندگی کے ہاتھوں سے، جھپٹا مار کر، جمیلہ ہاشمی کو ادہ کی فضاؤں میں اڑا کر لے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ ہفت روزہ ”لیل و نہار“ لاہور میں ایک مختصر سی کہانی چھپی۔ کہانی کا نام تھا ”دو خط“۔ پڑھی تو اچھی لگی۔ اس کے بعد اور کئی کہانیاں اس افسانہ نگار کی پڑھیں اور وہ بھی اچھی لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اردو افسانے میں نیا اور تازہ خون شامل ہو رہا ہے۔ جب بھی جمیلہ ہاشمی کی کوئی کہانی چھپتی میں شوق سے پڑھتا۔

۱۹۵۹ء کے دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور نئے سال کا سورج نئی اسنگوں اور ولولوں کے ساتھ طلوع ہونے کے لیے تیار تھا۔ انھیں تاریخوں میں کراچی میں رائٹرز کنونشن ہوا۔ اس وقت کراچی متحدہ پاکستان کا دارالحکومت تھا اور مشرقی پاکستان ہمارے جسم قومی میں دل کی طرح دھڑکتا تھا۔ ادیبوں کے اس کنونشن کے سلسلے میں میرے اور قرۃ العین حیدر کے درمیان یہ کام لگا گیا کہ بعض ادیبوں کو کراچی اسٹیشن سے لا کر انھیں ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جائے۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا سفر اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ ریل ہی وہ تیز رفتار سواری تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی تھی۔ ہوائی جہاز کے سفر کا سزا اور اخبارات میں بیان پھیلانے کا چسکہ ابھی نہیں پڑا تھا اور

تعلقات عار کے دفاتر بھی نہیں کھلے تھے۔ اُس زمانے کا ادیب آج کے ادیب کے مقابلے میں یقیناً پس ماندہ تھا۔ وہ زیادہ پڑھتا تھا اور زیادہ بحث کرتا تھا اور حیات و کائنات، سماج اور زندگی کے مسائل پر ایسے غور کرتا تھا جیسے یہ اُس کے اپنے مسائل ہوں اور انھیں سلجھانا اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہو۔ میں اور عینی بگم (قرۃ العین حیدر) کو ہم سب اسی نام سے پکارتے تھے) اسٹیشن گئے اور چند ادیبوں کو ان کی قیام گاہ تک پہنچا دیا۔ انھیں ادیبوں میں سفید گرم چادر لپیٹے ایک سخت منڈو جن کی لنگی بھی تھی بٹخاڑ ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی خاتون ہیں جن کے افسانے میں نے "ایل و نہاد" میں پڑھے تھے۔ نام جس نے آج ساری اردو دنیا میں مسلسل اور اچھا لکھنے سے اعتبار کا درجہ پایا ہے، جمیل ہاشمی تھا، اسے نام کی مناسبت کہتے یا تذکیر و تانیث کی مطابقت۔ اس دن سے مرنے کے دن تک، دوستی و خلوص کا رشتہ ماہ و سال کی گردش سے بے نیاز ہو کر قائم رہا۔ آج یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ رشتہ سدا سے تھا اور سدا رہے گا۔ جمیل ہاشمی کا نام زیادہ کراچی کی مجلسِ ادارت کی آج تک زینت ہے۔

ابھی پچھلے دنوں جمیل ہاشمی ۸ دسمبر ۱۹۸۷ء کو میری بی بی نرن کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی آئی تھیں اور ۷ دسمبر ۱۹۸۷ء کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی جب وہ شادی کی تقریبات سے منٹ کراچی پہنچی عاشری کے ساتھ اپنے گاؤں خانقاہ شریف جا رہی تھیں۔ ان دس دنوں میں وہ خوش و خرم رہیں۔ لوکیوں کے ساتھ گانے بجانے میں شریک ہوئیں۔ جہندی میں آئی گئیں۔ ویسے میں شرکت کی۔ پرہیز بھی کیا۔ بد پرہیزی بھی۔ پرہیز میری مروت میں اور بد پرہیزی اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر۔ میں شاید واحد آدمی تھا جس کا وہ لحاظ کرتی تھیں۔ ایسا لحاظ جیسا بہنیں بھائیوں کا کرتی ہیں۔ وہ ذرا بیٹیس کی مریض تھیں۔ میٹھا کھا رہی ہوتیں تو مجھے دیکھ کر ہلٹ دو کر دیتیں۔ جس دن بد پرہیزی کا ارادہ ہوتا اور نیت ڈالنا ڈول ہوتی تو میرے ساتھ کھانا نہ کھاتیں۔ جمیل صاحب! میں نے ناشتہ دیر سے کیا ہے۔ میں بعد میں ٹھہر کر کھاؤں گی۔ جب لاہور یا خانقاہ شریف سے آئیں تو میرے سب بہن بھائیوں سے ملتیں۔ میری بیوی کی تو ایسی گرویدہ تھیں کہ تعریف

کئے کرتے زبان سُوکھ جاتی۔ اپنی بیماری کا کبھی ذکر نہ کرتیں۔ جمیل بی کیسی ہیں آپ۔ میں پوچھتا۔ اچھی ہوں جمیل صاحب۔ نیا ناول شروع کر دیا ہے۔ موضوع فوراً بدل جاتا اور نسلم اسپین کی تاریخ پارینہ کا قصہ چھڑ جاتا جس پر وہ اپنا نیا ناول لکھنے کی تیاری لگدشتہ دو سال سے کر رہی تھیں۔ جمیل صاحب! یہ ناول آپ کو پسند آئے گا اور اس بار آپ مجھ سے فزور کہیں گے! جمیل بی! یہ وہ تحریر ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں بھی جمیل بی سے بہت توقعات رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ایسے ناول یا افسانے لکھیں کہ زندگی ہی میں کلاسیک بن جائیں کچ جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں میں اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ جمیل ہاشمی نے اردو ادب کو ایسی کہانیاں، ناولٹ اور ناول دیے ہیں کہ ان کا نام تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ آتشِ رفتہ، روہی اور دشتِ سُوس وہ ادب پارے ہیں جو کئے والے زمانوں میں بھی تازہ و زندہ رہیں گے۔

۱۹۷۹ء میں میری بیوی اور جمیل ہاشمی نے حج کا پروگرام بنایا۔ طے پایا کہ میں اور میری بیوی کراچی سے جہدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور جمیل ہاشمی اور ان کے میاں سردار احمد اویسی لندن سے جہدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور ہم سب ۱۸ اکتوبر کو معلم کے یہاں ملیں گے۔ ۱۸ اکتوبر کو ہم دونوں سارے دن ان کا انتظار کرتے رہے مگر وہ..... نہیں آئے۔ تین چار دن بعد کسی نے کراچی کا اخبار ”جنگ“ لا کر دیا تو ایک خبر پر میری نظر جمی اور میں سناتے میں رہ گیا۔ میاں سردار احمد اویسی اُس وقت وفات پا گئے جب ان کا جہاز جہدہ کے ہوائی اڈے پر اتار دیا گیا تھا۔ ان کی میت کراچی واپس لائی گئی جمیل ہاشمی اور ان کی اکلوتی بیٹی عاشی ساتھ تھیں۔ سردار احمد ہیرا آدمی تھے۔ سیدھے سادے، شریف النفس اور وضع دار۔ جمیل ہاشمی کا ایسا خیال رکھنے جیسے مالی تازہ گلاب کا رکھتا ہے۔ ساری ذمہ داری، گھر کی، باہر کی، خود اٹھاتے اور جمیل کو لکھنے پڑھنے کے لیے تازہ دم رکھتے۔ جودہ کہتیں وہ کرتے۔ عاشی کو ہر دم اپنے ساتھ رکھتے، جو اُس کے منہ سے نکلتا ہوا کرتے۔ تازہ دم میں علی بی بی اپنی بہن باپ کے ساتھ تھی اور جمیل کی ہائیلوکس جگڑا اور منہ مول کے نشتے کے لیے اکیلی رہ گئی تھیں۔ جس پاروی سے انھوں نے زندگی کے جھیلوں کا مقابلہ کیا

جمیلہ کی زندگی کا وہ نیا رخ سامنے آیا جواب تک بچھا ہوا تھا۔ انھوں نے بیٹی کے ساتھ مل کر زمیوں اور جائیداد باغ کے انتظام کو ایسے سلیقے سے چلایا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلے باپ کی لاش عاشی اپنے گاؤں کے لے کر گئی تھی اور ۱۹۸۸ء کو وہ اپنی ماں کی لاش اپنے گاؤں کے لے کر گئی تاکہ آہائی قبرستان میں سپرد خاک کر دے۔ مصطفیٰ نے کہا تھا:

کیا تمنا نظر آتا ہے انھیں، حیراں ہوں

یار کیوں خاک کے پردے میں چلے جاتے ہیں

۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء۔ میں اسلام آباد میں تھا کہ کراچی سے فون آیا۔ جمیلہ ہاشمی بہت بیمار ہیں اور انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں کل رات سے داخل ہیں۔ میں نے لاہور ٹیلی فون کیا۔ عاشی نے اٹھایا۔ وہ رو رہی تھی۔ اٹکل میں کیا کروں۔ اٹکی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اٹکل میں کیا کروں۔ میں نے تسلی دی۔ ڈھارس بندھائی اور کہا میں ابھی دو بارہ فون کرتا ہوں۔ کشور ناہیدہ کو فون کیا۔ وہ نہیں ملیں۔ سائرہ ہاشمی کے گھر فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملیں۔ انتظار حسین کو فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملے۔ معلوم ہوا تھا کہ آج لاہور خالی ہو گیا ہے۔ دو بارہ عاشی کو فون کیا۔ جمیلہ ہاشمی کے بہنوئی یعقوب خان صاحب بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کل رات ساڑھے دس بجے کے قریب اچانک طبیعت خراب ہوئی، فوراً ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو بلڈ پریشر کی مشین خط مستقیم بنارہی تھی، خون میں شکر کی سطح ۳۹۶ ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے دلغ متاثر ہو گیا تھا۔ رات سے لے کر دوسرے دن ایک بجے تک انھیں زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ جب سانس کا رجحان کاٹھنٹے لگتا تو وہ سانس بھال کرنے اور زندہ کرنے کے لیے پسلیوں اور سینے کو دھاتے۔ بھلی کے جھکے دیتے۔ اس عمل سے پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ دس بارہ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد وہ اس نراس کی کیفیت سے باہر نکلے اور ایک بج کر تین منٹ پر اعلان کیا کہ مریض نے دم توڑ دیا ہے اور وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے پوچھا عاشی کہاں ہے؟ وہ دھاڑے مار کر رو رہی تھی۔ اٹکل میں کیا کروں۔ اتنی مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں نے مقدور کھیر سلی دینے کی کوشش کی اور کہا میں جلد پہنچتا ہوں۔ اس وقت تک جمیلہ ہاشمی کی بہت ہسپتال میں تھی۔ مگر

نہیں آئی تھی۔ میں نے اسلام آباد سے لاہور پہنچنے کے انتظامات کیے اور سارے تین بچے کے قریب بھر فون کیا۔ عاشی فون پر تھی۔ اب اس کے آنسو سوکھ چکے تھے اور سارا غم دل میں اتر گیا تھا۔ انکل میں امی کی تدفین کہاں کروں۔" بیٹا! "میں نے کہا" لپے گلاؤں میں بیٹا انشاء اللہ ہمارے بچے کے جہاز سے پہنچ رہا ہوں" انکل کو پھر تم میت کو ایک گھنٹے میں خانقاہ شریف لے جائیں گے۔ میں نے پھر تسلی بخشی کہ آپس میں اور فون رکھ دیا۔ ابھی فون رکھا ہی تھا کہ اختر جمال کا فون آیا۔ بھائی! میں نے بہن سے بات کی ہے۔ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ خانقاہ شریف چلوں گی۔ ۱۱ جنوری کو ہم تینوں اسلام آباد سے لاہور، لاہور سے ملتان اور ملتان سے گلاڑی میں خانقاہ شریف پہنچے تو سارے بارہ بج چکے تھے۔ قبرستان پہنچے تو جمیل ہاشمی کی کچی قبر پر حافظ صاحب قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ مہاوٹ کی ہوائیر کی طرح جسم میں میوہست ہو گئی۔ ہمارا سرد اور تیز ہوا تو آنسو بھی آجاتے ہیں۔ میں نے آنسو پونچھے اور ہوا کے رخ کی طرف پیٹھ کر لی۔ فاتحہ پڑھی اور جمیل ہاشمی کے بلغ میں آگیا جہاں گلاب کے بے شمار پودے دم سادھے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ کشورناہید اور شاد عزیز بڑا تصویر غم سنی ساکت دمات سر جھکائے بیٹھی تھیں اور مصحفی مجھ کے کہہ رہے تھے:

تھی جن سے گفتگو ہمیں، وہ یار مر گئے

جنہی سخن کے اپنی خریدار مر گئے

(یکم فروری ۱۹۸۸ء)

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول مادی اور دنیا میں شوق و دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ متعدد زبانوں میں ان کی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ عصمت چغتائی نے ہی کہانیوں کے ذریعے متوسط طبقے کی ان عورتوں کی ترجمانی کی ہے جو اب تک گونگی اور بے نام تھیں۔ انھوں نے ان کے باطن کی ان کہانیاں، ایسے دل چسپ انداز اور انھیں کی زبان، روزمرہ و محاورہ میں، ایسی بے باکی سے سنائی ہیں کہ اس سے پہلے ایسی کہانیاں اس طور پر نہیں لکھی گئی تھیں۔ ان عورتوں میں کنواریاں بھی شامل ہیں اور شادی شدہ بھی۔ بے اولاد دوبرھیاں بھی ہیں اور بھرے پڑے گھر میں حکمرانی کرنے والی ساسیں، وادیاں اور نانیاں بھی۔ وہ ایک مقبول اور بے باک افسانہ نگار ہیں۔ وہ جب بھی پاکستان آئیں اہل پاکستان نے نہ صرف اپنی محبت اور عقیدت کا برملا اظہار کیا بلکہ پروانہ دار ان تک پہنچنے رہے۔ ایک لکھنے والے کے لیے یہی عظمتوں کی معراج ہے کہ اس کی تحریریں کتنے لوگوں تک پہنچتی ہیں اور ان تحریروں کے پڑھنے والے اس کی تحریروں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اظہار محبت یا اظہار عقیدت پڑھنے والوں کی پسندیدگی کا نکتہ بولتا ثابت ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ عصمت چغتائی ان گنت چنے اور بونوں میں سے ایک ہی حقیقت پر اپنی تائیں پچاس سال سے مسلسل لکھ رہی ہیں۔ جن کی تحریریں آج بھی اسی طرح پسند کی جاتی ہیں، جس طرح پہلے کی جاتی تھیں۔ میں بھی ان کا ایک قاری ہوں اور اس وقت سے ان کی تحریریں پڑھ رہا ہوں جب بحیثیت افسانہ نگاران کی شہرت کا آغاز ہوا تھا اور ان کے افسانے شاہد احمد دہلوی مرحوم کے ساتھیوں میں شائع ہوتے تھے۔ اس وقت میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ یہ بات ۱۹۴۲ء

کی ہے کہ کالج کی لائبریری میں ایک کتاب آئی، کتاب کا نام تھا "میرا بہترین افسانہ" اور اس کے مرتب تھے محمد حسن عسکری۔ اس میں ۵ افسانے شامل تھے اور ہر افسانہ نگار نے اپنے بہترین افسانے کی نشان دہی کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اسے یہ کہانی کیوں پسند ہے۔ اس میں کم و بیش وہ سب افسانہ نگار شامل تھے جو آج اپنی عظمتوں کی انتہاؤں پر پہنچ چکے ہیں یا اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ مجھے یاد ہے اس مجموعے میں سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، غلام عباس، کرشن چندر، اخ، اور نبوی، راجندر سنگھ بیدی، چودھری محمد علی اور رشید جہاں اور خود حسن عسکری صاحب کے افسانے بھی شامل تھے یہ سب لوگ وفات پا چکے ہیں اور اوپر نہر نا تھا اشک، آخر حسین دل لے پوری، دیو ندر ستھیا رتھی، محترم مفتی اور عصمت چغتائی کے بھی افسانے شامل تھے۔ اس مجموعے میں اکثر ایسے افسانے بھی شامل تھے جو آج بھی اردو کے بہترین افسانے شمار ہوتے ہیں مثلاً چودھری محمد علی کا تیسری جنس، راجندر سنگھ بیدی کا دس منٹ بارش میں، سعادت حسن منٹو کا کالی شلوار، غلام عباس کا آئندی، محمد حسن عسکری کا حرام عادی اور عصمت چغتائی کا افسانہ "تل"۔ آج چالیس پینتالیس سال بعد جب ان افسانوں کو یادوں کی بستی کے گلی کوچوں میں دریافت کرتا ہوں تو دو قسم کی خوشبوؤں سے دل و دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ ایک خوشبو اس چیز سے پیدا ہوتی تھی کہ افسانہ نگار نے "کہانی" کے موتی کو براہ راست منکاح زندگی کے سمندر سے حاصل کیا تھا۔ دوسری خوشبو اس تخلیقی عمل سے پیدا ہوتی تھی جس کے ذریعے افسانہ نگار نے اس اثر کو "لفظوں کی مدد سے" کہانی کے نقش میں اس طور پر بیٹا تھا کہ کہانی کا لہر اثر پیدا ہو گیا تھا جس نے خود افسانہ نگار کے اندر پرورش پاکر اسے کہانی نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ اسی لیے اس دور کی کہانیاں، آج کے دور کی کہانیوں کے برخلاف، بہت زیادہ مقبول تھیں۔ نہ یہاں علامتوں کا مسئلہ تھا کہ جس نے ابلاغ کو بے معنی بنا دیا ہے اور نہ اخبار کی سطح پر وہ پھوٹ پڑی تھا جو آج کی کہانیوں میں عام طور پر نظر آتا ہے اس وقت کے لکھنے والے زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ اظہار کو ادب کی بنیادی خصوصیت سمجھتے تھے۔ غلط زبان لکھنے پر تڑپ کر تے تھے اور اپنی بات کو اظہار کا ہار پہنانے کے لیے

محنت کرتے تھے۔ اسی لیے ان لوگوں کی وہ کہانیاں جو آج سے چالیس پتیس سال پہلے لکھی گئی تھیں آج بھی ہمارے احساس کے سروں کو اسی طرح مرتعش کرتی ہیں جس طرح اس وقت کرتی تھیں جب وہ لکھی گئی تھیں۔ عصمت چغتائی کی کہانیاں اس وقت بھی اور آج بھی دو باتوں کی وجہ سے پسند آتی تھیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے اپنے تجربے کے تانے بانے کو پُر اثر انداز میں کہانی نگاروں کی نگاہوں اور دوسرے اسے روزمرہ کی عام زبان میں ایسے سلیقے اور سگھڑی سے بیان کیا تھا کہ پڑھنے والا زبان و بیان کی دل کشی سے کہانی کے اثر میں آجاتا تھا۔ یہی وہ عمل ہے جو آج بھی موثر ہے اور ہمارے نئے لکھنے والوں کو عصمت چغتائی کی کہانیوں کے فن سے لے سیکھنا چاہیے۔

(۲۰ مارچ ۱۹۸۶ء)

رضیہ فصیح احمد کے افسانے

افسانہ ہمیشہ سے ادب کی مقبول ترین صنف رہا ہے اور یہ صنف آج بھی اسی طرح مقبول ہے لیکن یہ شکایت عام طور پر سُسنے میں آتی ہے کہ آج کل افسانوں کے مجموعے نہیں بکتے۔ اس کے برخلاف یہ بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ کوئی رسالہ بغیر افسانوں کے فروخت نہیں ہوتا۔ اس سے اس بات کا پتا چلا کہ افسانہ سالوں میں تو مقبول ہے لیکن کتاب میں نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانے چوں کہ پہلے رسالوں میں شائع ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والے عام طور پر انہیں دہریں پڑھ لیتے ہیں، اس لیے جب یہ کتابی شکل میں آتے ہیں اور افسانوں کا قاری افسانوں کے مجموعے پر نظر ڈالتا اور دیکھتا ہے کہ یہ افسانے تو اس کے پڑھے ہوئے ہیں تو وہ جلدی سے کتاب بند کر کے اسی جگہ رکھ دیتا ہے جہاں سے اُس نے اٹھائی تھی۔ قاری کا یہ رویہ افسانوں کے مجموعوں کے ساتھ اس لیے درست ہے کہ زمانہ قدیم کے دانشوروں کا یہ نیک مشورہ کہ ”زن بھوہ مکن گرچہ حور است“ اس کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ دوسری طرف گذشتہ دس بارہ سال میں ایک اور تبدیلی آئی ہے۔ پہلے ہر رسالہ ادبی رسالہ ہوتا تھا جس میں افسانے بھی ہوتے تھے اور فکری و تنقیدی مضامین بھی۔ مسائل و مباحث بھی ہوتے تھے اور شعر و شاعری بھی۔ قاری ان سب چیزوں میں ایک ساتھ دلچسپی لیتا تھا لیکن اب ڈائجسٹوں نے ہر قسم کے افسانوں کا ٹھیکہ اٹھا لیا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو اندھا کر دینے والی نہایت باریک کلمت میں اپنی زبان کے افسانوں کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں کے افسانے اخذ و ترجمہ

کر کے چھاپتے ہیں اور پانچ سات روپے میں ڈھیر سارا سستا مال قاری کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی لیے عام قاری سستی رومانی، معاشرتی، مجاہدہ، جنسی، شہوانی، تاریخی، مذہبی، تبلیغی، سماجی، فرائی کہانیوں کے لیے اردو زبان میں چھپنے والے لاتعداد ڈائجسٹوں سے رجوع کرتے ہیں۔ انہیں ڈائجسٹوں میں فنکارش چندر، عصمت، ہمدی، غلام عباس، عزیز احمد، قزوین حیدر، ابو الفضل صدیقی، رضیہ فصیح احمد کے افسانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے اچھے اور بُرے لکھنے والوں کے افسانے بھی مل جاتے ہیں۔ ڈائجسٹوں میں محمود وایاز ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ڈائجسٹوں کی حیثیت اس ٹھیلے کی سی ہے جس پر ہر قسم کا سامان رکھا ہے اور اس کا مالک زبرد زور سے آواز لگا کر کہہ رہا ہے۔ ”ہر حال ملے گا چلا کر آئے“ ڈائجسٹوں نے اسی لیے افسانے کے مجموعوں کی اشاعت کو شدت سے متاثر کیا ہے۔ اب ایسے پیغمبرِ ہی وقت میں اگر کوئی افسانہ نگار اپنا مجموعہ شائع کرتا ہے تو ہمیں مل کر اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور دل کھول کر اسے مبارکباد دینی چاہیے۔

رضیہ فصیح احمد ہماری ان خواتین افسانہ نگاروں میں سے ایک اور ممتاز ہیں، جنہوں نے ناول اور افسانے میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ان کے اب تک چھ ناول، سب سے پہلے ”آبلہ پا“، اک جہاں اور بھی ہے، انتظارِ موسمِ گل، متاعِ درد اور آوازِ عشق کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ”آبلہ پا“ پر انھیں ۱۹۶۳ء کا ”آدم جی ادبی انعام“ بھی ملا تھا اور انعام کی اسی رسمِ نکل میں میری ان سے ٹھاکر میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان چھ ناولوں کے علاوہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ”دو پائوں کے نیچے“ اور ایک ناول ”ہفتی چھاؤں“ بھی شائع ہو چکے ہیں۔ پچھلے کے لیے کہانیوں کا مجموعہ ”آنکھ، لب، کے نام سے اور ایک سفر نامہ ”سیرِ پاکستان“ بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ شاعری بھی کرتی ہیں اور شاید مجھ سے بہتر شعرا بھی ہیں اور ساتھ ساتھ تصویریں بھی بناتی ہیں اور مجھ سے بہتر تصویریں بناتی ہیں۔ لیکن میں اپنی طرح ان کی شاعری و مصوری کے عمل کو ”سیرِ پجری“ کے ذیل میں لاتا ہوں۔ ان کی مصوری تو اس کام بھی نہ آئی کہ وہ اپنے افسانوں کے اس اچھے سے مجموعے ”لبہ سمتِ سفر“ کا سرورق ہی بنائیں۔ رضیہ فصیح احمد نے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور بہت سے افسانے بھی جو ابھی بصورتِ کتاب وجود میں آنے کے لیے بے تاب

ہیں۔

رضیہ فصیح احمد کے اس مجموعے کے بے سمت مسافر میں پانچ اچھے افسانے شامل ہیں جن میں سے تین یعنی آگ اور پانی، پہلی دراڑ اور آشیاں گم کردہ دنیا اور میں شایع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ پانچوں افسانے رضیہ فصیح احمد کے فنِ افسانہ نگاری کے نمایندہ افسانے ہیں اور یقیناً یہ ایسے افسانے ہیں جنہیں ایک سے زیادہ بار ٹھپسی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد اپنے افسانوں کے مادوں و متوسط طبقے کی گھر بلور زندگی سے متعلق ہیں۔ وہ متوسط طبقہ جو رسم پرست اور بزدل ہے، جو جھوٹی عزت و ناموس، اخلاقی وقار اور اقدار کو بندر یا کی طرح مڑوہ پتے کو پسینے سے چمٹائے ہوئے ہے۔ یہ وہی متوسط طبقہ ہے جس کا غور رضیہ فصیح احمد ایک حصہ ہیں اور اسی لیے جب وہ اس طبقے کی کہانی سناتی ہیں تو ان کہانیوں کی واقعیت اور سچائی ہمیں متاثر کر کے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ”بے سمت مسافر“ میں اسی متوسط طبقے کا ماحول، زبان اور کردار سامنے آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دو قسم کے کردار ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک وہ جو اس طبقے کے خیالات اور جذبات و احساسات کا نمایندہ ہے اور دوسرا وہ جو اس سے باہمی ہے۔ ”ڈائن“ کی اندرست اور پہلی دراڑ کا اتحاد باقی نوجوانوں کے نمایندہ ہیں۔ ”پہلی دراڑ“ اس نقطہ نظر سے ایک نمایندہ کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے ایک ایسے متوسط طبقے کی کہانی لکھی ہے جسے اس نے ”نئی فیملی“ کا نام دیا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ایک باغی نوجوان کے الفاظ میں جس کی ”ہر روایت خود ساختہ اور بناوٹی ہے۔ ہماری نانی کو دیکھو دھیلا بھر پیا نہیں کرتیں ہم لوگوں کو، مگر جب کوئی کٹے گا تو ایک ایک کو بلائیں گی کہ صبح سے دیکھا نہیں۔ آنکھیں ترس رہی ہیں اور جناب سینے سے لگائیں گی، بلائیں لیں گی، پیار کریں گی اور حکم دیں گی کہ سامنے بیٹھ رہو کہ دل بھر کے دیکھ لوں۔ یا راتنی ہنسی آتی ہے ان کی بناوٹ پر۔ مگر حیرت ہے کہ میرے سب کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ ٹپ ٹپ چاپ ان کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہی وہ گھٹن ہے جس سے اس طبقے کی نوجوان نسل دوچار ہے اور جو تیزی کے ساتھ اس مگزی کے چلنے کو فوج کر پھینک رہی ہے۔ یہی وہ طبقہ

ہے جو تبدیلی کے عمل کو روکتا ہے، نام نہاد اقدار کا ٹود کر پامان بگھٹتا ہے، لیکن جب نئی نسل اس حال کو توڑ کر نکلتی ہے تو انجد کا باپ نکھائی جاتا ہے، حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے مرجھاتا ہے۔ "ڈھن" کا ہیرو سحید کار کے نیچے دب کر مرجھاتا ہے اور "بے سمت مسافر" کا سجا و ظہیم خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے۔ سحید کی موت پر جب ندرت روتی ہوئی داخل ہوتی ہے تو سحید کی ماں، جو اس طبقے کی نمائندہ عورت ہے، ندرت کے بال نوزخ کو دلاؤ کی طرح جھج کر کہتی ہے۔ "ڈھن کتنی تو نے آخر میرے بچے کی جان لے کر چھوڑی اور ندرت سوچنے لگتی ہے۔" "تم اب بھی نہیں سمجھیں کہ ڈھن میں نہیں، تم ہو۔ سحید کو میں نے نہیں تم نے مدد ہے۔" اسی طرح آشیانہ گم کردہ کی نوجوان لڑکی بیانگلو دہلی کہتی ہے کہ "تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لڑکی پٹھانوں کے وقیانوسی، سو فی صد مردانہ سماجی ڈھانچے میں خوش نہیں رہ سکتی۔ میں اپنی ماؤں کی سی محبت میں یقین نہیں رکھتی، جہاں مرد کی ہر اچھی بری علامت سے پیار کیا جاتا ہے۔ ایسا پیار جیسا پاتو حائل اپنے مالک سے کرتے ہیں کہ جس وقت بھی آیا اس کے جوتے جھانٹنے شروع کر دیے۔ اس نے جب چاہا گو دہلی لے لیا، اپنے بستر میں سٹلا لیا اور جب چاہا بٹھو کر سے پرے دھنکار کر شکار پر چلا گیا۔ پڑھی لکھی لڑکی کو جیون ساتھ چاہیے نہ پوجا کے لیے ملنا چڑا پاؤں کا جھمبہ، اندازت کے لیے کوئی گھگھوڑا بے سمت مسافر کے سارے افسانوں میں پرکشش نظر آتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے اس طبقے کی منافقت اور جذباتی مسائل کا پر وہ بے یابی سے چاک کیا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کا اسلوب ان کے افسانوں کے مزاج و ماحول کے عین مطابق ہے۔ اس میں دلچسپ روایتی بھی ہے اور زبان کا نکلسالی پن بھی لیکن ان کی عبارت میں انگریزی الفاظ کا استعمال بُری طرح کھٹکتا ہے۔ گذشتہ چار پانچ سال سے اس رجحان نے پھر زور پکڑا ہے کہ ہمارے لکھنے والے انگریزی الفاظ کا کافی تعداد میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ اس عمل سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ہم پھر سے مغرب کی طرف جا رہے ہیں اور اپنے باطن کی گہرائیوں میں ہم نے اپنی تہذیب کو مستور کر کے مغرب کی نگر و تہذیب کو قبول کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ یہ عمل سرسید کے دور میں شروع ہوا تھا اور ہماری تہذیب کی روح اور مزاج کو بدل گیا

تھا۔ اس کے زیر اثر نہ صرف ہماری خواہشیں، ہماری منزلیں، ہمارے خواب، ہمارے اسالیب و بیان اور ہماری اصنافِ ادب بدل گئی تھیں، بلکہ اردو زبان کے ٹچلے کی ساخت بھی بدل گئی تھی۔ آج جو ہم نشر میں ٹچلے لکھتے ہیں وہ میر آسن کی "باغ و بہار" یا شاہ عالم آفتاب کے "تعلیٰ اچانک" سے اس لیے بالکل مختلف ہیں۔ یہ وہ نشر بھی نہیں ہے جو غالب کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ اب اردو ٹچلے پر انگریزی ٹچلے کی ساخت کا گہرا اثر ہے۔

جب تہذیب بدلتی ہے تو اس تہذیب کے اسالیب اور ٹچلے کی ساخت بھی بدل جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ تبدیلی ہمارے شعور کا ایک حصہ بن کر آتی تو اس صورت میں ہماری تخلیقی توانائی بھی باقی رہتی۔ لیکن ہمارے ہاں یہ عمل بے سوچے سمجھے ہو رہا ہے اور ہم رفتہ رفتہ کمزور تخلیقی قوت والی ایک ایسی بے جان سی "چیز" بننے جا رہے ہیں جیسے ہم ایک ایسی کاربن کاپی ہیں جس کو دیکھ کر یہ تو پتا چلتا ہے کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے لیکن کیا لکھا ہوا ہے آتشیں شیشہ لگا کر بھی اس کا پتا نہیں چلتا۔ ہمارا موجودہ ادب اسی صورت حال کا ترجمان ہے اور اسی لیے وہ خود بھی ایک ایسی کاربن کاپی بننا جا رہا ہے جسے پڑھا نہیں جاسکتا۔ پہلا معاصر ادب بحران ہے چہتی، عدم شعور، انتشار کا اظہار تو کر رہا ہے لیکن وہ اپنے قاری کو اپنے معاشرے کو کوئی جھوٹ یا سمیت نہیں دکھا رہا ہے۔ یہی بے سمتی ہمارا اجتماعی اور تہذیبی المیہ ہے اور رضیہ فصیح احمد اسی بے سمتی کے المیے کی ترجمان ہیں۔

مشرف احمد کے افسانے

مشرف احمد ان نئے افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جن کے تخلیقی سفر کو نہ صرف میں نے بغور اور مسلسل دیکھا ہے بلکہ جن کی تحریروں کو میں نے دل چسپی اور توجہ سے پڑھا ہے۔ ویسے بھی نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو میں ہمیشہ دل چسپی سے پڑھتا ہوں اور ان لکھنے والوں کی تحریروں کو تو خاص طور پر مسلسل پڑھتا رہتا ہوں جن میں تخلیقی جوہر کی چمک مجھے نظر آتی ہے۔ اسی لیے ان تمام افسانہ نگاروں کے تخلیقی سفر کا میں عینی شاہد ہوں جو آج کے ادبی منظر کا حصہ بن گئے ہیں یا بننے والے ہیں۔ ادب تخلیق کرنا جان جو کھوں کا کام ہے جو مسلسل رہاض اور محنت کے ساتھ بے لوث عشق کا طالب ہوتا ہے۔ جو لوگ ادب سے پورا عشق نہیں کرتے یا اس عشق کو دیوانگی نہیں بننے دیتے، وہ ذرا دیر کو نور و روشنی محو رہ جاتے ہیں اور پھر شہابِ ثاقب کی طرح کائنات کی گہری تاریکیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ مشرف احمد نے ادب سے نہ صرف عشق کیا ہے بلکہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں سفر بھی کیا ہے اور اب کئی سال کے بعد ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”جب شہر نہیں بولتے“ سامنے آیا ہے۔ وہ جب اپنا مجموعہ میرے لیے لائے تو میں نے فہرست پر نظر ڈال کر کہا کہ ۲۳ افسانوں میں سے چار ایسے ہیں جو میں نے نہیں پڑھے تو انہیں اس لیے چرت نہیں ہوئی کہ ان کو معلوم تھا کہ میں اکثر ان کے افسانوں کے بارے میں بات کرتا رہا ہوں۔ لیکن اب تک یہ باتیں میں صرف ان سے ہی کرتا رہا ہوں اس لیے محزوری ہے کہ آج مشرف احمد کے افسانوں کے بارے میں آپ سے بھی کچھ باتیں کروں۔

مشرف احمد کے افسانوں کو ہم تین موضوعات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ افسانے

جن میں بے بخبری، تنہائی اور بے بسی کا اثر ابھرتا ہے۔ ان موضوعات پر انھوں نے زیادہ تمثیلی انداز میں لکھا ہے۔ ان افسانوں کو آپ علامتی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن علامت نگاری زیادہ پیچیدہ عمل ہے۔ ایک ایسا عمل جس میں ایک پوری نسل ناکام رہی ہے۔ مشرف احمد کے یہاں علامت نگاری کی کوشش تو ملتی ہے مگر وہ اتنے واضح انداز میں یہ کام کرتے ہیں کہ اگر اسے تمثیلی انداز کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

دوسری قسم کے افسانے وہ ہیں جن میں شہری زندگی کو انھوں نے ایک دوسرے انداز سے دیکھا ہے۔ شہر ایک سرد بے حس، شیشی عفریت کا نام ہے جس کے آہنی پنجوں اور دانتوں کے درمیان انسانی خواب، خواہش اور مصوم آرزو میں دن رات پستی رہتی ہیں۔ اسی لیے خود انسان ایک خوف زدہ بے حس، سرد اور مردہ عنصر بن کر رہ گیا ہے۔ اس احساس کو بھی مشرف احمد تمثیلی انداز میں پیش کرتے ہیں اور یہ دونوں موضوعات ان کے یہاں جڑی سچائی اور خوب صورتی سے بیان میں آتے ہیں۔

تیسری قسم ان کے افسانوں کی وہ ہے جن میں وہ پاکستان کے عمومی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر لکھتے ہیں۔ ان کو اگر معاشرتی حقیقت نگاری کی روایت میں دیکھا جائے تو یہ وہ بنیادی روایت ہے جس میں مشرف احمد کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسے افسانوں میں ان کے یہاں تلخی زیادہ جڑ جاتی ہے اور اسلوب میں طنز کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تمثیلی انداز اگر وہ اختیار بھی کرتے ہیں تو وہ دھیمے نہیں ہوتا بلکہ تیز ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کی جدید نسل کو یہ احساس اگر ہے تو وہ بے سبب نہیں ہے۔ یہ وہ تینوں موضوعات ہیں جن سے بلاشبہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے دور کی نسبت قائم ہے اور مشرف احمد کا زیر نظر مجموعہ ان سب کا احاطہ کر کے ہمارے دور کی روح کو کہانیوں میں بیان کر دیتا ہے۔ اس لیے ان کی کہانیاں زندگی سے قریب ہیں اور اسی لیے میں انھیں ”جدید افسانہ نگار“ کہتا ہوں۔

مشرف احمد کے افسانوں کا اسلوب اور انداز تحریر بھی ان کے افسانوں کے موضوعات کی طرح متنوع رکھتا ہے۔ یہ اسلوب کہیں بیانیہ ہو گیا ہے کہیں تمثیلی انداز اختیار کر لیتا ہے۔

اور کہیں خود کلاسی کی سطح پر آجاتا ہے۔ لیکن وہ مبہم کہیں نہیں جوتا۔ واضح اظہار اوصاف اور تحکیلی تصویریں ان کے ہاں اکثر دکھائی دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ وہی پیرائے بیان اختیار کرتے ہیں جو موضوع کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں باخبر افسانہ نگار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے چند ایسے افسانوں میں جن میں ان کا موضوع اور موضوع ایک جان ہو گیا ہے، جب شہر نہیں بولتے، خوف پرندے، درخت، بے نام تحکیلیوں اور محلوں کا نوحہ، موت، ابدار اور شہر، حجر کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اسی انداز سے چلتے رہے تو وہ آگے بڑھ کر اپنا سنہائندہ اسلوب وضع کر لیں گے، جو یقیناً ان کی پہچان بن جائے گا۔

مجھے مشرف احمد سے اردو افسانے کے تعلق سے، بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ مستقبل کے منظر میں مشرف احمد مجھے ایک روشن ستارہ بن کر چمکتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور اسی لیے مجھے ان کے تخلیقی سفر سے گہری دلچسپی ہے۔

زبان زنگتہ فرو ماند و راز من باقیست

بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست (عرفی)

آصف فرخی کے افسانے

آج سے دو سال پہلے آصف فرخی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آتش و فشاں" پچھلے گلاب شائع ہوا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اس کتاب کی تقریب سعید کے برسرِ سرست موقع پر میں نے بھی اختصار کے ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں آصف فرخی کی ایک اور کتاب شائع ہوئی اور ہر من پیسے کے ناول "سدا بہار" کا ترجمہ تھا اور اب ۱۹۸۴ء میں ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ "اسمِ عظم کی تلاش" شائع ہوا ہے اور اسی کے ساتھ دو نئی کتابوں کی نوید دی گئی ہے۔ ایک کہانیوں کا مجموعہ جس کا نام "چیزیں اور لوگ" رکھا گیا ہے اور دوسری کتاب "قطب نما" کے نام سے جس میں لاطینی امریکا کے جدید افسانوی ادب کا انتخاب شائع کیا جائے گا۔ آصف فرخی جس خشوع و خضوع کے ساتھ وظیفہ ادب بکھینچ رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر اردو ادب کو ایسے سدا بہار ادب پاروں سے عالا مال کریں گے کہ آنے والا دور تخلیقی ادب کے حوالے سے آصف فرخی کو مقام ممتاز پر فائز کرے گا۔ کم از کم میں تو یہی سمجھ رہا ہوں اور زیادہ سے زیادہ میری یہ خواہش یہی ہے۔ یہ بات میں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ کہی ہے اور اس لیے کہی ہے کہ تخلیقی ادب کے لیے جس دیوانگی جس لگن اور جس تیاری کی ضرورت ہوتی ہے آصف فرخی دن رات اس میں لگے ہوئے ہیں۔ ادب عشق کا نام ہے اور عشق جزوقتی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر لمحہ آپ کے پورے وجود پر چھا یا رہتا ہے اور تب کہیں جاکر ناہم پل در در زبان نہ آتا ہے۔ یہ بات کہہ کر میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ آصف فرخی نے اپنی منزل کو پایا ہے بلکہ ان کا یہ نیا مجموعہ چڑھ کر یہ بات ادا

واضح ہو گئی کہ وہ شہر بے چراغ سے "تلاش" کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں تاکہ وہ بکا ولی کو پا سکیں۔
 اردو ادب کی نئی نسل میں تلاش بکا ولی کی یہ خواہش مجھے اُس دورِ گزشتہ کی یاد دلاتی ہے
 جب مسلمانوں کی روحِ تخلیق ادب کے اسپوں پر سوار آپ حیات کی تلاش میں نکلی تھی اور
 ساری دنیا کے کونے کونے کو چھان مارا تھا۔ اسی لیے میں جب آج کے لکھنے والوں کی
 تحریروں کو پڑھتا ہوں تو تلاش و جستجو اور تجربہ و شعور کے عمل و فکر کو دیکھ کر مجھے اردو
 ادب کا مستقبل روشن نظر آتا ہے اور اس مستقبل میں آصف فرخی کا چہرہ مجھے صاف
 نظر آتا ہے۔

”اسمِ عظم کی تلاش“ میں آصف فرخی نے بیک وقت کئی کام کیے ہیں جن
 پر میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن نہ تو اب اتنا وقت ہے کہ اس کا طلسم میں آپ پر
 کھولوں اور پھر ہوائی جہاز میں جہاں یہ سطور لکھتے وقت میں ہوں میرے ہاتھیں طرف
 جو صاحب بیٹھے ہیں اخبار پڑھنے کے بہانے میرے لکھے کو لپون پڑھ رہے ہیں جیسا
 یہ ان کا نوشتہ تقدیر ہو۔ بہر حال اختصار کے ساتھ میں اس وقت صرف چند باتیں کہنا
 چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ یہ مجموعہ واقعی مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں آصف فرخی
 نے تکنیک اور اسلوب دونوں کے تجربے کیے ہیں۔ مکاشفہ، عہدِ جدید اور "یزید کی پیاس"
 دونوں افسانے تکنیک کو کامیابی سے برتنے کی مثال ہیں۔ اسلوب میں آصف فرخی نے
 کئی لہجوں اور انداز کو ملا کر ایک رنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اسطور کی
 رمزیت، داستانی انداز، مقدس صحیفوں کے اندازِ بیان اور تصوف کے مزاج کو شامل
 کر کے افسانے کی فضا کو پُر اثر اور طلسماتی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ سوال
 کو جواب اور جواب کو پھر سوال بنا کر پلٹنے کے عمل سے اسلوب میں پُر امراریت کا تاثر پیدا کیا ہے۔
 موضوع کے اعتبار سے یہ کہانیاں ان تاثرات کا اظہار ہیں جو معاشرے کے حوالے سے تخلیقی
 ذہن کے اس گروہ سے پیدا ہوئی ہیں جس سے نئی نسل دوچار ہے۔ یہ عمل خارجِ مین ہیں
 بلکہ باطن کے نہاں خاتوں میں ہو رہا ہے۔ اسی لیے جدید نسل خارج سے پلٹ کر باطن میں

اُترنے کو ترجیح دے رہی ہے۔ اس موضوع پر بات یقینی کی جاسکتی ہے لیکن یہاں تو میں آصف فرخی اور حدیدیل کے افسانہ نگاروں کے تخلیقی عمل کو بیان کر رہا ہوں جو خوف، بے یقینی، باطن میں اٹھنے والے سوال، تخیل کی پرواز اور خواب دیکھنے کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے جہاں آصف فرخی کے الفاظ میں ”افسانہ گزیدہ“ ذہن فسانہ سازی کو درونِ مہنی کا واحد ممکنہ ذریعہ اور کہانی کہنے کو آپ سے اپنے بارے میں باتیں کرنے کا بہترین طریقہ سمجھتا ہے..... جس میں حیرتیں اور لوگ حقیقت سے زیادہ اصلی معلوم ہوں۔“ غیر مرئی بھی سامنے آجائے جس کے انجام میں ساری گتھیاں سلجھ جائیں۔ گلفام کو سبزی اور لکڑ ہارے کو جنگل میں کھوئے ہوئے بچے مل جائیں۔“ (ص ۳) ان الفاظ میں آصف فرخی کا ماضی حال اور مستقبل سب موجود ہیں۔ کافکا کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ عام آدمی کو، جو کیڑا بن گیا ہے کیسے دوبارہ انسان بنائے۔ آصف فرخی کا بھی یہی مسئلہ ہے کہ وہ آدمی کو جو بددعا کے اثر سے بد صورت میسٹک بن گیا ہے دوبارہ ہانکا شہزادہ کیسے بنائیں۔ ”کیسے بنائیں“ کے لیے اسم اعظم کی تلاش ہی آصف فرخی کے افسانوں کے اس مجموعے کا بنیادی مسئلہ ہے جس میں قدیم و جدید اثرات اور حکایات و اسطوریات کو یہ معلوم کرنے کے لیے ایک نئے تخلیقی سفر پر کھلے ہیں کہ

”اگر کل صبح تک کہانی کے بادشاہ کو شہزادہ کے قتل سے باز رکھا

تو اس سے پوچھوں گا کہ بار بار بدلتے نمیند اور خواب کے اس سلسلے

میں میں کہاں ہوں؟“ (ص ۵۸)

”کیسے بنائیں“ اور ”کہاں ہوں“ کی تلاش میں، جیسا کہ میں نے ابھی

کہا تھا آصف فرخی نے مختلف اساطیر سے قدیم مذہبی و نیم مذہبی حکایات و داستانِ روایات سے، پیمین میں کھیلے جانے والے کھیلوں کے پلوں سے، مقدس صحیفوں سے تصوف کے کراماتی قصوں اور فلسفیانہ تحریروں سے لہجہ و اہلوب بھی لیا ہے اور نفسِ مضمون بھی اور ان سب کی مدد سے شہری طور پر دو فنی اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے دل کشی، جاذبیت اور پراسراریت پیدا ہو سکے۔ یہ سب عناصر بھی عملِ امتزاج سے گذر رہے ہیں۔ اس

مجموعے میں نصف فرنی کا فکر و فن "آتش فشاں پر کھلے گلاب" سے یقیناً لگے بڑھا ہے۔ ہم انکم کی تلاش میں ایک جہت ہے اور میرا خیال ہے کہ لگے مجموعے میں جو چیزیں اور لوگب کے نام سے شائع ہو گا وہ علامت نگاری کے حصار سے بھی باہر نکلیں گے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ "برون بینی بیرون بینی کے ساتھ مل کرنے افسانے کو ایک نئی جہت دے سکے گی۔ یہی کام پیغیبروں نے کیا ہے اور یہی کام نئی نسل کے تخلیق کاروں کو بھی کرنا چاہیے۔

(۳۳ نومبر ۱۹۸۴ء)

نذر الحسن، صدیقی کے افسانے

نذر الحسن صدیقی مجھے نین دھونے کی بنا پر عزیز ہیں۔ ایک یہ کہ وہ میرے بزرگ دوست ابو الفضل صدیقی صاحب کے بھتیجے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ خوش اخلاق اور نیک دل انسان ہیں اور تیسری اور اصل بات یہ ہے کہ وہ نئے افسانہ نگاروں میں اپنے انداز اور شعور و احساس کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ پچھلے دس پندرہ سال سے ان کے افسانے "نیلا ورت" میں شائع ہو رہے ہیں بلکہ ان کی افسانہ نگاری نے نیا دور کی گود ہی میں شعور کی آنکھ کھولی ہے اور یہ ان کا پہلا مجموعہ (سر دلہو کا فوج) ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ افسانہ ویسے تو ادب کی سب سے مقبول صنف ہے لیکن افسانے کی کتاب کم مقبول ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ افسانے کے قارئین جب کتابی شکل میں ان افسانوں کو دیکھتے ہیں جو وہ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں تو وہ کوئی ایسی کتاب خرید لیتے ہیں جو انھوں نے نہیں پڑھی ہے۔ ان حالات میں میرا خیال ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کو اپنے مجموعے میں کم سے کم آدھے افسانے ایسے شامل کرنے چاہئیں جو پہلے نہیں پڑھے ہوں۔

نذر الحسن صدیقی نے گاؤں دیہات کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ وہ خود ایک زمیندار گھرانے کے فرد ہیں۔ پاکستان بنا تو وہ اپنے والدین کے ساتھ یہاں آ گئے اور اس کے بعد ان کی ساری عمر اسی شہر کراچی میں بسر ہوئی، کراچی جو صنعتی و تجارتی مرکز ہونے کے علاوہ پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جہاں مختلف علاقوں کے لوگ آباد ہیں۔ جہاں ہر بڑے شہر کی طرح وہ سارے مسائل موجود ہیں جن کا تعلق جدید شہری زندگی سے ہے۔ جہاں تضاد کا عفریت اور بدلتی دنیا کے اثرات سماجی زندگی کو لمحوہ بلمحوہ بدل رہے ہیں، جہاں

زندگی پے چیدہ اور زندگی سے پیدا ہونے والے تجربے اس سے بھی زیادہ پے چیدہ ہیں اور اسی وجہ سے "جدید" افسانہ نگار کا تخلیقی عمل بھی پے چیدہ ہو گیا ہے۔ یہ وہ حجب ہے جس سے ابوالفضل صدیقی کی نسل کو واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جدید شہر ایک زندہ حقیقت ہے اور نذر الحسن صدیقی جدید شہر کی پے چیدہ زندگی سے پیدا ہونے والی سچی تہذیب، ذہنی اور مادی صورت حال کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ جدید شہر جہاں اخلاقی قدروں میں سیلاب آگیا ہے، جہاں دولت نے زندگی کی اہم اور بلند قدر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ جہاں دولت عزت بھی ہے اور خدا بھی، نظام زندگی میں جہاں دولت مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو مادی قدریں سب قدروں پر غالب آجاتی ہیں اور تضاد نمایاں ہو کر زندگی کو زخمی و بیمار کر دیتے ہیں۔ انفرادی و اجتماعی سطح پر اخلاقی اقدار شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ نذر الحسن صدیقی نے جدید شہر کی اسی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جہاں فرد کا المیہ اجتماعی المیہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی لیے میں نذر الحسن صدیقی کو "جدید" افسانہ نگار کہتا ہوں۔ یہاں میں نے لفظ "جدید" نئے یا نوجوان کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس افسانہ نگار کے لیے استعمال کیا ہے جو جدید صنعتی شہر کی ہر درجہ زندگی سے پیدا ہونے والے تجربات کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتا ہے۔ وہ جدید شہر جہاں احساسِ مرگ اور احساسِ زیست زندگی کے تانے بانے میں بُنے ہوئے ہیں۔ یہی زندگی مجھے نذر الحسن صدیقی کے افسانوں میں ملتی ہے۔

جزئیات نگاری اسی لیے ان کے ہاں ایک فن کا درجہ رکھتی ہے جس سے وہ اپنی کہانیوں میں ایسے رنگ بھرتے ہیں کہ جدید زندگی کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ کرداروں کو وہ اس طرح اُبھارتے ہیں کہ کردار بنیادی طور پر "ٹائپ" ہوتے ہوئے بھی کہانیوں کے آئینے میں چلتے پھرتے، جیسے جاگتے نظر آتے ہیں خواہ وہ منشی جی (سر دلہو کا لوز) ہوں یا کرنل واحدی (ایک دو تین) یا جبار بھائی پھالیہ والا (روشن اندھیرا) ہوں۔ تکنیکی اعتبار سے بھی ان کے ہاں ایک تنوع ہے جو دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں خال خال نظر آتا ہے۔ "سر دلہو کا لوز" میں "وقت" کہانی سنانا ہے۔ کہانی ماضی و حال میں ساتھ

ساتھ ملتی ہے۔ ”ایک دو تین“ میں معاشرہ کہانی بیان کرتا ہے اور تین الگ الگ کہانیوں کو ایک رشتے میں پرو دیتا ہے۔

نذر الحسن صدیقی ایک باشعور افسانہ نگار ہیں جنہیں یہ معلوم ہے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں، کیوں لکھ رہے ہیں اور کیسے لکھ رہے ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں ٹیکنیک کا تنوع بھی ہے اور اسلوب کا رچاؤ بھی۔ آج جب علامتی افسانے نے کہانی کا دائرہ اثر محدود کر دیا ہے اور اردو افسانے کو صرف ایک رنگ میں رنگ کرنا مقبول بنا دیا ہے نذر الحسن صدیقی کی کہانیاں مجلسا دینے والی تو ذرہ فضا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے احساس سے پڑھنے والوں کو تازہ دم کر دیتی ہیں۔ ان کے افسانے حسن سکری صاحب کے افسانوں کی طرح دھیمے دھیمے چلتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ جدید افسانہ نگار کے اس مجبوعے کو ضرور پڑھیں تاکہ ”جدید افسانے“ کے ہلے موسم کا پتا چل سکے۔

سر سید احمد خان

سر سید احمد خان جو ۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے اور جنھوں نے ۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی، جنوبی ایشیا کے ان عظیم رہنماؤں میں سے تھے جن کے افکار اور جن کی قوت عمل نے یہاں کے مسلمانوں کی زندگی پر گہرے اور ان میں انقلابی شہت کئے۔ ایسے نقوش جن سے انسان کی سوچ بدل جاتی ہے اور جن سے معاشرہ تبدیل ہو کر نئی اور شاداب منزلوں کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اٹھارویں صدی پر صغیر کے مسلمانوں کے زوال کی صدی ہے۔ اس صدی میں تاج محل والی مغلیہ تہذیب انتشار کا شکار ہو کر کم زور پڑ جاتی ہے اور سات سمندر پار سے آنے والی انگریز قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ انگریزوں نے یہ اقتدار چل کر مسلمانوں سے چھینا تھا اس لیے وہ ان سے خاص طور پر اس لیے خائف تھے کہ کہیں دوبارہ مسلمان یہ حکومت ان سے واپس نہ لے لیں۔ اس کے لیے انگریزوں نے مسلمانوں کو معاشی و سماجی اعتبار سے کم زور کرنے کے لیے ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ وہ رفتہ رفتہ کم زور و بے اثر ہو جائیں تاکہ وہ کچھ بھی سر نہ اٹھا سکیں۔ اسی حکمت عملی کے پیش نظر انھوں نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں کسے بڑھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی نصف صدی میں گزری تھی کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے کچھ اتھرتا کی سطح پر کم زور اور معاشی لحاظ سے ٹوٹ گئے۔ ابھی نام کی بادشاہی قائم تھی اور بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے وظیفہ خواہ کی حیثیت سے قلعہ معلیٰ کی چھار دیواری میں مقید تھے۔ ۱۸۵۷ء جسے انگریزوں نے غدار اور مسلمانوں نے جنگ آزادی کا نام دیا، پر صغیر کی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ اس سال بہادر شاہ ظفر معزول کر کے رنگون بھیج دئے گئے اور اب نام

کی بادشاہی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس وقت مسلمان قوم ایک شکست خوردہ قوم کی نفسیات کی حامل تھی۔ اقتدار چھین جانے کا غم، پرانی تہذیب کی عمارت گرنے کا دکھ اور نئے حکمران انگریزوں کے رویے نے انہیں نئی تہذیبوں کو قبول کرنے سے دُور کر دیا۔ وہ اب بھی اپنے ماضی کی طرف دیکھ رہے تھے اور انہیں اقتدار سے وابستہ رہنا چاہتے تھے جو اسلاف سے انہیں ورثے میں ملی تھیں۔ انگریزی تعلیم، جو وقت کی ضرورت تھی، اسے کفر کے مترادف قرار دیا گیا اور انگریزی ملازمت ایک اخلاقی مسئلہ بن گئی۔ اس طرح ایک عرصے تک مسلمان قوم ان معاشرتی اور تعلیمی تقاضوں سے محروم رہی جن سے برصغیر کی دوسری قومیں فائدہ اٹھا رہی تھیں۔

ایسے میں مسلمان مفکروں کے سامنے یہ بنیادی مسئلہ تھا کہ کس طرح مسلمانوں میں بیداری کی روح بھونکی جائے تاکہ وہ اپنے اندر کے خول سے باہر نکل کر دوسری جدید کے تقاضوں سے آگاہ ہو سکیں۔ ۱۸۵۷ء میں سر سید احمد خان کی عمر چالیس برس کی تھی۔ یہ اس دور میں جدید نسل کے نمائندہ تھے۔ سر سید نے اس مسئلہ پر غور کیا، ساری صورت حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی ساری سیاسی، معاشرتی اور معاشی خرابیوں کا واحد حل یہ ہے کہ انہیں نریور علم سے آراستہ کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو نئے خیالات کی طرف مائل کیا جائے اور انہیں ترغیب دلائی جائے کہ وہ بدلے ہوئے منظر میں نئی تہذیب کے صحت مند عناصر کو اپنے اندر جذب کریں۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس کا تعلق مسلمانوں کی سوچ اور ان کے انداز فکر کو بدلنے سے تھا۔ سر سید احمد خان کا خیال تھا کہ مسلمان نئی تعلیم ہی سے اپنے اوہام اور قصبات سے نکل کر عہد جدید کی نئی قوتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ۱۸۵۹ء میں انہوں نے مراو آباد میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۲ء میں غازی پور میں ایک اور اسکول قائم کیا اور اسی سال سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید علوم کی کتابیں اردو زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ متعدد کتابوں کے اردو ترجمے اس سوسائٹی سے شائع کئے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے تعلیمی پروگرام کو آخری شکل دینے کے لیے سر سید نے انگلستان کا سفر کیا تاکہ وہ وہاں کے تعلیمی ادارے دیکھ سکیں اور انہیں خطوط پر برصغیر میں مسلمانوں

کے تعلیمی ادارے قائم کر سکیں۔ برصغیر واپس آکر انھوں نے ”تہذیب الاخلاق“ کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کا مقصد نئے خیالات کی ترویج اور مسلمانوں کو توہم پرستی اور حامد خیالات کے حصار سے باہر نکالنا تھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مسلمانان ہند کی تعلیم کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے وہ سرکاری مقرر کئے گئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق طے پایا کہ مسلمان اپنی تعلیم کا خود انتظام کریں۔ اس رپورٹ میں ایک کالج کا خاکہ بھی پیش کیا گیا۔ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۵ء تک کالج کے قیام کی ضروری تیاریاں کی گئیں اور ۲۳ مئی ۱۸۷۵ء کو مسلم اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں کھول دیا گیا۔ اس کالج کی تعلیم میں سرسید نے جدید اور جدید تعلیم دونوں کو ایک نئے نظام میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ سرسید چاہتے تھے کہ مشرق اور مغرب کی تعلیم مل کر ایک نئی وحدت، ایک نئی اکائی بن جائے۔ کالج میں جدید تعلیم اور جدید مضامین کے ساتھ مذہبی تعلیم کو بھی اہمیت دی گئی۔

سرسید کا نقطہ نظر ان کے ایک جملے سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا

کہ :

”علی گڑھ مدرسہ کے قیام کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن

دوسرے پر سائنس اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج“

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سرسید مسلمانوں کو ہیداکر کے جہاں جدید علوم اور سائنس سے بہرہ مند کرنا چاہتے تھے وہاں وہ انھیں اپنے مذہب و عقائد سے بھی دور کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دل سے چاہتے تھے کہ مسلمان مسلمان رہیں اور جدید روشنی سے راہ حیات میں منزل بقعد و کسب پہنچ جائیں۔ وہ بدلے ہوئے زمانے کے تجویز پہنچاتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے فکری انجماد کو دور کرنا چاہتے تھے اور انھیں علمی، معاشرتی، سیاسی و ذہنی سطح پر دنیا کی وادی ترقی یافتہ قوموں کے برابر لانا چاہتے تھے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان رفتہ رفتہ نئی تعلیم کی طرف گئے اور جدید دور میں داخل ہو گئے۔ یہ سرسید کی فکر ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان آج جدید علوم سے بہرہ مند ہیں اور ان مسائل کے حال سے نکل آئے ہیں جس میں سرسید کے دور کے مسلمان گرفتار تھے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید نے تین سطحوں پر کام کیا: ایک یہ کہ نئی تعلیم کی طرف رجوع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ احساسِ ذلت سے نکالا جائے اور ان میں غنیمتِ رفتہ کا احساس پیدا کیا جائے۔ اس کام کے لیے انھوں نے خود بھی "تہذیب الاخلاق" میں مضامین لکھے اور شبلی نعمانی کو خصوصیت کے ساتھ اس کام پر لگایا۔ شبلی کی بیشتر تصانیف اور مضامین اسی طرزِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر انھوں نے وہ سرِ کام یہ کیا کہ مسلمانوں کو فرسودہ رسم و رواج سے نکلنے اور ان کے ذہنوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے اجتہاد پر زور دیا۔ تیسرا کام یہ کیا کہ افادہ و عقل کے تصورات کو اپنے مضامین میں ایسی اہمیت دی کہ وہ عام طور پر مقبول ہونے لگے۔ ان فکری عناصر نے مسلمانوں کے بند ذہنوں کے درِ بچوں کو کھول دیا اور تازہ خیالات کی ہوا سے وہ تازہ دم ہونے لگے۔ سرسید نے بتایا کہ زندگی ایک ایسا راستہ ہے جس پر آگے چلنا ہوتا ہے اور زندگی آگے بڑھنے اور آگے چلنے کا عمل ہے۔

آج یہ باتیں عام اور معمولی نظر آتی ہیں لیکن انیسویں صدی کا تصور کیجیے کہ ان خیالات کو عام کرنے کے لیے سرسید کو کتنی جدوجہد، کتنی کوشش و کاوش، کتنی قوت اور کتنے اخلاص اور کتنی گہری فکر و نظر کی ضرورت پڑی ہوگی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید نے صرف تعلیمی سطح پر کام نہیں کیا بلکہ ذہنوں کو بدلنے کے لیے ان تمام شعبوں میں کام کیا جن سے مسلمانوں کے فکر و نظر بدل سکیں۔ ان کا یہ دائرہ کار مذہب سے لے کر علمی و ادبی خدمات تک، سیاسی سرگرمیوں سے لے کر سماجی خدمات تک پھیلا ہوا ہے۔ سرسید احمد کی سرگرمیوں میں آپ کو یکسانیت کے ساتھ فکر و عمل کا اتحاد نظر آئے گا۔ سرسید نے ذاتی طور پر زندگی میں بیک وقت دو سطحوں پر کام کیا۔ ایک سطح غور و فکر اور حکمت عملی وضع کرنا تھی اور دوسری سطح اس فکر اور حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کی تھی۔ انھوں نے فکر اور عمل کو ملا کر ایک کر دیا اور اسی لیے وہ زندگی میں اس کامیابی سے ہم کنار ہو سکے جس کی کج وہ خود پہچان میں۔

آج سرسید احمد خان مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ کی علامت ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیمی انقلاب ان کی پہچان ہے اور اس تعلیمی انقلاب کے لیے انھوں نے قلم اور زبان دونوں کو استعمال کیا۔ قلم سے انھوں نے مختلف مسائل و افکار پر جو کچھ لکھا وہ سولہ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور زبان جو کچھ کہا اس کے اثرات آج ہمیں نئے ذہن کی صورت میں ورثے میں ملے ہیں۔ سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء سے لے کر اب تک تقریباً ۸۸ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور ان کی فکر کا دور یا آج بھی بھراؤنا بہہ رہا ہے اور ان کا بتایا ہوا راستہ آج بھی نشانِ منزل ہے۔ سرسید نے انگریزی تعلیم کو ہماری تعلیم کا حصہ ضرور بنایا ہے لیکن وہ اس تعلیم کو اردو زبان کے ذریعے دینے پر ہمیشہ زور دیتے رہے اور اس کو اصل ترقی کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ اس سلسلے میں سرسید کے اپنے الفاظ میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ :

”انگلستان کی تہذیبی ترقی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تمام ادبی اور سائنسی علوم ملک کی اپنی زبان میں ہیں۔ پس وہ جو ہندوستان کی حالت کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کی خواہش رکھتے ہیں یاد رکھیں کہ اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تمام جدید سائنسی اور ادبی علوم کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ الفاظ میں موٹے حروف میں ہمالیہ پر لکھ دوں تاکہ آنے والی نسلیں اس کو یاد رکھیں۔“

آج سرسید ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کے یہ الفاظ آج بھی ہماری منزل کا پتہ دے رہے ہیں۔ ہمیں انگریزی کو ضرور سیکھنا چاہیے۔ اور اس پر پوری قدرت حاصل کرنی چاہیے لیکن اسے ذریعہ تعلیم نہیں بنانا چاہیے، ورنہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں کہیں پوری طرح پروان نہیں چڑھ سکیں گی اور ہم ہمیشہ صرف نقل اور پیروی کے راستے پر چلتے رہیں گے اور اسی طرح دوسری قوموں کی

دیکھتے اور اُن کے محتاج رہیں گے۔ آج پاکستان کے لیے سرسید کا یہی پیغام ہے اور یہی ہماری منزل اور یہی ہمارا راستہ ہے۔ جب تک ہم اس راستے پر نہیں چلیں گے اسی طرح بے شناخت، منتشر اور گمراہ رہیں گے۔

۱۰ فروری ۱۹۸۷ء

شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد عظیم مسلمانوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اب وہ حکمران نہیں رہے۔ مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہو چکا ہے اور انگریز اب اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہیں۔ سلطنت چوں کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی اور ۱۸۵۷ء میں ان کا مقابلہ مسلمانوں سے تھا اس لیے جتنا ظلم و جبر ممکن تھا انگریزوں نے مسلمانوں پر توڑا۔ انگریزوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کو ان تمام اساسی عہدوں اور کلیدی جگہوں سے ہٹا دے تاکہ آئندہ کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ اس عالم میں مسلمانوں میں شدید احساس بے چارگی پیدا ہوا۔ ایک طرف ان کا شاندار ماضی تھا پھر عظمت مغلیہ سلطنت کے نشانات سارے عظیم میں پھیلے ہوئے تھے اور دوسری طرف اب وہ معاشی سطح پر کنگال اور نفسیاتی سطح پر شدید احساس محرومی کا شکار تھے۔ یاد رہے کہ ۱۸۵۸ء میں سرسید احمد خان کی عمر ۲۰ سال کی تھی اور شبلی نعمانی اسی سال پیدا ہوئے تھے۔ ان حالات کا جائزہ لے کر سرسید احمد خان نے محسوس کیا کہ اب مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ جدید علوم سیکھیں تاکہ پلے ہوئے منظر میں خود کو پھر سے قائم کر سکیں۔ اگر اس دور میں اور اس موقع پر سرسید احمد خان یہ نہ کرتے تو مسلمانوں کی حالت کے سدھ کرنے کا امکان بھی باقی نہ رہتا۔ سرسید ایک عظیم رہنما تھے۔ عظیم رہنما کہیں اکیلا نہیں چلتا بلکہ اپنے ساتھ ہم خیال لوگوں کا ایک قافلہ لے کر چلتا ہے جس میں جوان اور بوڑھے، نئے اور پرانے اور مختلف انبیال لوگ شامل ہوتے ہیں۔ جب ۱۸۷۵ء میں سرسید نے علی گڑھ میں محمدن ایٹھنگلو اور نیشنل کالج قائم کیا تو یہ دراصل عظیم مسلمانوں کی نئی

زندگی کا پہلا مرکز تھا۔ ۱۸۸۲ء میں شبلی نعمانی کی عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ وہ علی گڑھ گئے، سرسید سے ملے اور ان کے خیالات سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کے گرویدہ ہو گئے اور اسی سال کالج سے وابستہ ہو گئے اور ۱۸۹۹ء میں جب سرسید کا انتقال ہوا شبلی کالج سے الگ ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ واپس آ گئے۔

شبلی سرسید کے خیالات سے حد درجہ متاثر تھے۔ سرسید کی طرح وہ بھی مسلمانوں کی ترقی، عروج کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو ذہنی پستی سے نکال کر نئے راستے پر ڈالنا ضروری ہے۔ سرسید کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زندگی ایک راستہ ہے جس پر ہمیشہ آگے چلنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خود سرسید نے جو پروگرام بنایا تھا اس کے چار پہلو تھے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کو موجودہ ذلت پسندی کا احساس دلایا جائے۔ دوسرے یہ کہ انہیں اپنی عظمت رفتہ سے واقف کرایا جائے تاکہ ان میں احساس عظمت پیدا ہو کر اعتماد بحال ہو سکے۔ تیسرے انہیں جدید علوم اور سائنس کی تعلیم کی طرف رجوع کیا جائے۔ چوتھے یہ کہ ان کے دل و دماغ میں یہ بات ڈالی جائے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو قیامت تک کے لیے آیا ہے۔ یہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے والا مذہب ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں اجتہاد کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا جائے تاکہ اسلام جو بظاہر ہندو مذہب کی طرح رسوم و رواج کا شکار ہو گیا تھا پھر سے نئی توانائیوں کو پیدا کر سکے۔ اسی طرح مسلمانوں کے ہندو ذہن کو کھول کر نئے خیالات کو اس میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ شبلی نعمانی سرسید کی اس فکر اور سوچ سے پوری طرح متفق تھے۔ مسلمانوں کو اپنی وجود پسندی اور ذلت کا احساس دلانے کا کام مولانا الطاف حسین حالی نے کیا اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے واقعات و تاریخ سے روشناس کرانے، ان میں نیا اعتماد بحال کرنے اور ان میں جذبہ ترقی کو پیدا کرنے کا کام مولانا شبلی نعمانی نے کیا۔ جب شبلی سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ سے چلے آئے تو اس وقت تک مسلمان اس سمت میں لمبا راستہ طے کر چکے تھے۔ شبلی نعمانی نے نئی نسل کو دیکھ کر جو نئی تعلیم سے بہرہ مند ہو کر سامنے آئی تھی کہہا کہ علی گڑھ کی تعلیم نے کئی پتھروں کو ہموار کیا ہے لیکن شوقِ علم بیدار نہیں آیا۔ شبلی نعمانی کا خیال تھا کہ میں انگریزی تعلیم و تربیت

سے اسی قدر لینا چاہیے جس قدر وہ ہمارے لیے مفید ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید مسلمانوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں نے جو عباسیہ کے دور میں یونانی علوم کو اس حد تک قبول کیا جس حد تک وہ ان کے لیے مفید تھے اور باقی حصے کو مسلمان مفکروں نے دلائل کے ساتھ رد کر دیا۔ شبلی کے نزدیک کروڑوں نئی نسل کی ذہنی تربیت اور اسلام پر ان کے عقیدے کو اسی وقت برقرار رکھا جاسکتا ہے جب وہ اسلام کی تاریخ اس کی عظمت اور اس کی بنیادی فکر سے منصف واقف ہوں بلکہ اس پر پورا اعتماد بھی رکھتے ہوں۔ یہ ایک مثبت نقطہ نظر تھا اور شبلی نے عظیم کسے مسلمانوں کی ترقی و بیداری کے لیے انہی خطوط پر کلام کیا۔ اسی لیے شبلی نے اپنی تحریروں سے پُرانے علوم سے دل چسپی کو دوبارہ پیدا کیا۔ انھوں نے علم الکلام کو دوبارہ رواج دیا۔ شبلی نعمانی مغرب کی اندھی پیروی کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی درایات اپنے دین سے وابستہ رہتے ہوئے جدید دور میں داخل ہوں۔ اسی صورت میں وہ صحیح معنوں میں ترقی کر سکتے ہیں۔ صرف مغرب کی پیروی اور انگریزوں کی تہ نگہیں بند کر کے تقلید سے رہ اکھیں گے۔ یہ وہ نقطہ نظر تھا جو سرسید کی تعلیمی و فکری تحریک کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ تھا اور مسلمانوں کو ترقی کے راستے پر چلانے کا صحیح طریقہ تھا۔

شبلی نعمانی کی تصانیف پر نظر ڈالیں تو ہم ان میں غیر معمولی تنوع نظر آئے گا۔ ایک طرف انھوں نے المامون، مہمۃ النعمان، الفاروق اور سیرۃ النبی جیسی تصانیف لکھ کر مسلمانوں کے عظیم شاندار ماضی کی نئی تشکیل کی۔ اسی کے ساتھ فلسفہ و کلام کے ذیل میں علم الکلام، الکلام، الفرائی، سوانح مولانا روم جیسی تصانیف لکھ کر فکر و فلسفہ کلام کو دوبارہ زندہ کیا۔ ادبیات میں مولانا روم، ارباب و دبیر اور شعر العجم کے علاوہ ان کے وہ مقالات ہیں جو تعلیمی، تاریخی، ادبی، تنقیدی و غیرہ موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ تاریخ کے ذیل میں تاریخی مضامین اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ سب تصانیف اردو زبان میں ہیں اور اپنے اسلوب اور قوت بیان کی وجہ سے ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے عربی میں بھی تصانیف لکھیں اور فارسی وار ورو میں شاعری بھی کی۔

شبلی ایک عظیم مصنف ایک منفرد مفکر، ممتاز عالم اور پر جوش علمی انسان تھے۔ یہ سب چیزیں ایک ذلت میں کبھی کبھی جمع ہوتی ہیں۔ شبلی نعمانی وہ عظیم انسان تھے جنہوں نے نئی فکر سے مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا، جنہوں نے اپنے عمل سے اپنی فکر کو عام و مقبول بنایا۔ اپنی تحریروں سے اپنے مضامین سے اپنی نظموں سے اپنی تقریروں سے اپنی تصانیف سے مسلمان کے اندر ایک نئی روشنی پیدا کی۔ ان کے تین مردہ میں ایک نئی روح بھڑکی۔ تصنیف کی ایک عظیم روایت قائم کی جو آج بھی زندہ ہے۔ اپنی تصانیف کو اردو زبان میں لکھ کر خود اردو زبان میں نئی قوت و توانا پیدا کی۔ سرسید احمد خان کی طرح علامہ شبلی نعمانی کا نقطہ نظر بھی یہی تھا کہ اردو پر عظیم کی وہ واحد زبان ہے جس کے ذریعے مسلمانوں میں یکجہتی و وحدت پیدا کی جاسکے۔ شبلی نعمانی نے اس دور میں وہ کام کیا جو ان کے علاوہ کسی اور نے نہیں کیا۔ انہوں نے قدیم عوم سے مسلمانوں کی دوبارہ دل چسپی پیدا کی۔ مسلمانوں کی تاریخ کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق دوبارہ لکھا تاکہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اس تاریخ کو دوبارہ دل چسپی سے چٹھ سکیں۔ اس کام سے لیے انہوں نے ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی تاکہ اس کو تحریک اور ایک ادارے کی شکل دی جاسکے۔ شبلی کا قائم کیا ہوا دارالمصنفین آج بھی یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ شبلی کی فکر اور ان کی تحریروں سے مغرب کی اندھی پیروی نئی نسلوں کے لیے قابل قبول نہیں رہی۔ شبلی نعمانی نے سرسید تحریک کو اپنے رد عمل سے ایک نئی وسعت دے کر مسلمانوں کی رفتار ترقی کو تیز اور نئی فکر کو مسلمانوں کی اجتماعی فکر میں شامل کر دیا۔ فکر کا یہ وہی راستہ ہے جسے نئی نسل کے مفکروں نے قبول کیا۔ ۱۹۱۳ء میں شبلی نعمانی کے وفات کے وقت علامہ اقبال کی عمر ۳۲ سال تھی۔ شبلی نعمانی کی فکر اور روایت تصنیف و تالیف آج بھی مسلمانوں کی فکر میں جاری و ساری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی فکر برصغیر کی ملت اسلامیہ کے خون میں آج بھی گردش کر رہی ہے۔

اکبر الہ آبادی

میں اس وقت اختصار کے ساتھ اکبر الہ آبادی کے تعلق سے صرف چند باتیں کہنا چاہتا ہوں تاکہ اکبر کا زاویہ نظر آپ کے سامنے واضح ہو سکے۔

اکبر الہ آبادی کے بارے میں عام طور پر یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ وہ مزاح نگار ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن صرف ایک حد تک۔ مزاح دراصل اکبر کے لیے اپنی بات کو عوام و خواص تک پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے تاکہ لوگ ان کی بات کو دل پہنچے سے سن کر لطفت اندوز ہوں اور اس کا اثر قبول کریں۔ اکبر کے مزاح میں ایک جہت ایک زاویہ نظر ہے جو ہمیں کسی دوسرے شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ اس جہت کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کے غلبے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ تہذیب جس نے ایک ہزار سال کے سفر حیات میں ایک صورت بنائی تھی وہ ٹوٹ رہی ہے اور اب وہ دن دور نہیں جب یہ تہذیب نئی مغربی تہذیب کے سامنے شکست کھا جائے گی اور اس شکست سے وہ الیہ پیدا ہو گا کہ مسلمان اپنے تہذیبی نظام سے ہٹ کر مذہب مغلوب ہو جائیں گے بلکہ اپنی حقیقی تخلیقی قوت بھی گنوا دیں گے۔ وہ فکری سطح پر عقلمند اور سپرد کار تو ہوں گے لیکن راہبر نہیں بن سکیں گے۔ جب انھوں نے اس بات کو محسوس کر کے تہذیب مغرب کی مخالفت کی تو انھیں رجعت پسند کہا گیا۔ دراصل برصغیر اور اکبر ہماری قومی زندگی کے دو الگ الگ دھارے ہیں۔ برصغیر مغربی تہذیب کے نمائندہ ہیں اور اکبر اپنی اس تہذیب کے ترجمان ہیں جو انگریزی اثرات کے ساتھ کم زور ہو کر بے حیوانیت کا شکار ہو رہی تھی۔ برصغیر کا کام اپنے دور میں مشکل ہوتے ہوئے بھی آسان تھا اور اکبر کا کام آسان ہوتے ہوئے بھی مشکل تھا۔ اکبر نے اپنے دور میں جو کچھ کہا تھا آج وہ حقیقت بن کر

سامنے آگیا ہے۔ ہم تہذیب مغرب کے پرستار بن کر اب صرف اس راستے پر چل رہے ہیں جس راستے پر مغرب ہمیں چلا رہا ہے۔ اب علم وہ ہے جو مغرب سے آتا ہے۔ لیکن باتوں و انکشافات وہ ہیں جو مغرب میں ہوتے ہیں۔ آج اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیے تو آپ واضح طور پر دیکھیں گے کہ اب جو کچھ ہمارے گھروں میں، دفاتروں میں، زمین و آسمان میں، ہر طرف نظر آتا ہے وہ صرف مغرب کی دین ہے اور وہیں سے آیا ہے۔ ہماری تخلیقی قوتیں اتنی کم زور ہو گئی ہیں کہ ہم اب کچھ کرنے کی شاید صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ بات بتائی تھی —

اُس وقت وہ مبالغہ نظر آتی تھی اور کچھ وہ حقیقت بن کر ہمیں لگی کہ چوں سے لے کر نہ صرف کالیوں، یونورسٹیوں اور سارے نظام زندگی میں بلکہ ہماری روح کے نہاں خانوں میں بھی رواں دواں نظر آتی ہے۔ اس بات کو اکبر کی نظر دور رس نے دیکھ لیا تھا اور ایک پیغمبر کی طرح اپنی شاعری کے ذریعے ہم تک پہنچا بھی دیا تھا۔ ادب کا کام صرف دکھانا ہوتا ہے اور اکبر نے یہی ہمیں دکھا دیا۔ آج کے دور میں ادب نے اپنی اہمیت اس لیے گنوا دی ہے کہ ہم کرامت میں افادیت اور فائدے کو دیکھتے ہیں۔ اسی لیے کپڑوں پر استری کرنے والی مشین ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ہماری قمیض کی سلوٹس دور کر کے ہمیں فوری فائدہ پہنچاتی ہے۔ بے چارہ اور بظاہر بے کریم کام نہیں کر سکتا لیکن دراصل ادب ہماری روح کی سلوٹس ضرور دور کرتا ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ روح ہمیں نظر نہیں آتی۔ جب روح نظر نہیں آتی تو اس کی سلوٹس کہاں نظر آئیں گی؟ اکبر نے شاعری کے ذریعے اپنے دور میں ہماری روح کی سلوٹس دور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے انھیں مزاح نگار کہہ کر ڈرا دیا کہ ان کی شاعری سے کٹھن تو لیا لیکن بحیثیت مجموعی انھیں رد کر دیا اور اسی رد کرنے کی وجہ سے سو سال کے عرصے میں ہماری پوری تہذیب تخلیقی سطح پر بانجھ ہو کر رہ گئی۔ اب ہماری تہذیب نہ ستر اور مفکر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، نہ علمی و ادبی سطح پر تخلیقی کارنامے انجام دینے کی اہلیت رکھتی ہے اور نہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں کچھ کر دکھانے کی قوت رکھتی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے ہمیں یہی بتایا تھا لیکن ہم نے ان کی ہر بات ہنسی میں اڑا دی تھی۔ اے بغض تعالیٰ! انھیں ہماری رہنمائی کر رہا ہے اور ہم مغرب کی پٹری سے اُتری ہوئی ریل پر بیٹھے خوشی

سے پھوٹے جا رہے ہیں :

حضرت، حضرت نکمٹ مجھ کو دلا دیں اکبر
رہنمائی کے لیے ہے مجھے انجمن کافی

مال گاڑی پہ بھروسہ ہے جنہیں اے اکبر

ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا

اکبر کی شاعری اور ان کا تہذیبی زاویہ نظر ہمیں آج بھی دعوتِ فکر دیتا ہے لیکن اب
”یہ وہ منزل ہے جس میں شیعہ کا ٹوٹ نہیں چلتا“ اس زاویے سے دیکھتے تو اکبر کی آواز وہ
آواز ہے جو نہ صرف پاکستان اور ہندوستان کو بلکہ سارے ایشیا کو زندہ رہنے اور خود کو از سر نو
دریافت کرنے دعوت دیتی ہے۔ اکبر جیسا شاعر ایشیا کی کسی بھی دوسری زبان میں مجھے نظر نہیں
آتا جس نے مغربی تہذیب کے نلبے سے بچنے کے لیے اس دل چسپ اور دلکش انداز میں
اپنی جڑوں سے پیوستہ رہنے کی تلقین کی ہو اور قوموں کی تخلیقی صلاحیتوں کو زندہ و باقی رکھنے
کا گڑ سکھا یا ہو۔ اسی لیے میں اکبر کو صرف مزاحیہ شاعر نہیں بلکہ جدید فلسفی شاعر سمجھتا ہوں۔ ایک
ایسا فلسفی شاعر جس نے اس وقت ہمیں وہ بتایا جب ہم مجبور تو ضرور تھے لیکن پوری طرح
بہرے نہیں ہوئے تھے۔ اکبر آبادی کی یاد مناکر الہ آباد والوں نے جہاں اپنی وطن دوستی کا
ثبوت دیا ہے میرزا خیال ہے کہ آج وہ موقع بھی فراہم کیا ہے کہ جہاں سے ہم اپنی جڑوں کی تلاش
میں نکل کر خود کو اور اپنی تہذیب کو از سر نو دریافت کرنے کا عمل شروع کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ
آپ جانتے ہیں قلمی آسم کا پیوند ہمیشہ دسی پڑی کی شاعر پر لگتا ہے جس کی جڑیں اپنی زمین میں
پیوست ہوتی ہیں۔ اکبر الہ آبادی ہار بار اور طرح طرح سے یہی کہتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے
جناب سید پرٹھوڑی کا تھا۔

ابتدا کی جناب ستید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

اکبر الہ آبادی کے تعلق سے اور بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن آج کی شام میں آپ سے

یہی کہنا چاہتا ہوں اور صرف یہ سوال پوچھ کر گپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ کیا اپنی جڑوں سے
رشتہ کاٹ کر آپ اپنی تخلیقی قوتوں کو زندہ و قائم رکھ سکتے ہیں؟ کیا ہماری موجودہ تخلیقی
صورت حال اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہم اپنی روایت سے کٹ کر تخلیقی سطح پر بالکل بانجھ
ہو گئے ہیں اور کیا زندہ و تازہ تخلیقی قوتوں کے بغیر ہم زندگی میں کوئی کام انجام دے سکتے ہیں۔
اکبر نے ہم سے یہی سوال پوچھا تھا اور یہی سوال ہماری تہذیب کے بچتے ہوئے شیع خانے کے
صدر و رازے پر جلی حروف ہیں تو بھی آویزاں ہے :

ہیں عمل اچھے مگر دروازہ جنت ہے بند

کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

پہن لے سایہ مری جان آکر کر پشواز

زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ہساز

نیاز فتحپوری

آج سے سو سال پہلے ۱۸۸۳ء میں نئی گھاٹ کے مقام پر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا تاریخی نام ان کے والد صاحب نے لیاقت علی خان رکھا اور والدہ نے نیاز محمد خان رکھا۔ باپ کا رکھا ہوا تاریخی نام تو نہ چلا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لیاقت علی خان کے نام سے ہمیں ایک اور مستبروتی کو پہچاننا تھا جس کے یوم شہادت کو اہل پاکستان ۱۶ اکتوبر کو ہر سال مناتے ہیں، لیکن ماں کا رکھا ہوا نام ایسا چلا کہ آج بھی ہم نیاز صاحب کو اسی نام سے پہچانتے ہیں اور آج سو سال بعد ۱۹۸۳ء میں ان کی ولادت کا جشن صد سالہ منانے کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ نیاز فتحپوری ہماری تاریخ کا ایک بڑا نام ہے۔ اسی بڑا کہ آج خود بڑائی کا قد، ہم نیاز فتحپوری کے قد سے ٹپتے ہیں۔

فروری ۱۹۲۲ء میں نیاز فتحپوری صاحب نے یارانِ تحید کے ساتھ مل کر بھوپال سے 'نگار' جاری کیا اور اپنی وفات ۱۹۶۶ء تک وہ ۴۴ سال نگار کو مسلسل شائع کرتے رہے۔ رسالے شائع ہوتے ہیں اور بند ہو جاتے ہیں لیکن کم رسالے ایسے ہوتے ہیں جو مدیر کی ذات و شخصیت کا اس طور پر حصہ بن جاتے ہیں کہ رسالے اور شخص کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ نگار نیاز تھے اور نیاز کا نام نگار تھا جیسے نیاز فتحپوری تھے ویسا نگار تھا۔ نگار کے پہلے شمارے کے اوپرے میں نیاز فتحپوری نے لکھا کہ

”جس وقت ترتیب نگار کے فرائض پر میں نے غور کیا تو

ضروریاتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ تو میں نے پہلے ہی سانس

میں کر لیا کہ نگار کو خالص ادبی رسالہ تو نہ بننے دوں گھا۔

اس جملے سے بنیاد فتنہ پوری کے انداز فکر کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ "ضروریاتِ زمانہ" کو خالص اہمیت دیتے تھے۔ دوسرے وہ نگار کو "خالص ادبی رسالہ" نہیں بنانا چاہتے تھے اور یہ دونوں وہ بنیادی باتیں ہیں جن سے مل کر نگار کا مزاج ترکیب پاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو ذہنی طور پر بیدار ہے زندگی کے معاشرہ رجحانات سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے نیاز صاحب نے نگار کو عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید رجحانات کا رسالہ بنایا اور اسی لیے نگار ہمیشہ پسندیدہ رسالہ رہا۔

وہ لوگ جو زمانے کا شعور رکھتے ہیں اس بات کو جانتے ہیں کہ تبدیلی کا عمل ایک فطری عمل ہے لیکن اس کے باوجود اس فطری عمل کا اظہار غیر روایتی عمل ہے اور معاشرے کے لیے عام طور پر قابل قبول نہیں ہوتا۔ اسی لیے ٹکھنے اور سوچنے والے ذہن کو تبدیلی کے عمل کا شعور پیدا کرنے کے لیے معاشرے سے جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ معاشرے کو اس کے غول سے باہر نکالنے کے لیے اپنے قلم سے بیداری کی جوت جگانی پڑتی ہے اور یہ کام جرأت و بیباکی کے ساتھ آزادی اظہار سے کرنا پڑتا ہے یہی کام ساری عمر نیاز فتنہ پوری نے کیا اور اسی وجہ سے نگار نے اپنے زمانے کی بھرپور ترجمانی کی۔ آج جب ہم ۱۹۶۲ء اور اس کے بعد کے معاشرے کے خد و خال کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک ایسا معاشرہ نظر آتا ہے جو روایت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے جو کسی نئی بات کو سننے یا اس پر سوچنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ جو ہے ٹھیک ہے یہی اس کا عام رویہ ہے۔ نیاز فتنہ پوری نے اپنے قلم سے نہ صرف اس جمود کو توڑا بلکہ اس روایتی انداز پر بھرپور ضرب لگائی اور ایسے ایسے مسائل پر قلم اٹھایا جن پر لکھنا اس دور میں انتہائی مشکل کام تھا۔ ان بحثوں نے جو نگار کے صفحات پر انھیں چھبے ہوئے معاشرتی تالاب میں ایک تلاطم پیدا کر کے نئی نسل کے ذہنوں کو تبدیلی کی برکتوں کو قبول کرنے پر آمادہ کیا اور اس طرح زندگی میں تبدیلی کے عمل کو تیز کر کے اسے آگے بڑھانے کا کارنامہ انجام دیا۔ اسی لیے

آزادی اظہار اور حرارت فکر ہمیشہ نیاز فتحپوری اور نگار کی نمایاں خصوصیت رہی اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے نیاز اور نگار ہماری جدید تہذیبی و ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔

نیاز فتحپوری نے ”ملاحظات“ میں ہمیشہ اس مسئلے پر اظہار خیال کیا جو اس زمانے میں اجماعت رکھتا تھا اور اگر صرف ملاحظات کا ترتیب سے مطالعہ کیا جائے تو ہم اس دور کے ذہنی دھاروں کی سن وارت تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کو مسئلے کے بنیے پہلو سے روشناس کرایا اور انھیں جذبات کے تلاطم میں راوا اعتدال خفید کرنے اور اعتدال کے اس مخصوص رخ سے سوچنے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے ہمیشہ حق کی آواز بلند کی اور قلم کی آزادی اور اظہار کی حرکت کو کسی مصلحت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اظہار کی آزادی، فکر کی حرارت، ٹھنڈے دل سے جذباتی مسائل پر سوچنے اور لکھنے کی قوت کو ایسی اہمیت دی کہ آج بھی ہمیں ان خصوصیات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور آج بھی مولانا نیاز فتحپوری کی روح قلم میں یہی راستہ دکھا رہی ہے۔ یہی وہ عظیم اور زندہ روایت ہے جس کے مولانا نیاز فتحپوری علم پر دار تھے اور یہی وہ روایت ہے جس کی آواز کے دانشوروں اہل قلم اور ادیبوں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ روایت ہے جس سے قلم معاشرے میں جادو جگانا ہے اور زندگی کو پیچھے ڈھکیلنے کے بجائے آگے بلکہ بہت آگے بڑھانا ہے۔ آئیے آج نیاز فتحپوری کا صد سالہ جشن مناتے ہوئے ہم اس بات کا عہد کریں کہ آزادی اظہار اور حرارت فکر کو ہم کسی مصلحت کا شکار نہیں ہونے دیں گے کہ یہی حقیقی ادیب اور حقیقی دانشور کا سرمایہ نیاز ہے۔

اشتیاق حسین قریشی بحیثیت مؤرخ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی گونا گوں شخصیت کا ابدی پہلو یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک مؤرخ تھے۔ ایسے مؤرخ کہ ان کا ثانی دُور دور تک نظر نہیں آتا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ مؤرخ تو اور بھی ہیں لیکن وہ تاریخی شعور جو مجھے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ہاں نظر آتا ہے وہ اس طور پر ماضی قریب کے کسی مؤرخ میں نظر نہیں آتا۔

تاریخ نویسی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ تاریخ جس میں کسی دور کے نمایاں واقعات کو تسلسل کے ساتھ درج کر دیا جاتا ہے اور ان واقعات کا مجموعی بیان "تاریخ" کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اسی قسم کی تاریخیں لکھی جاتی ہیں۔ دوسری قسم تاریخ کی یہ ہے کہ مؤرخ تاریخی واقعات سے اس شعور اور روح زمانہ کو تلاش کرے جنہوں نے مل کر کسی دور کے مزاج کی تشکیل کی ہے اور اس کی فکر، انداز نظر اور رویوں کو جو دیکھنا ہے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسی دوسری قسم کے مؤرخ ہیں۔ انہوں نے بحیثیت مؤرخ تاریخ کو کھنگالا اور مختلف واقعات کے اجزائے کسی دور کی روح اس کے مزاج اور اس کے انداز نظر کی تاریخ اس طور پر مرتب کی کہ تاریخی شعور اس دور کی زندگی کے آئینے میں نظر آنے لگا۔ اسی تاریخی شعور کی وجہ سے میں ڈاکٹر قریشی کو اس صدی کے عظیم مؤرخوں میں شمار کرتا ہوں۔ انہوں نے بڑے عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ مخصوص تاریخی شعور کے ساتھ اسی انداز سے لکھی ہے جس انداز سے اسپیکلر نے ڈکلائن آف دی

ولیت Decline of the West یا ٹرن بنی نے لے اسٹڈی آف

ہسٹری A Study of History لکھی ہے۔

ڈاکٹر قریشی ہارنچ سے قومی شعور کو بیدار کرنے اور تاریخ ماضی سے اس شعور کے دھارے کو تسلسل کے ساتھ دیکھنے اور دکھانے کا کام لیتے ہیں۔ ایک دور دوسرے دور سے مختلف ہوتا ہے اور اسی لیے ایک دور کا انداز فکر اس کے رویے اور زبان بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں جس طرح لوگ سوچتے، چیزوں کو دیکھتے اور انسانی تشوئل کے معنی سمجھتے تھے آج ۱۹۸۵ء میں لوگ اس سے مختلف انداز میں سوچتے اور دیکھتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ایک حقیقی مورخ اسی کا جواب تاریخ سے تلاش کر کے سامنے لانا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے میں تاریخی شعور کا نام دیتا ہوں اور اسی لیے آپ ڈاکٹر قریشی نے ایک جگہ لکھا ہے ”ہر عہد کی روح ایک مختلف زبان میں کلام کرتی ہے؛ زمانے کی روح کے مختلف ہونے کی وجہ ہی سے ایک دور دوسرے دور سے مختلف ہوتا ہے اور حقیقی مورخ کا یہ بنیادی کام ہے کہ وہ اس روح کو سامنے لائے۔ آج ہونے والا واقعہ یا رجحان ماضی میں پیدا ہونے والے واقعے یا رجحان کا تسلسل ہوتا ہے جو مستقبل سے جا ملتا ہے۔ مورخ اسی تسلسل کو دریافت کرتا ہے اور فلسفی و مفکر بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس لیے مورخ بھی ہیں اور مفکر فلسفی بھی۔

مورخ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ماضی کو زمانہء حال میں زندہ کر دے۔ نہ صرف زندہ کر دے بلکہ اسے ہمارے شعور کے ارتقا کا ایک حصہ بھی بنادے۔ کوئی خیال یا کوئی فکر اچانک آسمان سے نہیں اترتے بلکہ وہ ایک بیڑ کی طرح دھیرے دھیرے پروان چڑھتے اور اپنی صورت بناتے ہیں اور پھر کہیں جا کر معاشرے کے ذہن کا حصہ بنتے ہیں۔ تاریخ ماضی کے اسی ارتقا کو زمانہء حال میں سامنے لانے کا نام ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی تصانیف میں یہی انداز نظر اختیار کرتے ہیں اور یہی ان کا مخصوص نظریہ تاریخ ہے۔

اس بات کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ مسلمانوں نے برصغیر میں تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی۔ جب وہ یہاں گئے تو وہ اقلیت میں تھے۔ ایک طرف انھیں اپنی مداخلت کا مسئلہ درپیش تھا اور دوسری طرف انھیں اکثریت کے مذہب میں

جذب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ان دوسطوں پر پوری احتیاط سے کام لے کر اپنی فکر اور اپنے نظام کو اس طور پر ڈھالا کہ وہ اکثریت کے غلبے سے محفوظ رہے۔ سولہویں صدی میں مسلمان تمام منظر پر نگاہ ڈالنے کے بعد مطمئن نظر کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اسلام کی قدروں کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تینسی داس، کبیر داس، اگر وناکھنچنیا اور نام دیو وغیرہ کی تحریکیں اس کا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے لکھا ہے کہ تاریخ میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ایک مذہب نے اس قدر مستعدی اور خلوص کے ساتھ دوسرے مذہب کی قدروں کو تسلیم کر لیا ہو جب کہ وہ مذہب زیادہ قدیم بھی ہو اور قیامی فلسفے اور ترقی یافتہ مابعد الطبیعیاتی نظام بھی رکھتا ہو۔ اس سے پہلے ہندومت نے بودھ مت اور جین مت کے خلاف بڑی کامیاب جنگ کی تھی اور بہت سی اجنبی قوموں کو اپنے سماجی نظام میں جذب کر لیا تھا۔ اس نے کبھی کسی اجنبی فلسفے کو اس طرح نہیں اپنایا تھا۔ اسی لیے سولہویں صدی میں مسلمانوں کے لیے یہ ایک نہایت خوش آئند بات تھی۔ لیکن یہاں ڈاکٹر قریشی یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کبیر داس کی آواز میں کہا اسلام کی آواز بول رہی تھی یا یہ ہندومت کی آواز تھی؟ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلام کی آواز تھی لیکن بنیادی طور پر یہ آواز ہندومت کی آواز تھی جو اپنے سو فسطائی اور نہماں انداز میں اپنا کام کر رہا تھا۔ یہ ہندومت کا بنیادی تعقل ہے اسلام کا نہیں کہ ایک فلسفہ یا مذہب جو کچھ پیش کرنا چاہتا ہے وہ اس فلسفے یا مذہب کے عقیدے کی رسمی تکرار کے بغیر صرف اعمال کو اس فلسفے یا مذہب کے سانچے میں ڈھال دینے سے ہو سکتا ہے۔ ہندومت نے ہمیشہ ہی کیا ہے اور مختلف تصورات کے تحت بنا کر اپنے مندروں میں رکھ دیے ہیں۔ اگر ایک گروہ اپنے آپ کو دوسرے ہندوؤں سے مختلف سمجھتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وقت گزرنے پر ہندو تصورات اور ہندو معیار آہستہ آہستہ چھین کر اس میں داخل ہونے لگتے ہیں اور آخر میں وہ اپنے ماحول کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ جانٹا ریپورٹ ہافٹر کے پیمانوں، آجروں وغیرہ کے ساتھ یہی ہوا اور آج وہ ہندومت کا ایک حصہ ہیں۔ اس دور کا

اور اصل اسلامی قدروں کو قبول کر لینے میں ہندو مت کا اعتراضی رجحان کام کر رہا تھا یہی صورت اس وقت پیش آئی جب مغربی تہذیب اور عیسائیت نے اسی قسم کے مسائل پیش کیے تو ہندو مت نے انھیں طریقوں سے ان کا جواب دیا۔ اس نے برہمنوں جیسے فرقے کی بنا ڈالی، بھگتی کا وعظ کہنے والے اپنے اس اعلان کی نگرار سے کبھی نہیں تھکتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں۔ اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو تبدیل مذہب بے معنی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر جی۔ بی۔ کپتھریکے کہتے ہیں کہ مختلف مذاہبوں کے لوگوں کو مربیوں کے حلقے میں داخل کرنے کا رواج بھگتی کے بہت سے محلوں کی خصوصیت تھی یہ وہی صورت تھی جو صوفیائے کرام کرتے تھے۔ اس عمل سے ایک ایسا ماحول پیدا ہوا جس میں مذہبی مراسم اور برادری کے احساس کی قیمت اصل سے کم ہو گئی اور مذہب کی روحانی قدروں کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ بہت سے ڈیپنوں میں یہ بات کہنے لگی کہ مذہب کی ظاہری صورتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اسی عمل کے ساتھ مسلمانوں میں مذہبی شعائر کی طرف رجحان کم ہونے لگا۔ یہیں سے وہ عمل شروع ہونا ہے جس سے ہندو مت نے باہر سے آنے والوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ پہلے باہر سے آنے والے ہندو مت کے چار دروزوں میں شامل ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ ہندو دنیا کا حصہ بن گئے۔ پوری تاریخ کے دوران ہندو مت کی یہ کوشش رہی ہے کہ دوسرے مذاہب سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے سب سے پہلے خلل انگیز تعلیمات کو اپنی (یعنی نوعیت کے باوجود) اپنے پیروؤں کے بعض طبقوں کے عقاید میں جگہ دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان برادریوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی جائے جو حُرک وطن کے بڑے عظیم میں آئی ہیں یا اس کے اندر خود بخود پیدا ہوئی ہیں۔ بڑے عظیم کی ملت اسلامیہ نے اس کو محسوس کر کے خود کو ہندو مت میں جذب ہونے سے بچانے رکھا۔

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمان حکمران تھے۔ اب جب کہ ہندو مت ان کے مسلمان حکمران نہیں ہیں اور ہندو مت کے دھم و کرم پر مبنی یہ عمل شروع ہو چکا ہے اور وہاں اکثر طلبہ اپنی فراخ دلی کے اظہار کے لیے یا ملازمتوں کی خاطر مذہب کے خدانے میں "انسانیت" کا لفظ لکھ رہے ہیں اور یہ ایک خطرناک رجحان ہے جس سے جذب ہونے کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔

ہی صورت پاکستان میں ہمارے سامنے ہے۔ ہم بھی مغرب کے سیلاب فکر کے سامنے بے دست و پا ہو کر مغربی فکر میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تاریخ کو اسی انداز سے دیکھتے ہیں اور یہی ان کا مخصوص زاویہ تاریخ ہے جس میں وہ منفرد و ممتاز ہیں۔

میں نے اس مضمون میں ڈاکٹر قریشی کی تاریخ نویسی کے بہت سے رُخوں میں سے صرف ایک رُخ کو پیش کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ جدید مورخوں کو اسی انداز نظر سے کام کرنا چاہیے تاکہ جدید تاریخ نویسی کی حقیقی معنویت سامنے آ سکے۔

(۲۶، جنوری ۱۹۸۸ء)

پاکستانی فکر کی اساس

ایسے لوگ جسے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے روز بروز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟
شاید میر تقی میر نے انہی کے لیے کہا تھا :

پیدا کہاں ہیں ایسے پر آگندہ طبع لوگ
شاید کہ خم کو تیرے صحت نہیں رہی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلام کے شیدائی اور سچے مسلمان تھے۔ ہلکتے مسئلہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ ایسی دل سوڈی اور ایسی درد مندی کم کم دیکھنے میں آتی ہے، مجسم علم، سرتاپا عمل، تحریر پر قدرت، تقریر پر قادر، مشفق بھی اور مخلص بھی۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان کے ملاقاتی تو یہی احساس ہوا تھا اس وقت وہ مرکزی کابینہ میں وزیر تھے اور جب ہلال احمد زہری صاحب کے ہمراہ ان سے آخری ملاقات ہوئی تو وہ اسلام آباد جانے کی تیاری کر رہے تھے اور جب اسلام آباد سے واپس گئے تو اپنے پیروں پر نہیں دوسروں کے کاغذوں پر آئے۔ انسان جب آتا ہے تو دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور جب جاتا ہے تو دوسروں کے کاغذوں پر ہوتا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے اور یہی رویت ہے۔

اسی ہستی کی یاد میں جناب ہلال احمد زہری صاحب نے محنت، محبت اور سلیقہ سے ایک یادگاری مہلدہ مرتب کیا ہے جس کے مطالعے سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی شخصیت، فکر کے وہ تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں جس سے وہ عبارت تھے۔ اسی لیے یہ کتاب سب کو دلچسپی چاہیے تاکہ لوگ ایک سچے مسلمان، ایک اچھے انسان، ایک معتمد دوست، ایک شفیق استاد، ایک اچھے منتظم، ایک بلند پایہ مفکر اور ایک مستند مورخ کے کارناموں سے واقف و متعارف

برائیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا انداز فکر ایک ایسے محب وطن پاکستانی کا تھا جو ایک طرف تحریک پاکستان کا سپاہی اور دہائی تھا اور دوسری طرف فکر و نظر اور تہذیب و ثقافت کی سطح پر ان عوامل کو فکر پاکستان میں شامل کرنا چاہتا تھا، جو پاکستان کی پہچان ہیں اور جن سے پاکستان صحیح معنی میں ایک ملک اور پاکستانی صحیح معنی میں ایک جمہتی کے رشتے ہیں پرمست ایک متحد قوم بن سکتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ تین بنیادی باتوں پر زور دیتے تھے پہلی بات یہ کہ وہ اسلام کو پاکستان کی بنیادی شناخت سمجھتے تھے جس سے یہ ملک وجود میں آیا تھا اور جس سے یہ ملک قائم و دائم رہے گا ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ :

”میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے بغیر پاکستان مرگزر قائم نہیں رہ سکتا۔

اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ پاکستان کی وحدت کا سبب صرف

اسلام ہے۔ اس وحدت میں اور عناصر بھی شامل ہیں لیکن ان میں سب

سے زیادہ اہمیت اسلام کو حاصل ہے۔ اگر اسلام نہ ہو تو پاکستان

کے شیرازہ کو جمع رکھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ (ص ۱۲۰)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نزدیک اسلام زبانی جمع خرقہ ۱۲۸م نہیں ہے بلکہ وہ

تو سراسر عمل کا نام ہے۔ ایسا عمل جس سے انسان کا کردار بنتا ہے۔ ایسا کردار جس سے

اسلام انسان کی روح میں سرایت کر کے، معاشرے اور فرد کی شناخت بنتا ہے۔ اسی

لیجے جب وہ موجود صورت حال کا تجزیہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ :

”ہماری ناکامیاں دراصل ہمارے کردار کی خامی کی وجہ سے

ہیں۔ پاکستان میں آئین ناکام نہیں رہا ہے بلکہ آئین کو چلانے والے ناکام

رہے ہیں۔ ہماری ناکام حکومتیں کرداری خامی کی سبب سے صحیح نہ چلی گئیں۔

اگر ہمارا کردار درست ہوتا اور آئین ناقص ہی ہوتا تو بھی ہم کردار کے زور

زور پر اسے کامیاب بنا سکتے تھے۔ اگر آئین اچھا بھی ہو اور کردار ناقص ہو

تو آئین کبھی نہیں چل سکتا۔ (ص ۱۲۲)

ڈاکٹر قریشی خود غرضی کو پاکستان کی بد حالی کا سبب جانتے ہیں:

”ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں خود غرضی اس حد تک پہنچی گئی ہے کہ ہم اپنی چھوٹی سے چھوٹی غرض کو بڑا کرنے کے لیے بڑے سے بڑے اصول کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ (ص ۱۲۳)

”اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ رشوت لو، اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ رشوت نہ لو۔ جس قوم کے دل سے خدا کا خوف چلا جاتا ہے تو اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف اسی دنیا کو بنانا ہے اور دنیا بھی ایسی نہیں بتاتی جس سے ساری قوم یا ملک کو فائدہ پہنچے بلکہ مقصود محض ذاتی منفعت ہوتا ہے اور فرد بھول جاتا ہے کہ اگر قوم تباہ ہو جائے گی تو خود فرد بھی کہاں رہے گا۔“ (ص ۱۲۳)

ڈاکٹر قریشی کے نزدیک دوسری بات جس سے پاکستان ایک ملک اور پاکستان ایک متحد قوم بن سکتی ہے، یہ ہے کہ قوم کو تعلیم اپنی قومی زبان میں دینی چاہیے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر اپنی زبان کو ترک کر دیا جائے یا پس پشت ڈال دیا جائے تو تھوڑے عرصے کے بعد جذبات بدلتے نہیں بلکہ مسخ ہونے شروع ہو جاتے ہیں اس لیے کہ جذبات یا جتنے خیالات ہا ریٹک ہوتے ہیں وہ ایک خاص طریقے سے نشوونما پاتے ہیں۔ ان کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ ان کے پیچھے تاریخی تجربات و حیات کی پوری کش مکش ہوتی ہے۔ اگر کسی اور جگہ سے زبان مستعار لی جائے تو نتیجہ اس کا یہی ہو گا کہ جذبات و خیالات بھی مستعار لینے پڑیں گے۔ جو چیز اس طرح سے مستعار لی جاتی ہے اس پر کبھی انسان کو نہ پورا قیاس حاصل ہو سکتا ہے اور نہ مستعار لی ہوئی قوتوں میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ انسان کو صحیح راستے پر چلا سکے۔ یہی سبب ہے جو قومیں اپنی زبان سے نا آشنا ہوتی ہیں وہ کبھی ایسا کارنامہ علمی یا فطری یا ذہنی پیش نہیں کر سکتیں جن پر انھیں فخر ہو۔ تمام ایسے ممالک میں جہاں اپنی زبان کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا جاتا خیالات کی ایسی پستی پائی جاتی ہے کہ دماغ بھی ترقی نہیں کرتے بلکہ ترقی بند ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے درختوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں نہ دھوا

ملے نہ ہوا ملے، جو ششکر کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معیار تعلیم مسلسل تکرر رہا ہے کسی دوسری زبان میں رٹ کر امتحان پاس کرنے سے دماغ کی ترقی یا علم کا فروغ نہیں ہوتا بلکہ دماغ شکوک و شبہات سے بھر کر رہ جاتے ہیں۔ طالب علم میں حصول علم کی لگن ہی پیدا نہیں ہوتی صاحبانِ اقتدار اس بات کی کتنی ہی مخالفت کریا لیکن یہی اور یہی بات اپنی جگہ درست ہے۔ انگریزی ضرور پڑھیے اور خوب پڑھیے۔ اس پر پوری قدرت حاصل کیجیے میرا خیال ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو جہت بھی انگریزی آنی چاہیے لیکن اصل مسئلہ اسی انگریزی کرنے کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ تو ذریعہ تعلیم کا ہے۔ ذریعہ تعلیم اگر اپنی زبان میں ہو تو ذہن کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہو کر سستی سے رفعت کی طرف جانے لگتی ہیں۔ یہ بات جتنی جلد صاحبانِ اقتدار کی سمجھ میں آجائے اتنا ہی قوم کے لیے مفید ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ:

”یورپ کے فردن وسطیٰ میں تھوڑی بہت علمی ترقی جو ہوئی ہے اس کی بنیاد تمام تر لاطینی پر قائم تھی لیکن کیا وہ علمی ترقی موجودہ علمی ترقی کا پاسنگ بھی تھی ایسا ظاہر ہے کہ موجودہ ترقی کسی غیر زبان کے ذریعہ سے نہیں ہوئی بلکہ قومی زبانوں کے استعمال سے پسر آئی، چنانچہ انگریز جن کی تقلید کا بار ہم اپنے محلے میں اب تک ڈالے ہوئے ہیں اس دن سے اپنی ترقی کی ابتداء شمار کرتے ہیں جب انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور لاطینی سے انھیں نجات ملی۔“ (ص ۵۰)

”علم اسی حالت میں ترقی کر سکتا ہے اور عوام میں پھیل سکتا ہے جب انھیں ان کی زبان میں اسے سکھایا جائے۔ ایک طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سائنس کی تعلیم عام ہونی چاہیے اور عوام کو سائنس سے تعلق ہونا چاہیے اور دوسری طرف ہم عوام کے اور سائنس کے درمیان وہ دیواریں کھڑی کرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کبھی سائنس سے روشناس نہ ہو سکیں گے۔“ (ص ۵۲)

تیسری بات جس پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم زور دیتے ہیں وہ اپنی میراث کا

احساس دشواری ہے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھ کر وہ کہتے ہیں کہ:

”اب ہمیں کسی چیز پر اعتماد نہیں رہا۔ ہمارے دل میں اپنی کسی روایت سے وابستگی اور اپنی میراث کے کسی حصے سے لگاؤ کا شائبہ بھی باقی نہیں۔ ہمارے احساس کمتری کا اس سے زیادہ اور کیا مظاہرہ ہوگا کہ ہمارے مکانات، محلوں، راستوں، اداروں، کالج خانوں حتیٰ کہ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء تک کے نام غیر ملکی ہیں۔ ہماری قوم کے والدین کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے ایک خارجی زبان کو بے تکلف بول سکیں اور اگر وہ اپنی مادری یا قومی زبان بولنے سے یکسر قاصر ہو جاتے ہیں تو یہ بات مزید اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔“

ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں کہ:

”جب میری نسل کا غنفوانِ شباب تھا تو ہمیں مسدس حالی کے ہندو ہانگ درا کی پوری پوری نظمیں، شکوہ اور جواب شکوہ کے جتنے جتنے حصے ازبر تھے۔ شعر کے کچھ حصے اور اس سے گھٹت اندوز ہونے کی صلاحیت تھی۔ اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر تھا۔ اگر کوئی ہمارے ماضی کو برا کہتا تھا تو ہمارا دل دکھتا تھا اور اگر کوئی ہمارے معتقدات پر حملہ کرتا تھا تو ہم برا فروختہ ہوتے تھے۔ یہی تو وہ جذبات تھے جو ہماری قوتِ عمل کو بیدار کرتے تھے۔ یہی وہ رجحانات تھے جو پنجنگی پاکر ایک سیل رواں بن گئے اور جنھوں نے ہندی اور برطانوی سامراجیت کو اپنے راستے کے یوں ہٹا دیا جیسے دریا کا دھلا خنس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پوچھتے ہیں کہ:

”میں اپنی کم کردہ قوم سے نہایت ادب کے ساتھ سوال کرتا ہوں کہ پاکستان حاصل کرنے کا جذبہ ہمارے دل میں ٹیکس پیئر بڑھ کر پیدا ہوا یا

خسارہ میں رہے گی۔ نہیں تو محض ایک بے کار انجودہ کے ہونے نہ ہونے سے
کسی نریاں کا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

اسی بات کو وہ زندگی کے عام رویوں اور نظام اقدار میں دیکھتے ہیں تو انہیں بے حس و
معاشرتی و اخلاقی کم زوریاں نظر آتی ہیں جنہوں نے قوم کو منتشر اور عدم اعتماد و بے یقینی
کا شکار بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ:

”کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ ثقافت کی کم زوری سے
آپ کی قوم میں خود غرضی، سہل انگاری، فرض ناشناسی، اخلاقی کم زوری
اور اخلاق کی پستی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ اپنی عزت کیا کرے گا جو
اپنے اندر کوئی چیز قابلِ توقیر نہ پائے۔ جو اپنی عزت نہ کرے اور خود داری
سے بیگانہ ہو، وہ اپنے کردار کو کیا بلند کرے گا؟

اور ہماری بد قسمتی دیکھیے کہ

”کوئی یہ نہیں بتانا کہ یہ سب نتیجہ ہے ایک بے پناہ احساس کمتری کے
سیلاب کا جس کے مظاہر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ وہ بل ہے جس نے اس قوم
کے پیچھے چڑھ کر کھینچ کر دیا۔“

یہی وجہ ہے کہ ہم اس وقت وحدت سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بات واضح ہے
وحدت و قومی یکجہی از خود پیدا نہیں ہوتی اس کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔
خصوصی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس حکمت عملی اور منصوبہ بندی کو
محلہ سے لے کر ضلع تک اور ضلع سے لے کر صوبہ تک اور صوبہ سے لے کر سارے ملک کے
چنے چنے تک پھیلائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے ہم قومی وحدت و
یکجہی کے مسئلے کو اتنا اہم نہیں ڈال کر ایک ایسی ”طفلاذخوش“ نہیں دکھا سکتے کہ جس کے نتائج
کھل کر اب ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ انتشار بڑھ رہا ہے۔ دشمنوں کے ہاتھ اس سے پورا پورا
فائدہ اٹھا کر ہماری بچ گئی ہیں معروف ہیں، مگر مزید غفلت برتی گئی اور نئی حکمت عملی وضع نہ
کی گئی اور صرف ایک ایک دن گزارنے پر کٹا گیا گیا تو ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ ”مزید غفلت

سے یہ خون ہے کہ پانی سرے نہ گند جائے : (ص ۴۷)

تشریش ناک بات ہے کہ اس عمل کی طرف جو قومی ترجیحات میں سب سے اول ہونا چاہیے ہم کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ صرف وقتی اور لمباتی بنیادوں پر ہم مسائل کو منٹلے میں معروف ہیں۔ قوم کے بے کرداری بے ضمیر سی اور مقصد و منزل کے نہ ہونے نے ہر چیز کو مسخ کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریل پٹری سے انگرکھی ہے۔ پٹری سے اترنے اور موجودہ صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ چالیس سال میں نا انصافیوں کی حکمت عملی نے، وحدت و یک جہتی کے عمل کو کم زور سے کم زور کر دیا ہے۔ مغربی پاکستان کو دن یونٹ بنا کر جس وحدت کا خواب ہم نے دیکھا تھا وہ نا انصافیوں کی حکمت عملی کو اپنانے سے پورا نہ ہوا۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان بھی اسی وجہ سے ہم سے الگ ہوا۔ نا انصافی کی حکمت عملی سے تہذیبی، سیاسی، تعلیمی، معاشی و معاشرتی ادارے بھی اس لیے ضعیف و خستہ ہو گئے۔ نا انصافی کی مثال اس گیند کی طرح ہے جسے جتنی قوت سے دیوار پر مارا جائے گا وہ اسی قوت سے واپس کئے گی۔ اسی وجہ سے سارا معاشرہ رقصِ بسل کا تماشا بنی ہے اور خود کو بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے۔ انصاف اور صرف انصاف، زندگی کی ہر سطح پر انصاف، قومی یک جہتی اور تہذیبی و سیاسی اداروں کی نشوونما کے لیے ویسا ہی ضروری ہے جیسے سانس کی آمد و رفت انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ جو انصاف کو حکمت عملی بنائے گا۔ جو پورے اعلاص اور پوری دیانت کے ساتھ انصاف کو زندگی کی ہر سطح پر نافذ کرے گا وہی ایک زندہ، تنومند اور متحد معاشرے کو جنم دے سکے گا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور یہی ہمارے اربابِ عمل و عقد کو بھی کرنا چاہیے۔ یہی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا نقطہ نظر ہے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

تاریخی شعور اور ڈاکٹر قریشی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے بارے میں آپ پہلے سے بہت کچھ جانتے ہیں اور بہت کچھ اُن کے بارے میں آپ فاضل مقروء کی زبانی سُن چکے ہیں۔ مجھے بھی اُن سے اُس وقت سے شرفِ نیاز مندی حاصل تھا جب ۱۹۵۵ء میں انھوں نے میری پہلی کتاب کا مقدمہ لکھ کر مجھے منونِ کرم فرمایا تھا۔ میری یہ نیاز مندی نہ صرف ڈاکٹر قریشی صاحب کی وفات تک قائم رہی بلکہ کچھ بھی میرے دل میں ان کی بڑی قدر و منزلت اس لیے موجود ہے کہ میں انھیں عہدِ حاضر کا ایک ایسا مسلم مورخ مانتا ہوں کہ دوسرا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ مورخ کے ساتھ مسلم کا لفظ سید نے عمداً اس لیے استعمال کیا ہے تاکہ میں ڈاکٹر قریشی کے ”ذہن“ اور تاریخی شعور کو نہایت کر سکوں۔ یہی وہ ذہن اور تاریخی شعور تھا جس نے بر عظیمِ پاک و ہند میں مسلم عوام کا اجتماعی شعور بن کر پاکستان کو وجود بخشا تھا۔ وہ پاکستان جس میں بر عظیم کے مسلمان ”اسلام کی اقدار و روایات اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ“ ایک نئی زندگی کا آغاز کر کے، اسلام کی عظمت و رفتگی محمدیہ کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ہم نئے نئے تضادات کا شکار ہو کر اُس راستے پر چل پڑے کہ کچھ چالیس بعد ہم اسلام کی عظمت و رفتگی محمدیہ کے بجائے عہدِ جاہلیت میں داخل ہو کر نہ صرف خون کی ہوئی کھیلے کا شغل کر رہے ہیں بلکہ اس شاذ کو بھی نہیں سمجھتے کہ کلاٹ رہے ہیں جس پر ہم خود کھڑے ہیں۔ اب ہمیں بڑی باتیں پریشان نہیں کرتیں بلکہ ہم چھوٹی اور اسفل باتوں سے اپنی زندگی کا سفر طے کرنے میں دن رات شد و مد سے مصروف ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے مسلمانانِ پاک و ہند کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ وہ ”سب سے اخلاق کا شکار ہو کر ناقابلِیت، کوناہ، مبینی

خود غرضی، غداری اور کوتاہ نظر حکمت عملی کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس سے ہر سطح کے اہل پاکستان کج بھی دو چار ہیں۔ ایک طرف ہندوستان ہے جو اپنی ٹوہانی ہزار سالہ تاریخی روایت کے عین مطابق مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہے جس کے رقصِ بسل کا تماشہ ہم گزشتہ ۳۳ سال کے مسلسل دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف ہم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی والے مسلم مورخ کے ذہن اور شعور سے دور ہو کر ۱۹۴۷ء میں ملک کا ایک حصہ گنوا چکے ہیں اور اب بھی تاریخ سے سبق سیکھنے بغیر اسی راستے پر گامزن ہیں۔ نئی اکثر قریشی کا ناویہ نظریہ ہے کہ ”ہندومت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ دوسرے مذاہب سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے سب سے پہلے غلط انگیز تعلیمات کو ان کی جنینی نوعیت کے باوجود اپنے بنیادی فلسفے میں نہیں بلکہ اپنے پیروؤں کے بعض طبقوں کے عقائد میں جگہ دی جائے اور اور اس کے ساتھ ان برادر یوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی سعی بھی کی جائے جو ترکِ وطن کے ذریعے برعظیم میں آئی ہیں۔“ ہندوستان میں کج جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندو قوم کے اسی مزاج کا لازمی نتیجہ ہے پاکستان اسی ہندو ذہن کے بچنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا مگر برعظیم کی مکتبہ اسلامیہ ہندومت میں جذب ہونے کا مقابلہ کر کے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ ہندو ذہن اور ہندومت کی اگر تاریخی قوت کا اندازہ کرنا ہے تو دیکھیے کہ باہر سے جتنی قومیں آئیں خواہ وہ باختر کے یونانی ہوں یا راجپوت، حادث اور گھنیز ہوں یا وسطی ایشیائے سے آنے والی دوسری قومیں ہوں وہ سب رفتہ رفتہ اسی عمل سے، جس سے کج ہندوستان کے مسلمان دو چار ہیں، ہندومت میں جذب ہو گئیں۔ ہندومت نے جب فاتح بن کر حکمرانی کا علم بلند کیا تو اسی کے ساتھ محکوم قوم کو جذب کرنے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ ہندوستان کج پاکستان کو اپنا سب سے بڑا دشمن بنی لیے گردانتا ہے کہ پاکستان کا وجود اس کے تاریخی منصوبوں کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔ اگر کج پاکستان کے صاحبانِ اختیار اور باپ سیاست اس بات کو سمجھ لیں اور تاریخ سے سبق سیکھ کر اپنی حکمت عملی وضع کریں تو ہم نہ صرف اپنی قوم کو نئی زندگی بخشیں گے بلکہ اسلامی اقدار کے تحفظ کے سلسلے میں اپنا وہ کردار بھی ادا کر سکیں گے

جس کے لیے ہم نے اس ملک عزیز کو جو بخشا تھا اور اسے تقدس کے ساتھ پاکستان کا نام دیا تھا۔

اس ہندو ذہن کو جسے اکثر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تحریروں میں بار بار نمایاں کیا ہے اور جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے، آپ دیکھنا چاہیں تو اس تاریخ میں دیکھیے جو

The History and Culture of The Indian

People کے نام سے گیارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور ان گیارہ جلدوں میں سے صرف دو جلدیں مسلمانوں کی حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک جلد کا عنوان ”دہلی سلطنت“ ہے اور دوسری جلد کا عنوان ”مغلیہ سلطنت“ ہے۔ ان دونوں جلدوں میں بھی تاریخی مواد کو اس طور پر ترتیب دیا گیا ہے کہ ان سے دہلی سلطنت اور مغلیہ دور کی عظمت اور کارناموں کے بھائے ان مختلف باب گزار ہندو ریاستوں کی داستان و تہذیب زیاہ نمایاں ہو کر ابھرتی ہے جو اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ تاریخ مسلمانوں کی تاریخ کو ہندو ریاستوں کی تاریخ میں جذب کرنے کے اسی عمل کو آگے بڑھاتی ہے جس سے ہندومت کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسی تاریخی شعور کو بڑے عظیم کی صفت اسلامیہ میں ابھارنے کی کوشش کرتے رہے اور یہی وہ تاریخی شعور ہے جس کی ہمیں نہ صرف آج بلکہ گزشتہ زمانوں میں بھی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ یہی وہ تاریخی شعور ہے جو ہمارا دفاع کر سکتا ہے اور ہمیں ہندومت میں جذب ہونے سے بچا سکتا ہے لیکن خواتین و حضرات! میں ابھی کس تاریخی شعور کی بات کر کے آپ کا وقت خراب کرنے میں لگ گیا۔ ہمارا تاریخی شعور تو ماہر اشارہ اس وقت نسلی، علاقائی اور لسانی بنیادوں پر اپنا الگ الگ وجود منوانے کے لیے ایک دوسرے کو قتل کر کے دن رات اسلام کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے ہمیں دو بنیادی کام کرنے چاہئیں۔ ایک یہ کہ ”الہیت“ اور صرف الہیت کو حکمت عملی کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ”عدل و انصاف“

کو۔ اور اس میں معاشی اور معاشرتی انصاف دونوں شامل ہیں۔ زندگی کی ہر سطح پر اختیار نافذ کرنا چاہیئے۔ تیسرے یہ کہ حکمت عملی وضع کرنے سے پہلے درپیش مسائل کا تحقیقی سطح پر تجزیہ کرایا جائے اور اس کے نتائج پر حکمت عملی کی بنیاد رکھی جائے۔ ہمارے ہاں اب تک ایسا نہیں ہوا ہے حالانکہ عہدِ حاضر کے سارے تمدن اور زندہ قومیں یہی کرتی اور یہی کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس زاویہ نظر کے حامل اور اسی تاریخی شعور کے علمبردار تھے۔

(۲۴ اگست ۱۹۸۷ء)

اقبال اور تشکیلِ جدید

پاکستانیات کے مطالعہ کے لیے جامعہ کراچی میں ایک تطبیقی و تحقیقی ادارہ ”مرکز مطالعہ پاکستان“ کے نام سے کام کر رہا ہے۔ اس مرکز کو انگریزی میں ”پاکستان اسٹڈی سینٹر“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس مرکز کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ مختلف علوم کے اشتراک و امتزاج سے ان ”مشترک ذہنی، فکری، تاریخی، تہذیبی اور لسانی عوامل کی تلاش و تحقیق کرے جن سے ”قوی یک جہتی کو فکری سطح پر فروغ حاصل ہو، مگر اس عمل سے ہم اپنی قومی شناخت کو دریافت اور اسے شعور بنیادیں فراہم کر سکیں۔ یہ یقیناً بڑا کام ہے۔ اس کام کے لیے اہل تحقیق کو تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر معروضی انداز میں ادب و تحقیق دینے کی ضرورت ہے۔ تحقیق دراصل جھوٹ کو سچ سے، غلط کو صحیح سے، نادرست کو درست سے الگ کرنے کا نام ہے۔ وہ صاحبانِ تحقیق جو پہلے سے کٹیے یا نظریات متعین کر کے تحقیق کرتے ہیں۔ دراصل تحقیق کے راستے سے دور ہو جاتے ہیں۔ تحقیق تو، جیسا کہ میں نے عرض کیا، سچائی کی تلاش کا راستہ اور اس کی منزل ہے۔ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا نام تحقیق نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تحقیق سے اکثر یہی کام لیا جا رہا ہے۔ ساری دنیا کی جدید و قدیم جامعات اسی لیے فکر و علم کا مرکز رہی ہیں کہ وہاں آزادیِ اظہار اور آزادیِ فکر کو غیر مہولی اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی آزاد فضا میں علم کا سورج طلوع ہوتا ہے اور بصیرت کی روشنی انسانیت کے افق کو لالہ گوں کر دیتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آزادیِ فکر و اظہار مادر پدر آزاد نہیں ہوتی بلکہ مخصوص دشائستہ نظم و ضبط کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی ایک دانشورانہ سطح ہوتی ہے اور اس سطح پر اختلاف رائے ذاتی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ فکری اختلاف ہوتا ہے۔ اختلاف کے

فکر و دانش کی سطح پر اختلاف سے معاشرہ متحرک رہتا ہے اور مجدد ہو کر اپنے خدو حال نمایاں کرتی ہے۔
فکر و دانش کی سطح پر اختلاف سے معاشرہ متحرک رہتا ہے اور مجدد ہو کر گھٹے سڑنے سے محفوظ رہتا ہے۔ ہمارے ہاں اختلاف کی نوعیت ذہنی و فکری سطح کے بجائے ذاتی نوعیت کی ہو کر رہ گئی ہے اور ایسی نئی دشمنیوں کا پیش خیمہ بن گئی ہے جس کا تقاضا ہم جامعات میں اکثر دیکھتے ہیں۔ نہ لوگوں میں تحمل ہے اور نہ اہل علم میں قوت برداشت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختلاف کیجیے۔ دلائل دیجیے۔ اپنی بات دوسروں تک پہنچائیے لیکن یہ سب کام خوش دلی اور تحمل سے کیجیے۔ تشدد و آزادی اظہار اور آزادی فکر کا بدترین دشمن ہے۔
انفرادی یا اجتماعی سطح پر جہاں تشدد و ردنا ہو گا وہاں کوئی اچھی چیز پروان نہیں چڑھ سکتی اور فکر و دانش اسی طرح تھک سہو رتی رہے گی جس طرح ہمارے تعلیمی و تحقیقی اداروں میں دکھائی دیتی ہے۔ علم کا درخت وسیع مطالعے کی کھاد سے بڑھتا ا پھیلتا اور سایہ دار ہوتا ہے جس کے نیچے علم کے پیلے طلبہ دم لیٹے اور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ ایک بڑا اُستاد ایک ایسے ہی چھتار درخت کی حیثیت رکھتا ہے اور عجز و انکسار اس کی نشأت ہوتے ہیں۔ یہ قانون قدرت ہے کہ درخت پر جتنے زیادہ پھل ہوتے ہیں اس کی شاخیں اتنی ہی نیچے کی طرف تھکتی ہیں۔ یہی ایک اچھے اور بڑے اُستاد کی پہچان ہے۔ جیسے عجز و انکسار اور دلیل و تحمل صاحب علم کی پہچان ہیں اسی طرح علمی مباحثے، مذاکرے، سیمینار سمجوزیم اور ورکشاپ تعلیمی اداروں کی پہچان ہیں۔ ان سے اداروں کی زندگی میں تازہ خون دوڑنے لگتا ہے اور جذبہ مسابقت پیدا ہو کر کام کرنے کا حوصلہ بیدار ہوتا ہے۔ اسی لیے میری ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ جامعہ کراچی کے اساتذہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ملک و بیرون ملک مذاکروں اور سیمیناروں میں شریک ہوں اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پاکستان کی ہر جامعہ سے زیادہ ہماری جامعہ کے اساتذہ مذاکروں اور سیمیناروں میں شرکت کے لیے جھنجھتے ہیں۔ اسی طرح میری یہ کوشش بھی رہتی ہے کہ ہمارے مختلف شعبے، ادارے اور مرکز کم از کم سال میں ایک مرتبہ قومی سطح کا سیمینار منعقد کریں اور میرے لیے یہ اطمینان کا باعث ہے کہ گذشتہ تین چار

سال کے عرصے میں ہماری جامعہ میں بیس سے زیادہ تعداد میں قومی و بین الاقوامی سطح کے سیمینار اور ورکشاپ منعقد ہوئے ہیں۔ ”مرکز مطالعہ پاکستان“ بھی گزشتہ دو سال کے قومی سطح کا سیمینار منعقد کر رہا ہے۔ پچھلے سال پاکستانی معاشرہ اور ادب کے موضوع پر دو روزہ بھی نار منعقد ہوا تھا جس میں پاکستان کے صاحبانِ علم و ادب نے اپنے فکر و گہیز مقالات پیش کیے تھے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ سب مقالات سلیقے سے کتابی صورت میں مشرق جو کہ آج شائع بھی ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے تو اس لیے خوش ہوں گے کہ اس میں جتنے مقالات شامل ہیں وہ سب نہ صرف معیاری ہیں بلکہ غور و فکر اور وسیع مطالعے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان مقالات میں جو تنوع ہے وہ کسی ایک کتاب میں شکل سے ملے گا۔ اس سال جس سہ روزہ سی نار کا اہتمام کیا گیا ہے اس کا موضوع ”اقبال“ فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔ اس سی نار میں پڑھے جانے والے سب مقالے بھی انشاء اللہ اسی سال کتابی صورت میں شائع کر دیے جائیں گے۔

پاکستان کے حوالے سے یہ موضوع غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے اور ہمارے ملک کی غالب اکثریت اسلام کو اپنی معاشرتی و باطنی زندگی میں نافذ کرنے کی خواہش مند ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نفاذ کے لیے فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال اس کے داعی بھی ہیں اور تبلیغ بھی۔ وہ آج اسلامی ممالک میں اسی لیے اسلامی نشاۃ الثانیہ کی علامت بن گئے ہیں۔ ایران میں انقلاب کے بعد جتنا کام اقبال پر ہوا ہے اتنا کام پاکستان کو چھوڑ کر کسی اور مسلم ملک میں نہیں ہوا۔ ایران کے ملی شریعتی اور حسین نصر نے بھی فکرِ اقبال سے اپنی فکر و بصیرت کا چراغ روشن کیا ہے۔ جن موضوعات اور سوالات کو اقبال نے آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اٹھایا تھا وہ آج مسلم آند کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فکرِ اقبال آج ساری مسلم دنیا میں روشنی کا ایک منبع بن چکی ہے۔ اقبال نے ”دی ری کنسٹرکشن آف بریلیجس تھوٹ ان اسلام“ میں اپنے خیالات کو اس طور پر پیش کیا تھا کہ مسلمانوں کی فکر دورِ جدید کے مسائل اور عہدِ حاضر کے انکار کے دائرے

میں داخل ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں اقبال پر بہت کام ہوا ہے اور سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اگر ادبیاتِ اقبال کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بیشتر کتابوں کی حیثیت دراصل تو ضمیمی نوعیت کی ہے اور انھیں ہم زیادہ سے زیادہ تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں "حواشی" کا نام دے سکتے ہیں۔ ان حواشی سے خیالاتِ اقبال کی تشہیر تو ہو جاتی ہے لیکن اس سے فکرِ اقبال کی روایت آگے نہیں بڑھتی۔ فکر تو جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں تنقید سے قدم قدم آگے بڑھتی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اقبال پر تنقید کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ اقبال نے انیک ارادوں اور خلوصِ دل کے ساتھ عہدِ حاضر اور اسلام کے حوالے سے، ان بنیادی امور پر غور کیا تھا جن سے کسی قوم کی زندگی، اس کے ارتقا اور عروج و زوال کی داستان مرتب ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم فکرِ اقبال کا تنقیدی جائزہ لیتے، اس سے آنکھیں چار کر کے اس طور پر بھان بین کرتے کہ فکرِ اقبال کی روایت دیاں سے آگے بڑھ سکتی جہاں خود اقبال نے اسے چھوڑا تھا۔ لیکن ہمارے مزار پرست ذہن نے جھوٹے احزام کا ایک ایسا مصنوعی بال اس عظیم ہستی کے ارد گرد بنا دیا کہ اب اقبال سے بات کرتے ہوئے بھی اس لیے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مزارِ اقبال کے مہاور سے اقبال دشمنی کا نام زد سے دیں محالاً کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اسی اندازِ نظر سے ہم اقبال اور فکرِ اقبال کو صحیح معنی میں آگے بڑھا سکتے تھے۔ روایتِ فکر تو کھلی، آزاد و نفا میں تنقیدی سطح پر آگے بڑھ سکتی ہے ورنہ بصورتِ دیگر تو صرف حکم دیا جاسکتا ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔ اقبال نے جیسا کہ میں نے عرض کیا، بڑے درد و کرب کے ساتھ ان بنیادی مسائل پر غور کیا تھا جن کا تعلق دنیا نے اسلام کی زندگی و موت اور مستقبل سے تھا۔ اقبال کو ہم اسی طریقے سے حیاتِ خودے سکتے ہیں جس طرح انھوں نے اپنے اسلاف کے افکار و خیالات کا تنقیدی محاکمہ کیا تھا۔ صرف بچوں کی چادر چڑھانے یا مزارِ اقبال پر قوالی کرانے سے ہم اقبال کو زندہ نہیں رکھ سکتے۔ اقبال نے زندگی کے مسائل کے بطن کی گہرائیوں میں اُنکر سوچا سمجھا تھا اور کبہِ تخلیق سے گذر کر نئی فکر اور نئی مسلم تہذیب

کی جہت مقرر کر کے ہمیں ایک راستہ دکھایا تھا جس پر چلتا اور اسے صاف و کشادہ کرنا ہمارا فرض تھا، لیکن جس اتفاق دیکھیے کہ ان کے اسی پہلو پر بہت کم کام اور بہت کم غور و فکر ہوا ہے۔

اقبال کے ۶ خطبات ۱۹۲۰ء میں شائع ہو چکے تھے اور ۱۹۲۳ء میں ایک خطبے کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئے۔ پہلے چار خطبے علم اور مذہبی مشاہدات، مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار، ذوالنبیہ کا تصور اور حقیقت دعا اور خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت پر دیے گئے ہیں۔ ان خطبوں میں اقبال نے قدیم تصورات کو عہد حاضر کے تعلق سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ ان چاروں خطبات میں آپ کو عہد حاضر کی روح اور اس کے تقاضوں کا سراغ ملے گا۔ پانچویں خطبے میں اسلامی کلچر کی روح کو تلاش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ چھٹے خطبے میں اجتہاد کو موضوع سخن بنایا ہے اور آخری خطبے میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ کیا مذہب کا امکان ہے؟ یہی وہ مسائل ہیں جو آج نہ صرف ہماری بلکہ ساری مسلم اُمت کی تہذیبی و سیاسی ضرورت ہیں۔

آج کا کلیدی خطبہ جس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اقبال اور عصر جدید میں اسلامی ریاست کا تصور کے موضوع پر دیا ہے اور یہی وہ موضوع ہے جس پر ہمیں ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو فوراً بعدی غور کرنا چاہیے تھا، تاکہ ہم جدید اسلامی ریاست کو قائم کر کے اس کے سیاسی و تہذیبی ارتقاء کے لیے راہ ہموار کر سکتے۔ اقبال نے تحریک پاکستان کو فکری و جذباتی بنیادیں فراہم کی تھیں لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہمیں تعمیرِ مملکت کے لیے فکرِ اقبال کو نئے سرے سے تلاش کرنے کی ضرورت تھی مگر چون کہ ایسا نہیں ہوا اس لیے ہم آج تک منزل سے دور کھڑے ہیں اور حیرتی بن کر کبھی مغرب کی طرف آنکھیں نہ کھینچ کر بے شعوری کے ساتھ اچلنے لگتے ہیں اور کبھی نئے سرے سے اپنی منزل کے تعین کی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت دُنیا میں جن نظریات کا چرچا ہے وہ سب بیسویں صدی میں استعمال کی بجلی سے گند کر فرسودہ ہو گئے ہیں اور تیزی سے بورے ہیں۔ دنیا اب ان سے کچھ بھل چکی ہے۔ یہ صورتِ حال وقت کے ساتھ ساتھ اور نمایاں ہو گی۔ اس لیے ضرورت

اس بات کی ہے کہ کئے والے زمانے کے لیے ہم مسائل پر از سر نو غور کریں، نئے سوالات اٹھائیں اور ان کے جوابات تلاش کریں۔ اجتہاد کا مسئلہ بھی اسی لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سہی تارے جو باتیں سامنے آئیں گی وہ نہ صرف فکر و نظر کے نئے راستے ہمارے سامنے کھولیں گی بلکہ پاکستان میں فکری روایت کو بھی مستحکم کریں گی۔

یہاں تک پہنچا تو یاد آیا کہ مجھے مقالہ نہیں بلکہ صرف خطبہ صدارت پیش کرنا تھا اس لیے خطبہ صدارت کے جواب کے پیش نظر میں اپنی بات، نیک تمناؤں کے ساتھ، اس پیش گوئی پر ختم کرتا ہوں کہ اس موضوع کے بھرپور ساحل بہت دور ہے اور ہماری کشتی بادبانی بھی ہے اور چھوٹی بھی۔

(۲۴ اپریل ۱۹۸۷ء)

مسجدِ قرطبہ

اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور ”مسجدِ قرطبہ“ اس عظیم شاعر کی ایک عظیم تخلیق ہے۔ جیسے عمارتوں میں تاج محل، حسن و جمال کا شاہکار اور فنِ تعمیر کا کامل نمونہ ہے اسی طرح ”مسجدِ قرطبہ“ شاعری کا تاج محل ہے۔ اس نظم میں اقبال کے فکر و فن اس طور پر محفل مل کر ایک اکائی بن گئے ہیں کہ یہ نظم شاعری کا معجزہ بن گئی ہے۔ اس میں اقبال کی تخلیقی قوتیں اور ان کی فکر کے سارے بنیادی پہلو موجود ہیں۔ اس نظم میں اقبال کا فن ایسی بلند یوں سے ہم کنار ہے کہ خود کسی عظیم شاعر کی تخلیقی زندگی میں ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔

مسجدِ قرطبہ آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ہر بند میں آٹھ شعر ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے ہر بند غزل کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ ہر بند کا پہلا شعر مطلع ہے اور باقی چھ شعر غزل کی طرح ہم قافیہ ہیں لیکن آٹھواں شعر اسی بحر میں ہونے کے باوجود ردیف و قافیہ کے اعتبار سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہ شعر ایک طرف فکری و تخلیقی سطح پر پہلے بند سے پوری طرح وابستہ ہے اور دوسری طرف اپنے اگلے بند کے موضوعِ فکر کی طرف اشارہ کر کے اس سے وابستہ ہو جاتا ہے اور اس طرح نظم کے ارتقاء میں مدد دیتا ہے۔ جیسے ہر بند کا ہر شعر ایک دوسرے سے پیوستہ ہے، اسی طرح اس نظم کا ہر بند اپنی جگہ حسین و موثر بھی ہے اور ساتھ ساتھ پوری نظم سے ہم آہنگ بھی نتائجِ عمل کے مینار الگ الگ ہیں لیکن مینار الگ الگ بھی اور مل کر بھی پوری وحدت کے توازن و آہنگ میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی کاملیتِ اقبال کی نظم ”مسجدِ قرطبہ“ میں نظر آتی ہے۔ اس نظم میں اقبال نے ایسی نغمہ ریز بحر

استعمال کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ بحر اسی نظم کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس بحر کو قدیم و جدید شعراء نے اکثر استعمال کیا ہے لیکن جب ہم اسے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں دیکھتے ہیں تو ذہن فوراً ”مسجد قرطبہ“ کی طرف جاتا ہے۔ اس نظم کے زبان و بیان اس کی بندش و تراکیب اس کی لٹریچر اور کیفیت اس کی فکر کا مثبت رویہ ہیں ایک ظلم میں لے جاتا ہے۔ یہ نظم ان ساری خصوصیات کا مرکب ہے۔

مسجد قرطبہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی علامت ہے۔ اس مسجد کی تعمیر آج سے بارہ سو سال پہلے عبدالرحمن الداخل نے شروع کی اور اس کی تکمیل اس کے جانشین ہشام نے ۹۰۱ء میں کی تھی مسجد جو مسند بنیاد عظیم الشان ستونوں پر قائم ہے جن پر بے شمار حسن و جمیل نقوش کندہ ہیں۔ رقبے کے اعتبار سے یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ برصغیر کی طرح اسپین میں بھی مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی اور سات سو سال تک یورپ کو دربار تہذیب دے کر جدید علوم و فنون کا راستہ دکھایا اور پھر جب وہاں کے حکمران عیش پرستی میں مبتلا ہوئے، ان انصافیوں نے معاشرے کو اندر سے کھانا شروع کیا۔ خود غرض اور نفسا نفسی نے فرد کو معاشرے سے کاٹ ڈالا، عظیم مقاصد نابود ہو گئے اور مسلمان انہیں بھلا کر متذکرہ ہے اور الگ الگ فرقوں اور قبیلوں میں بٹ گئے تو اسپین کی یہ عظیم مسلم سلطنت نیست و نابود ہو گئی اور پھر یہ مہر کہ ان کی مسجدیں بے اذان رہ گئیں اور سرزمین اندلس پر نام کو بھی مسلمان نہ رہا۔ یہ ایک ایسی عبرتناک کہانی ہے جس سے ہمیں سبق لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ جو قوم علاقہ پرستی کا شکار ہو جاتی ہے، عظیم مقاصد کو چھوڑ کر خود غرضی اور دولت بھرنے پر لگ جاتی ہے، اس کے حکمران اور راہنما بے مقصد اور ہوس و جاہ پرست ہو جاتے ہیں، اس کا اقتدار بھی اسپین کی طرح ختم ہو جاتا ہے اور اس کی نسلیں دوسروں کی غلام بن کر رہ جاتی ہیں۔ اقبال جب قرطبہ جاتے ہیں تو اسپین کے مسلمانوں کا ماضی و حال ایک لمحے کے لیے ان کے سامنے آ جاتا ہے اور اقبال کے لیے ایک روحانی واردات بن جاتا ہے اور مسجد قرطبہ ماضی کی عظمتوں اور حال کی ویرانیوں کو بیک وقت جمع کر کے مسلمانوں کی عظمت اور ان کے زوال کی علامت بن جاتی ہے۔ اقبال اس نظم

میں مسلمانوں کے زوال کی تاریخ بیان نہیں کرتے بلکہ وہ مسلمانوں کے ماضی، ان کے حال اور مستقبل کو بیک نظر نظم میں نمایاں کرتے ہیں۔ اقبال دوسری اقوام عالم کی طرح مسلمانوں کے عروج و زوال کو سلسلہ روز و شب سے پیدا ہونے والے تغیرات و انقلابات کا سبب بتاتے ہیں۔ نظم کا پہلا بند تغیر و انقلاب کے اسی نغے سے شروع ہوتا ہے :

سلسلہ روز و شب نقشہ گر حادثات
سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب تاجو حیرت و رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلہ روز و شب سازِ ازل کی فضاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و کم کمکات

لیکن وہ قومیں اور وہ افراد جو ”کم حیار“ ہیں موت ان کا مقدر ہے۔ یہاں اقبال اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ تمام معجزہ بانٹے ہنرفانی اور کاروبہاں بے ثبات ہے۔ اس بند میں فتا اور بے ثباتی کا احساس شدت کے ساتھ ہمارے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جب یہ شعر آتا ہے :

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

تو یہ تاثر اور گہرا ہوجاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسرے بند کا پہلا شعر اس عالم مایوسی میں ایک روشنی کی کرن لے کر سامنے آتا ہے :

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مرہِ خدا نے تمام

اس کے بعد یہ کہہ کر اقبال ہمیں راستہ دکھاتے ہیں :

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فرغ

عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرا

اس بند میں اقبال عشق کی عظمت کا نغمہ چھڑاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عشق ایسا سبیل ہے جو دوسرے سبیل کو روک لیتا ہے عشق دم جبریل ہے عشق دل مصطفیٰ ہے عشق خدا کا رسول ہے اور عشق ہی خدا کا کلام ہے۔ اسی عشق سے زندگی کا نغمہ بھڑکتا ہے۔ اسی عشق سے زندگی کا نور اور زندگی کی گرمی پیدا ہوتی ہے عشق کا مثبت اور گہرا اثر دے کر تیسرے بندہ میں وہ براہ راست مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہوتے ہیں :

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود

عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خود مسجدِ قرطبہ اس عشق کی علامت ہے جس کا ذکر ہمیں آیا ہے۔ اسی عشق سے انسان میں وہ تخلیقی قوتیں بیدار ہوتی ہیں جن سے معجزہ فن نمود پاتا ہے اور اسی عشق سے مسجدِ قرطبہ سراپا دوام ہے۔ مسجدِ قرطبہ اس عشق کا اظہار ہے جو سینہ آدم میں موجزن ہے۔ اصل چیز تو انسان ہے، ایسا انسان جس کے اندر عشق کی آگ روشن ہو، جس کے مقاصد اس کی زندگی میں آتش عشق کو فروزاں کر رہے ہوں، جس کا سوز و گداز زندگی کو بدل کر نیا رنگ روپ دے رہا ہو۔ یہ وہی مردِ مسلمان ہے جس کی اذانوں سے سترِ کلیم فاش ہوتا ہے اور جس نے عہدِ قدیم میں ساری دنیا کو ایک ایسا پینٹا دیا کہ جس سے دنیا کے اندھیرے دُور ہو گئے۔ مسجدِ قرطبہ سنگ و خشت سے بنی ہے لیکن آج وہ اس کے جذبہ عشق کی علامت بن کر خود بندہ مومن کا راز آشکار کر رہی ہے۔ مردِ مسلمان کے عشق کی تپش اور سوز و گداز سے اس کی روح و وجود میں آتی ہے۔ یہی وہ عشق ہے جس سے بندہ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ وہ ہاتھ جو غالب و کارِ آفرین ہیں اور کارِ کشاد و کارِ ساز بھی ہے۔ یہاں اقبال مردِ مومن کے عمل و کردار کی وضاحت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مردِ مومن بندہ مولا صفات ہوتا ہے۔ اس کا دل ہر دو جہاں سے غنی ہوتا ہے۔ اس کا دل بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کی اُمیدیں اور خواہشات قلیل ہوتی

ہیں لیکن اس کے مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔ اس کی ادا و لغزب اور اس کی نگاہ و نواز ہوتی ہے۔ گفتگو کے وقت وہ نرم ہوتا ہے لیکن جستجو کے وقت وہ سرگرم ہوتا ہے۔ وہ بزم اور رزم دونوں جگہ پاک دل و پاک باز ہوتا ہے۔ اس کا حقین حق کی سچائی کی آواز ہوتا ہے۔ چوں کہ مسجد قرطبہ کو ایسے ہی مردانِ مومن نے وجود بخشا ہے اسی لیے مسجد قرطبہ ایک طرف کعبہ اور بابِ نبیؐ بن گئی ہے اور دوسری طرف دین اسلام کی سطوت کا نشان بن گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اقبال کا تخیل ماضی میں جا پہنچتا ہے۔ اس ماضی میں جب عربی شہ سوارِ سرزمینِ اندلس میں داخل ہوئے تھے اور اپنے عشق اور جلیل مقاصد کے ساتھ اس سرزمین کو فتح کیا تھا، اپنی نگاہ سے مشرق و مغرب کی تربیت کی تھی اور پ کے اندھیروں کو دُور کیا تھا، اُسے عقل کا راستہ دکھایا تھا اور اس سرزمین پر ایسے ابدی نقوش ثبت کیے تھے کہ آج بھی اندلسیوں کی روشنی جیسٹیں اور آنکھیں ان عرب شہ سواروں کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ اس خیال سے اقبال کا لہو گداز ہو جاتا ہے۔ اب وہ دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے قرطبہ کی فضا بے اذان ہے۔ یہاں اقبال کے قلب میں یہ خواہش موجزن ہوتی ہے کہ آخر عشقِ بلاخیز کا وہ قافلہ اب کہاں ہے جس نے اندلس کی سرزمین پر چراغِ حرم روشن کیا تھا۔ یہاں تغیر و انقلاب کا تصور دوبارہ سامنے آتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جرمنی کے مارٹن لوتھر نے اصلاحِ دین کی شورش برپا کر کے نقشِ کہن سب مٹا دیے تھے۔ انقلابِ فرانس نے مغرب کی دنیا کو دگرگوں کر دیا تھا۔ روسیوں نے تجدید کے ذریعے اپنی مژدہ قوم کو پھر سے جوان بنا دیا تھا۔ اگرچہ یہی عمل اسلام میں جاری ہو تو وہ بھی دوبارہ اپنے زوال کو عروج سے بدل سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر جب وہ دنیا سے اسلام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی انھیں وہی اضطراب نظر آتا ہے جو ترقی سے پہلے مغربی اقوام میں نظر آیا تھا۔ اس اضطراب کو دیکھ کر شاعر میں امید درجا کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ کہتا ٹھٹھے ہیں :

دیکھیے اس محسّر کی تہہ سے اُمچلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنجِ بدلتا ہے کیا

اب عالمِ نوان کی نظروں کے سامنے پھر جانا ہے اور وہ اس کی سحر کو بے حجاب دیکھنے لگتے ہیں اور پھر وہ ترقی کا حقیقی راز ان دو شعروں میں بیان کر دیتے ہیں :

جس میں نہ ہوا انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُم کی حیات کش مکش انقلاب
صورستِ شیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب

اقبال کے نزدیک ترقی کا راز یہ ہے کہ قومیں اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی رہیں۔ ہر وقت اپنے اعمال کا حساب کرتی رہیں اور بدلتے ہوئے زمانے کے مطابق اپنے عمل کو ڈھاتتی رہیں۔ مسلمان بھی اسی عمل سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ وہ آج جو کچھ ہیں، اپنی حالت کا جائزہ لیں، اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔ تجدید سے اپنے افکار کو بدل لیں اور ان افکار کے مطابق اپنے اعمال کو ڈھالیں۔ یہی ترقی کا راستہ ہے اور اسی سے نیا خون قوم کی رگوں میں گردش کرتا ہے۔ مفکر کا، دانشور کا یہی کام ہے کہ وہ قوم کے لیے غور و فکر کا مسالا فراہم کرے اور اسے راستہ دکھائے۔

اقبال نے اس نظم میں بھی یہی پیغام دیا ہے اور ایک ایسے ملک کو دجو و بخشا ہے جو اسلام کا قلعہ بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن جب اقبال نے اپنا کام ختم کیا، ملک بن گیا اور آتشِ عشق کے فردزاں ہونے کا وقت آیا تو اس قوم نے خود غرضیوں، جوس پرستیوں، حرص و جہا کی خواہشوں، دولت ہونے کی اندگی آرزوؤں کی مٹی سے اس آتشِ عشق کو بجھانے کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح ہر نئی صبح نئے مسائل لے کر آئی اور یہ ملک عزیز ہماری ہدا علیوں کی تاریکیوں کے ذیل دوسوا ہو گیا۔ روحِ اقبال جس نے فنی سحر کو دیکھا تھا اور اس بات کی مستطمنی کہ

دیکھیے اس سحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا

مصطرب و بے قرار ہو گئی۔ آئیے ہم سب غور کریں کہ صبح سے شام تک ہم جو کچھ کرتے ہیں اس سے ملک و قوم کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کیا ہم صرف اپنی ذات کی جھلکا

بھر کر اپنی قوم کی حفاظت کر سکتے ہیں؟ کیا ہمارا یہ عمل عشق کی اُس آگ کو، جسے فروزا کرنے کے لیے اسے وجود میں لایا گیا تھا، بجھا نہیں دے گا؟ اقبال کی نظم مسجد قرطبہ ہمیں یہی راستہ دکھاتی ہے :

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زمانہ اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناخامِ خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خامِ خونِ جگر کے بغیر

(۶۱۹۷۷)

اقبال کا پیغامِ عمل

اقبال ہمارے بڑے شاعر ہیں، ایسے بڑے شاعر کہ کوئی دوسرا شاعر ان کے رنگ و نغمہ کی فکر اور ان کے مزاج کا منظر نہیں آتا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند غیر جس ابتلا میں مبتلا ہوئے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ ملت کی نشی اب کبھی ابھر نہ سکے گی۔ سرسید احمد خاں نے تہذیب کی اس گرتی دیوار کو سہارا دیا اور اسے دوبارہ کھڑا کر دیا۔ حالی نے عظمتِ رفتہ کے نغمے الاپے اور مسدسِ حالی سے ملتِ اسلامیہ کے خون کو نہ صرف گرمادیا بلکہ اس میں اپنے ماضی کا شعور بھی پیدا کر دیا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی منفرد شاعری سے اپنی اقدار اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کی اہمیت کا شعور بیدار کیا اور حالی کی طرح ان کے اشعار بھی ملتِ اسلامیہ کی زبان پر رواں ہو کر اس کے احساس اور اس کے جذبات کا حصہ بن گئے۔ یہ کام اس طوع پر اس سے پہلے شاعری نے انجام نہیں دیا تھا۔ اس پس منظر میں اقبال کی صدا بلند ہوئی۔ اقبال نے نہ صرف اپنے دور کے جذبات و احساسات، افکار و خیالات، رجحانات و میلانات کو اپنی شاعری میں سمایا بلکہ روحِ عصر کو سمیٹ کر اسے ایک جہت، ایک سمت بھی دے دی۔ انہوں نے شاعری سے بیک وقت دو کام لیے۔ ایک یہ کہ اپنے معاشرے کے انسان کو اپنی تہذیب، اپنے مذہب، اپنے عقائد، اپنے اقدار کا شعور دیا اور اس پر واضح کیا کہ یہ وہ عقائد و اقدار ہیں جن سے وہ دوبارہ عظمتِ رفتہ کو حاصل کر سکتا ہے۔ جب فکرِ جذبہ بن کر انسان کی رگوں میں تیرنے لگتی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی حرارت، حرکت و عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری سے ایک طرف شعور کو ابھارا،

اے راستہ دکھایا، اس کی منزل کا تعین کیا اور پھر اے نغمہ بن کر ایک زندہ جذبے میں
تبدیل کر دیا اور اسی جذبہ نے معاشرے کو عمل کا راستہ دکھا دیا :-

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاک کی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار

اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

صداقت کا شعور اور اس پر ایمان وہ انسانی صفات ہیں جو زندگی کا رُخ بدل دیتی
ہیں۔ جو انسان کا خواب بن کر تعبیر کے لیے اے بے چین کردیتی ہیں۔ شاعر خواب دیکھتاؤ
پھر اس خواب کو سارے معاشرے کو دکھاتا ہے۔ یہ خواب زندگی میں عمل کا پیغام
بن جاتا ہے جس کا حصول مقصد حیات بن جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری سے یہی کام
کیا اور اس خوب صورتی اور ایسے سلیقے سے کیا کہ ملتِ اسلامیہ کے تہ و ثورہ میں جان
پڑ گئی اور وہ قوتِ عمل کا پیکر بن کر با شعور بن گئی۔ اقبال نے کہا :

نکل کے صحرائے جس نے روماکِ سلطنت کو الٹ دیا تھا

سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اقبال کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی فکر کو نغمہ بن کر قلبِ انسانی میں ایک
ایسی حرارت پیدا کر دی کہ انسان قوتِ عمل کا پیکر بن گیا۔ یہی وہ شاعری ہے جسے قرآن
پسند کرتا ہے۔ یہ وہ شاعری نہیں جو انسان کے دل کو مژدہ اور اس کو افسردہ کر دے۔

وہ فکر، وہ فلسفہ، وہ ادب اور وہ شاعری جو صرف یہ کام کرتے ہیں انسانی فکر کو
پست کر دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری سے انسان کے حوصلے بڑھائے اور اسے
پیغامِ عمل دیا تاکہ وہ اس منزل تک پہنچ سکے جس کا تعین انہوں نے فکری سطح پر کیا تھا۔

اسی لیے اقبال کی شاعری نغمہ بھی ہے اور فکر و عمل کا فلسفہ بھی۔ اقبال کی شاعری کے
سلسلے میں ایک بات یہ اور کہتا چلوں کہ ان کا محبوب انسانِ کامل ہے۔ انسانِ کامل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی قدر ہے اور یہ وہ ذات ہے جو پیکر فکر بھی ہے اور پیکر عمل بھی۔ اقبال کی شاعری جو پیغامِ عمل اور پیغامِ فکر دیتی ہے وہ اسی عظیم ہستی کا آدرش ہے اور اسی طرح انسان کے دل و مائع پراثر کرتی ہے جس طرح اس بندہٴ مولا صفات کا پیغامِ حرکت و عمل کا پیغام ہے۔ اقبال کی شاعری اسی لیے توانائی قوت اور حرکت و عمل کی شاعری ہے اور اسی لیے اقبال بحیثیت شاعر عظیم ہے۔

(۸ نومبر ۱۹۸۸ء)

جوش ملیح آبادی

آج حضرت جوش ملیح آبادی کی وفات کو چھ سال ہو چکے ہیں اور وہ دارالحکومت پاکستان میں اپنی آخری آرام گاہ میں خوابیدہ ہیں اور تا اب خوابیدہ رہیں گے لیکن ان کی شاعری کی گونج سارے برصغیر کے گوشے گوشے میں آج بھی اسی طرح سنائی دے رہی ہے۔ انسان نڈل ہے لیکن اس کے کارنامے لافانی ہیں۔ حضرت جوش نے جنگ آزادی کے دوران جس طرح برصغیر کے معاشرے کو شعور کی روشنی سے بیدار کیا اور جس طرح ہمارے دلوں کی ترجمانی کی وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی تاریخ کا حصہ ہے اور جب بھی شعور آزادی بیدار کرنے کا ذکر آئے گا جوش کا نام سرفہرست ہوگا۔ وہ ایک بے باک انسان تھے۔ جوانی کے دل میں ہوتا وہی ان کی زبان پر ہوتا اسی لیے معاشرہ اور اس کے زور درہج افراد ان سے ناراض ہو جاتے۔ وہ آزادی اور انقلاب کے شاعر تھے اور آزاد اور انقلاب کا شاعر منافق نہیں ہوتا۔ حضرت جوش بھی منافق نہیں تھے اور اسی لیے وہ عظیم تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ناراض ہونے والوں کی نسل صاف ہوتی جائے گی حضرت جوش کی شاعری کی دھوپ تاریخ کے دروہام پھیلتی چلی جائے گی۔ ان کے مزاج میں نہ دھارے ساتھ ساتھ پہتے تھے۔ ایک جاگیر دار اور نظام کی روایت اور دوسرے انسان اور آدمیت کی نگرانی کی روایت۔ معمولات زندگی میں وہ جاگیر دار اور نظام کے حامل تھے لیکن ذہنی طور پر وہ فرد کی آزادی کے علمبردار تھے اور ایک ایسے معاشرے کے خواباں تھے جو جبر و استحصال اور نا انسانیوں سے پاک ہو۔ جہاں فرد کو انہار کی پوری آزادی ہو اور جہاں انسانیت کا احترام کیا جاتا ہو۔ جب وہ اپنے خاندان پر فخر کرتے تھے تو جاگیر دار اور نظام کی روایت ان کے شانوں پر کھڑی ہو کر پکارنے لگتی تھی۔ جوش نے لکھا ہے کہ "میری دادی کہتی تھیں بیٹا تیرے پردادا کی

سواری جب تکلفی تھی تو اس کے آگے آگے نقیب بولاکرتے تھے۔ ہتھیار سواری آکر ہی ہے نواب فقیر محمد خان بہادر کی رائے کے دادا محمد احمد خان احمد بھی نواب تھے اور ان کے والد شہر احمد خان بشیر بھی نواب تھے اور ان کے پردادا احسان الدولہ تھوڑے جگہ فقیر محمد خان گویا بھی نواب تھے۔ خاندان کی یہ روایت معمول کے مطابق جوش صاحب کے خون میں شامل تھی اور اس لیے شامل تھی کہ انھوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور اسی ماحول سے بغاوت کر کے اپنی شاعری کا سرچچہ طلوع کیا تھا اور مظلوم انسان کی آواز کو سارے برصغیر کے دور دراز گوشوں تک پہنچایا تھا۔ مخصوص ماحول میں پرورش پا کر اس سے بغاوت کرنا اور عوام کی حمایت میں اپنی تخلیقی قوتوں کو استعمال کرنا ایک ایسا مشکل عمل ہے جس کو وہی صاحبان دل سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے فراہ کی طرح پہاڑ کھود کر جوئے شیر رواں کی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں جب جوش صاحب کی عمر صرف ۹ سال تھی انھوں نے جو پہلا شعر لکھا تھا اس سے بھی میری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ شعر آپ بھی سن لےجیے :

شاعری کیوں نہ اس آئے مجھے

یہ میرا فن خاندانی ہے

اور پھر جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ۱۹۳۹ء میں ان کی نظم ”ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے“ نے سارے برصغیر میں جذبہ آزادی کی وہ آگ لگائی کہ یہ نظم آج بھی جنگ آزادی کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ خاندانی روایت پر فخر اور جذبہ آزادی کا اظہار یہی وہ دو متضاد دھارے ہیں جن سے جوش کی شخصیت عبارت ہے۔ جوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ خاندانی روایت نے ان کی شخصیت میں جرأت دے رکھی ہے اور پیدا کی اور پسند آشی و ذہنی قوتوں نے ان میں وہی بزرگیاں پر ضرب لگانے کا حوصلہ پیدا کیا۔ جوش صاحب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ :

”میں اپنی قوم کا ایک معبود، مبطون اور مخطوب انسان ہوں اور

اس بنا پر مخطوب ہوں کہ میری قوم کے نزدیک مجھ میں یہ بدترین عیب پایا جاتا

ہے کہ میں اقوال و اساطیر، روایات و ملفوظات، اکلیات و مسلمات اور ایقان و

اعتقاد کو محکم دلائل کی کسوٹی پر کسے بغیر قبول نہیں کرنا۔ تشنگ کو عرفان و
حقائق کی کئی بجھتا، تقلید پر اجتناب کو فوقیت دیتا ہے کجے بوجھے ایمان پر کجے
بوجھے کفر کو ترجیح دیتا ہوں اور کلہ حق کے اظہار و اعلان میں اس بلا نگہ جری
ہوا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے دیکھے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(انکار جوش نمبر ۱۶)

شاعرانہ زندگی میں فکری و تخلیقی سطح پر یہی انداز نظر ان کی کامیابی کا راز تھا اور ذاتی
زندگی میں یہی انداز نظر ان کی ناکامیوں کا سبب تھا۔ ۱۹۳۷ء میں اسی وجہ سے وہ حیدر آباد
دکن سے نکلے گئے۔ اسی وجہ سے وہ ترقی اردو بورڈ کراچی سے الگ ہوئے اور اسی وجہ سے وہ
اسلام آباد میں ڈکھ بھو گئے رہے اور آج حضرت جوش اپنی آخری آرام گاہ میں لیٹے ہوئے اس
طبقاتی شہر کی تہذیبی و تخلیقی زندگی کو اٹھا لائش رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب ہم اپنی معاشرتی
تبدیلیوں کے عبوری دور سے گذر کر انسانی، انسانی اور صوبائی تعصبات سے بلند اٹھ کر فی الحقیقت
روح پاکستان کو جنم دیں گے تو سرزمین اسلام آباد اس عظیم شاعر کی روح کو دوبارہ دریافت
کرے گی اور اس کے کلام کو اپنے سینے سے لگا کر اُسے وہ اہمیت دے گی جس کا ہمہ وجہ وہ
مستحق ہے۔ حضرت جوش شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعر آزادی بھی، وہ شاعر انسانیت
بھی ہیں اور شاعر رومان بھی اور انھوں نے جس طرز پر لفظوں کو رنگ و بو بخشا ہے اور
جس سلیقے سے انھیں تخلیقی سطح پر برتا ہے اس دور کا کوئی دوسرا شاعر اس مرتبے کو نہیں پہنچتا۔
فراق گورکھپوری نے کہا تھا کہ میں جہاں احساس و جذبے کے اظہار کے لیے لفظ ڈھونڈتا
رہ جاتا ہوں جوش انھیں آسانی سے شعر کا جام پہنا دیتے ہیں۔

حضرت جوش کو پہلی بار میں نے اُس وقت دیکھا جب وہ کل ہند شاعرے میں شرکت
کے لیے میرٹھ گئے تھے۔ یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے اور میں اس وقت انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔
ہمارے کالج میں بھی ایک بڑا مشاعرہ ہوا جس میں متعدد مشہور شعاعروں کے علاوہ بھانا اور
جوش بھی موجود تھے لیکن ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ پاکستان گئے اور کراچی میں
مقیم ہوئے۔ ہر تہفے محفل مشاعرہ ہوئی۔ کبھی میرے گھر یا کبھی حسین الحق صدیقی کے گھر پر جس میں

کراچی کے نامور شعرا و شریک ہوتے اور دہرہ ہر کو کھانے کے بعد یہ محفل برخواست ہوتی۔ ان کے ہاں اکثر مہانا ہوتا۔ ایک دن میں اور مولانا اعجاز الحق قدوسی مرحوم ان کے ہاں بیٹھے تھے۔ دہرہ ہر کا وقت تھا۔ قدوسی صاحب کو پیاس لگی۔ ملازم ریفریجریٹر سے ایک بوتل اور گلاس نکال لایا۔ جوش صاحب میری طرف مخاطب ہو کر بولے ”عالمی صاحب! نرم کی بوتل میں پانی؟ غالباً نرم کی بوتل کا خیال انھیں مولانا قدوسی کی سفید ڈاڑھی دیکھ کر آیا تھا۔ اتنے میں مولانا پانی پی چکے تو جوش صاحب بولے :

مولوی نے اپنا واسن سی لیا
آگ کی بوتل سے پانی پی لیا

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ۱۹۵۹ء میں ایرانی سفارت خانے سے دعوت نامہ آیا۔ جوش صاحب، پیر حسام الدین راشدی ایک ساتھ گئے اور میں، مولانا قدوسی اور مبین الحق صدیقی جو بعد میں مغربی پاکستان اسمبلی کے اسپیکر بنے، دوسری گاڑی میں گئے۔ جوش صاحب سفارت خانے میں باہم سے پہلے پہنچا اور ہمارے پہنچنے سے پہلے واپس آ گئے۔ ہم دیر سے پہنچے تھے۔ محفل برخواست ہو چکی تھی۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ہمیں اپنے گھر بلانے میں رات کے دس بجے تھے۔ ہم ان کے گھر پہنچے۔ دیکھ کر بولے ”اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے۔ مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جوش صاحب نے ریڈیو کے مشاعرے سے ”بول اک تارے جمن جمن جمن“ نظم پڑھی تھی اور اس بات پر کہ انھیں مشاعرے میں سب کے بعد پڑھوایا گیا تھا چند مفاد پرست حاسدان کے خلاف اخبار ڈان ”میں خط شائع کر رہے تھے اور ہر قسم کی اہمل باتیں لکھوا رہے تھے۔ میں نے کہا جوش صاحب نظم تو بہت اچھی تھی۔ اس نظم میں تصور انسان الوہیت کے اس دہے پر پہنچ گیا ہے جہاں رنگ و نسل اور قوم و ملت کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ کہنے لگے ”میں نے اسی موضوع پر لکھی ہے لیکن انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ مابعد الطبیعیاتی موضوع سہل ہو کر ہر خاص و عام کے ذہن میں آجائے۔“ اس کے علاوہ اس کے الفاظ اور ساتھ ساتھ بحر جو میں نے استعمال کی ہے، وہ ساری نظم کو موسیقی کر رہی ہے۔“ میں نے کہا ”جوش صاحب! یہ نظم بحر میں لی جلتی ہے۔“ یہ سن کر

انھوں نے آواز دی ”ذرا ہیگ بھیج دو“ جواب میں اندھے آواز آئی ”ابھی تو بھیج کر گئے ہو۔ اب پھر شروع کر دیا۔“ یہ اُن کی ہیگ تھیں۔ راز دارانہ انداز میں جو شخص صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر کہتے سے لے لے ”مادرِ مہربان ہیں۔“ انھیں ہر دم ہماری صحت کا خیال رہتا ہے۔“

جوش صاحب باغ و بہار انسان تھے۔ محفل میں بیٹھتے تو ایسے کہ سب کی توجہ کام کر رہی جاتے اور محفل کو ایسے سمجھاتے کہ سب عالمِ محویت میں آجاتے۔ ساری عمر یونہی بسر کی۔ از سرتاپا شاعر تھے۔ یہی اُن کی زندگی تھی اور یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا۔ روشن دماغ بھی تھے اور وسیع القلب بھی۔ کینہ پروری سے دور اور سچائی کے لہار میں بے باک۔ ادیب و شاعر کی ضروریات زندگی تو عام آدمی کی سی ہوتی ہیں لیکن وہ عام آدمی سے اپنے رویے اور طرزِ عمل میں مختلف ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہاسی معاشرہ اس سے متصادم ہو جاتا ہے۔ جوش صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا اور شاید جب تک یہ نظام موجود ہے ہم ادیب و شاعر کو مفلس و مفلوک احوال دیکھ کر اسی طرح مسرور و شادمان رہیں گے۔ نئی نسل کے نام ان کا پیغام پہنچا۔ آپ بھی اُن کیجیے :

نخواستہ شاعر و شاعر جہاں گئے تقلید یونہی رہی تو بھٹاؤ گئے
جب تک مجھے گم نہیں کر دے بچو کہتا ہوں کہ اپنے کو نہیں پھاؤ گئے

۱۹۳۰ء میں جب جوش ملیح آبادی کا پہلا مجموعہ ”روحِ ادب کے نام سے شائع ہوا تو اکبر الہ آبادی نے لکھا کہ ”آپ نے چشم و دور عمدہ طرزِ بیان پایا ہے۔ ہاسی سوسائٹی میں وہ کراپے خیال اللہ علیہ حرمت افزا ہیں۔“

آج جوش کو ہم نے صرف لفظوں کی گھن گرج کا شاعر سمجھ لیا ہے حالانکہ ان کی شاعری میں وہ تنوع اور وہ رنگارنگی ہے کہ اس صدی کے چند شاعری اُن کے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔
رنگارنگ خاندانِ گیتی مرے کلام کا حیدر طلسمِ خاندانِ گردوں مرے سخن کا شکر

جوش کی وفات پر

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ کسی عزیز ہستی کی موت پر ہونے والے تعزیتی جلسے میں کچھ کہنا اور وہ بھی اتنی جلدی کہ اس عزیز کی وفات کو مشکل سے دو دن ہوئے ہوں اور اہل آنسو بھی ٹھٹھ نہ ہوتے ہوں، یقیناً ایک انتہائی دشوار کام ہے۔ میں کیا کہوں یا مجھے کیا کہنا چاہیے یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ جب گیارہ بجے کی خبروں میں جوش صاحب کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۸۲ء) کی خبر سنی تو یوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر اچانک بجلی گر پڑی ہے۔ مرنا برحق ہے لیکن دلہندوں اور پیاروں کا مرنا ایک ایسا سانحہ ہے جسے یاد کرنے والے ساری عمر آنسوؤں کے ساتھ یاد کرتے رہتے ہیں اور یہ وہ ذخیرہ ہے جو ہمیشہ دستاویز رہتا ہے۔ جوش صاحب ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دوست تھے۔ میرے بھی بزرگ دوست تھے۔ یادوں کی ایک پوری بہت ہے، جو ذہن کے دریچوں سے جھانک رہی ہے لیکن ان یادوں کو دہرانے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ اس وقت ان کو بیان کرنے کی مجھ میں تاب ہے۔ میں تو اس وقت صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جوش صاحب آج ہم میں نہیں ہیں۔ ان کے نہ ہونے سے دنیائے ادب کی ساری محفل سوتی اور اُداس ہے۔ یہ تو وہ موقع ہے کہ ہم صرف آنسوؤں سے اس عظیم انسان کو خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔ جوش صاحب کی موت ایک قومی سانحہ ہے۔

اس کے بعد بھی اگر مجھے کچھ کہنا پڑے تو میں یہ کہوں گا کہ حضرت جوش ہمارے دور کے بڑے عظیم شاعر تھے جنہوں نے اپنی شاعری سے اردو زبان کو نئی بلندیوں عطا کیں اور جنہوں نے اپنے دو ملک و دو عالم کا نظارہ اپنی شاعری میں اس طور پر کیا کہ ان کی شاعری سارے بڑے عظیم پاک و ہند ادیب کی ترہاں بہن گئی۔ بے شک مصلحت سے بے گمانہ اور آزاد خیالی۔ جوش ساری عمر زمانے

سے لڑتے رہے۔ زمانہ ہاتھ ساز تو بازماند ستیزان کا فلسفہ حیات تھا۔ اسی لیے مصلحت پسند منافقین انہیں طرح طرح سے تکلیف دہ کاروائیوں میں مبتلا کرتے رہے۔ جوش صاحب کی جگہ اگر کوئی اور مرد ہو تو ہتھیار ڈال کر صلح کر لیتا اور ان جیسا بن کر چین کی ہانسی بجاتا لیکن جوش ان ساری طاقتوں کو توں سے تنہا ٹھکراتے رہے اور ان کے دئے ہوئے زخموں کو خندہ پیشانی سے پہنتے رہے۔ جوش صاحب کھلے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا اور ان کی اخلاقیات منافقت سے اور ان کی زندگی قول و فعل کے تضاد سے پاک تھی۔ جوش صاحب ایک عہد آفرین شخصیت تھے۔ ایک ایسی شخصیت جو زندگی ہی میں انسان بن گئی تھی اور جن کی شہرت بزرگ عظیم کے حدود سے نکل کر دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ جدید دور کے وہ شاعر تھے جو اپنی زندگی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ ایسے عظیم انسان اور عظیم شاعر روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

جوش صاحب انسان اور انسانیت کے شاعر تھے اور اسی لیے وہ تعصبات سے پاک تھے۔ ان کی شاعری اسی لیے کسی ایک طبقے، ایک علاقے یا ایک فرقے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ ساری انسانیت کے دلوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ جوش کی شاعری نے بزرگ عظیم کی جنگ آزادی میں وہ عظیم کردار ادا کیا کہ شاید ہی بزرگ عظیم پاک و ہند کی کسی بھی زبان کے کسی اور شاعر کے بارے میں یہ بات کہی جاسکے۔ جوش آزادی کے رجحانات تھے۔ انقلاب کی وہ دودھاری تلوار تھے جس نے استعمار و آمریت کے خلاف مقدس جہاد کر کے اُسے لہو لہان کر دیا۔ ان سے بڑا انقلابی شاعر اور زبان نے پیدا نہیں کیا۔ فراق گورکھپوری نے کہا تھا کہ حضرت جوش نازک و لطیف ترین احساسات اور نامعلوم و مبہم جذبوں کو اس طرح آسانی اور خوب صورتی سے بیان کے رشتے میں پرو دیتے ہیں کہ جہاں عجز کلام سے دوسروں کی سانس بھولنے لگتی ہے۔ جوش وہ شاعر ہیں جن کی شاعری نے کئی نسلوں کی آبیاری کی ہے اور اقبال کے علاوہ اس صدی کے کتنے شاعر ایسے ہیں جو اس دائرے میں آتے ہیں۔ انگریز آبادی نے جوش کے پہلے مجموعہ کلام کے بارے میں جس میں بقول جوش "نویس کی عمر سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کا کلام" شامل تھا، کہا تھا کہ "اس وقت آپ کی طبیعت کا جو رنگ ہے اس پر ایک ازل پر توڑ رہا ہے

کاش کسی وقت میں آپ اور اقبال یکجا ہوتے۔
جوش ساری زندگی ایسے آدمی کی تلاش کرتے رہے تا جن کے سر میں مغز ہو اور مغز میں تہو لگا

اور

جن کی فکر تازہ میں ہو اجتہادی باگین
جن کی عقلوں پر نہ ہو بار وایات کہن
جن کے سینے میں ہوں روشن حبِ ملت کے چراغ
دل تو دل، دل کی طرح جن کے دھڑکتے ہوں دماغ

الغرض میرے وطن کو زندگی دے اے خدا

آدمی دے آدمی دے آدمی دے اے خدا

اسی آدمی کی تلاش کرتے کرتے جوش صاحب اپنے معبود حقیقی سے جا ملے رکے ہم سب
بھی روایتِ جوش کی پیروی میں اس آدمی کی تخلیق و پیدائش کے لیے سعی و کوشش کریں جس کی
آرزوئے کر جوش صاحب اب ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔ جوش صاحب
نے کہا تھا:

مذاقِ بندگی عصرِ نو کی تجھ کو قسم

نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

جوش کو یاد کرنے اور خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک مشہور طریقہ یہ ہے کہ ہم عقل کی سطح پر پہنچنا
کو اور جذبہ کی سطح پر حب الوطنی کو اختیار کریں اور دو نام پرستی اور بے جان فرسودہ اقدار سے دامن بچا کر
کسے بڑھتی ہوئی زندگی سے آنکھیں ملانے کا شعور پیدا کریں۔ اسی میں ہمارے مستقبل کا راز
پوشیدہ ہے اور یہی بات ساری عمر جوش صاحب ہم سے کہتے رہے ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے
اور فردوسِ بریں میں مقاماتِ بلند عطا فرمائے۔

جوش کے لطیفے

کسی قوم کی تخلیقی پیماری کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں لطیفوں کی پیدائش کا سلسلہ بند ہو جائے۔ لطیفے کسی قوم کی تخلیقی صلاحیتوں کی تاریخ کے قدموں کے نشان ہیں جن سے ہم اس قوم کی پسند و ناپسند اس کے رویوں، مزاج اور اندازِ نظر کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ ایک طرف وہ لطیفے ہیں جو مجموعی طور پر سادے معاشرے کے مزاج پر روشنی ڈالتے ہیں اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کدھر جا رہا ہے۔ دوسری طرف وہ لطیفے ہیں جو کسی فرد کی ذات سے مختص ہیں اور خود اس شخصیت کی تاریخ ہی جلتے ہیں۔ مولانا حالی نے پہلی بار یادگار غالب میں غالب کے لطیفوں کو کچا کر کے انھیں غالب کی شخصیت کا جزو بنادیا۔ آج ہم ان لطیفوں کے ذریعے غالب کی شخصیت کا اندازہ کرتے ہیں۔ اگر یہ لطیفے نہ ہوتے تو اندازہ کیجئے کہ غالب کی شخصیت کچھ کس قدر مختلف ہوتی؛ لطیفے جذبات، احساسات اور خیالات کا برجستہ اور بر محل اظہار ہوتے ہیں جس میں شخصیت بجز کسی تصنع یا بناوٹ کے کھل کر سامنے آتی ہے۔

جوش صاحب بارغ و بہار آدمی ہیں۔ اُن کے پاس میٹھے تو اُٹھنے کوچی نہیں چاہتا۔ اُن کی ظرافت، اُن کی ذہانت و طباطبائی کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہاں جو چند لطیفے — اور اس لفظ کو میں وسیع معنی میں استعمال کر رہا ہوں — میں نے پیش کئے ہیں اُن سے جوش صاحب کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۱)

۲۱۹۴۴ کی بات ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا

تھا کہ میرٹھ میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے سارے معروف و مشہور شعراء جمع ہوئے تھے۔ بڑا سا پنڈال بنایا گیا تھا۔ دور دور سے لوگ مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ برسوں بعد جوش و جگر ایک ساتھ مشاعرے میں شریک ہو رہے تھے اس بات کی بھی بڑی دھوم تھی۔

مشاعرہ شروع ہوا، اور تقریباً رات کے ڈیڑھ بجے جوش صاحب کی باری آئی۔ جوش صاحب اس رات مشاعرے کی فضا اور ماحول سے اس درجہ مطمئن تھے کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ بس سناتے رہیں۔ انھوں نے رباعیاں سنائی شروع کیں اور سناتے رہے۔ جب وہ اٹھنے کا ارادہ کرتے، لوگ فرمائشیں شروع کر دیتے۔ اور جوش صاحب پھر سنانا شروع کر دیتے۔ جوش صاحب ایک رباعی سناتے، ایک پان کھاتے پھر یک کرتے اور پھر ایک رباعی سناتے۔ یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے سے جاری تھا۔

جب بہت دیر ہو گئی، اور جوش صاحب تھک گئے تو انھوں نے اعلان کیا۔
 ”بس بسی بس اب تھک گئے ہیں۔“

یہ سن کر پیچھے سے ایک شخص کھڑا ہوا۔ ”بنیان کند ہے پر جسم ننگ اور اس نے دور سے چلا کر کہا
 ”ایک اور ہوگی پہلوان! تھوک کے۔“

(۲)

میں اور مولانا اعجاز الحق قدوسی جوش صاحب کے ہاں بیٹھے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ قدوسی صاحب کو پیاس محسوس ہوئی۔ تو کریم پور بکریٹر سے ایک بوتل اور گھلاس نکال لایا۔ یہ شراب کی بوتل تھی جو عام طور پر خالی ہونے کے بعد جگہ کے بھالے کام میں لائی جاتی ہے۔ جوش صاحب میری طرف مخاطب ہو کر بولے۔

”حاجی صاحب! نرم کی بوتل میں پانی؟“

مولانا قدوسی دوسرا گھلاس پی رہے تھے۔ غالباً نرم کی بوتل میں پانی کا خیال انھیں مولانا

قدسی کی سفید دھڑکی دیکھ کر آیا۔

اتنے میں مولانا پانی پنی چکے تو جوش صاحب بولے : ۱۔

مولوی نے اپنا دامن سی لیا

آگ کی بوتل سے پانی پی لیا

اور پھر اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے ہوئے مولانا پر فقرے چست کرنا شروع کر دیئے۔

مولانا ان کے تیس سال پرانے دوست ہیں۔ مولانا کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں : ۲۔

زندوں کو نہ دیکھ چشم کم سے

قدسی ہے یہ قوم نامسلمان

(۳)

آزاد انصاری مرحوم سے آخر آخر میں جوش صاحب کی بیگم ناراض ہو گئی تھیں۔ وہ آتے تو وہ نہ پانی پنی جھینٹیں اور نہ خاطر تواضع کرتیں۔ اس واقعے کے پیچھے ایک اور کہانی ہے جو کبھی سنائی گئی۔

جب شام ہونے لگی اور دو ٹولڈ وقت ملنے لگے تو جوش صاحب کا وقت مے نوشی پہنچا۔ جنھوں نے جوش صاحب کو شراب پینے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد مینا شروع کرتے ہیں۔ بیگم اندر سے برآمدہ گھنٹے کے بعد ایک پیگ بن کر بھیجی رہتی ہیں۔ گھڑی سامنے میز پر رکھ دی جاتی ہے اور ہر پانچ منٹ کے بعد ایک گھونٹ پیجی ہے اور اسی طرح چھ گھونٹوں میں ایک پیگ پیجی ہے۔ جب دو گھنٹے ہو جاتے ہیں اور چار پیگ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ کھانا کھاتے ہیں اور سو جاتے ہیں صبح نو ظہر کے نوکے اٹھتے ہیں۔ ٹہلنے جاتے ہیں، اگر بچوں کے ساتھ ورزش کرتے ہیں اور پھر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ ادھر آٹھ بجے اُردو شعرو شاعری اور دوسرے تخلیقی کام ختم ہوئے۔ ان کی زندگی بہت باقاعدہ

۴۔

یہ ایک ایسی ہی شام کا ذکر ہے۔ آزاد انصاری بھی موجود تھے، آزاد انصاری کی موجودگی

سے بیگم کا پارہ چڑھ گیا اور بہت تقاضوں کے بعد بغیر تیار کئے خراب کی بوتل بھیج دی۔ جب جوش صاحب اس انتقاد میں بیٹھے ہیں کہ سوڈا کئے تو کام شروع ہو۔ مگر سوڈا ہے کہ ذاب آتا ہے نہ جب۔ اگر کچھ بولتے ہیں تو بیگم خفا ہو جاتی ہیں۔ بیگم سے ہر شریف آدمی کی طرح جوش بھی بہت دبتے ہیں۔ کئی دفعہ تقاضا کیا۔ مگر وہ سنی ان سنی کر دیتیں۔ آخر جب بہت دیر ہو گئی تو جوش صاحب نے بیگم کو آواز دی۔

”اللہ کی بندی ذرا یہاں تو آؤ“

یہ سن کر جب وہ آئیں تو جوش صاحب گفتگو کے سے انداز میں بولے :۔

کشتی ہے کوٹھیکم روانی بھی بھیج دو

جب آگ بھیج دی ہے تو پانی بھی بھیج دو

مشاعری ہوئی۔ عمر بھر کا ساتھ۔ خاندانی عورت۔ شعر سننے ہی ہنس پڑیں اور رام

ہر گسبیں۔

(۳)

ابھی کچھ دنوں ایرانی سفارت خانے سے دعوت نامہ آیا۔ جوش صاحب، پیر حسام الدین راشدی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ گئے اور میں، مولانا اعجاز الحق ندوی، مبین الحق صدیقی کے ساتھ۔ وہ سفارت خانے میں ام سے پہلے پہنچے اور ہمارے پہنچنے سے پہلے واپس آگئے۔ ہم جب پہنچے تو محفل برخواست ہو چکی تھی۔ اطلاع ملی کہ وہ مجھے اور مبین الحق صدیقی کو گھر بلا گئے ہیں۔

رات کے دس بجے تھے۔ میں اور مبین الحق صدیقی ان کے گھر پہنچے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر بولے : ”اچھا ہوا آپ لوگ آگئے مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی“

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جوش صاحب نے ریڈیو کے مشاعرے سے ”بول اک تارے جھن جھن جھن“ نظم پڑھی تھی اور اس بات پر کہ انھیں مشاعرے میں سب کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا چند حاسدوں نے ان کے خلاف اخباروں میں خط شائع کرنے شروع کر دیے تھے۔

میں نے کہا "جوش صاحب وہ نظم تو بہت اچھی تھی مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ اس نظم میں
تصور انسان الوہیت کے درجے پر پہنچ گیا ہے جہاں رنگ نسل اور قوم و ملت کا امتیاز
مٹ چکا ہے۔"

بولے "میں نے اسی موضوع پر بھی ہے لیکن انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ بعد الطبعی
موضوع سہل ہو کر ہر خاص و عام کے ذہن میں اتر جائے اور شخص اس سے لطف اندوز ہو۔
اس کے قافیے اس کے الفاظ اور ساتھ ساتھ محر جو میں نے استعمال کی ہے وہ ساری
نظم کو موسیقی کا اثر عطا کر رہی ہے۔"

میں نے کہا "جوش صاحب! یہ نظم خدا پھر سن لی جائے؟"
آواز دی "ذرا بیگ بھیج دو۔"

اس کے جواب میں اندسے آواز آئی "ابھی تو بھیج کر گئے ہو اب پھر شروع کر دیا؟
یہ ان کی جگہ تم ہیں۔"

رازدارانہ انداز میں آہستہ سے بولے "مادر مہربان ہیں۔ انہیں ہر دم ہماری صحت
کا خیال رہتا ہے۔"

(۵)

"ترقی اردو بورڈ کی میننگ ہو رہی تھی۔ بورڈ کا دفتری کام ہی ہوا تھا۔ میننگ
میں جوش صاحب سے ان کی دفتری ضروریات دریافت کی گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک
چپر سنی ایک بابو اور ایک مہتر"

بیر حسام الدین راشدی بولے "جوش صاحب! مہتر کیا کریں گے مہترانی
لے لیجیے۔"

جوش صاحب نے فوراً جواب دیا "ہاں مہترانی بھجوانی۔"

(۶)

تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ مولانا عبدالحمید پٹواری نے جوش صاحب کو مدعو کیا۔ اس زمانے میں جوش صاحب کے ایک مرثیے کی بڑی دھوم تھی۔ یہ محفل صرف اسی لیے منعقد کی گئی تھی کہ جوش صاحب مرثیہ سنائیں گے۔

میں بھی مدعو تھا۔

مرثیہ شروع ہوا اور ختم ہو گیا۔ چائے کی اور ختم ہو گئی۔ لیکن ہاں کا دور دورہ ہے۔ حاضرین بے چین تھے اور میزبان بالکل غافل۔ طرفہ تماشہ کہ میزبان خود مسلسل ہاں کھاتے ہاڑے تھے۔ میں نے مولانا اعجاز الحق قدوسی سے کہا کہ جوش صاحب کے اس مرثیے کے ایک مصرعے کو گریں کر دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

ہاں کھانا اور نہ ہے اس کا کھلانا اور ہے!

جوش صاحب برابر یہی بیٹھے تھے۔ مصرع سن لیا۔ فوراً بولے۔

مالی کٹا کس مذید

(۷)

جوش صاحب بہت جھگڑا کرتے تھے۔ خود اسی دور میں بات بھول جاتے ہیں اور تو اور اپنے اشعار تک بھول جاتے ہیں۔ اکثر میں نے ان کا شعر پڑھنا کئے گئے:

”جیل صاحب! یاد نہیں ہے کہ میر ہے۔ ویسے معلوم میر کی ہوتا ہے۔“

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی سفارش میں پکڑ لایا۔ جب میر سے پاس آئے تو کہنے لگے کہ

”بھئی اتنا تو یاد ہے کہ سفارش کرنی ہے اور ان صاحب کی کرنی ہے لیکن یہ بھول گیا ہوں کہ کیا

سفارش کرنی ہے؟“ ویسے یہ جملہ کہتے وقت وہ جسم سفارش بنے ہوئے تھے۔

مرزا عالم گیر قدر بھی ان کے ساتھ تھے۔ کہنے لگے۔ ”سماں! ایسا پہلی بار ہی نہیں ہوا۔

ایسی دو تین جہینے پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب پکڑ کر لے گئے۔ وہاں جو کچھ کہا وہ سب

’کچھ ان صاحب کے خلاف تھا جن کی سفارش مقصود تھی! شاعر آدمی ہیں! ہر روپے، ہر انگڑاؤ، ہر ادے شاعری چمکتی ہے۔

جو خوش صاحب سے ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ میرے گھر گئے۔ لوگوں نے فرمائشیں شروع کر دیں کسی نے یہ بھی کہا کہ ”چنا جو درگرم“ مسئلہ ہے۔
 کہنے لگے: ”کاپی نہیں لایا“

اصرار کیا گیا کہ ”کچھ اشعار تو زبان یاد ہوں گے؟“
 کہا: ”کہاں یاد ہیں۔ یادداشت اتنی خراب ہو گئی ہے کہ:۔۔۔
 ہم نے اپنی سی کیس بھول نہ دی تھی نہ سنی
 ہاتھ اٹھایا تھا دعا کو کہ دعا بھول گئے“

(۸)

حکومت کی طرف سے ایسی دو سال ہوئے، یہ اعلان ہوا کہ حکومت معذور آدمیوں کی امداد کرے گی۔ یہ خبر سن کر خوش صاحب بولے:
 ”جسٹ صاحب! ادب تو خود سب سے بڑی معذوری ہے۔“

(۹)

پیر حسام الدین راشدی خوش صاحب کے بہت دوست اور بڑے قدردان ہیں۔
 ایک دفعہ خوش صاحب نے پیر صاحب سے کسی کام کے لیے کہا۔
 پیر صاحب معروف آدمی۔ بھول گئے۔

یاد دہانی کے طور پر خوش صاحب نے کافذ کے ایک پُرزے پر صرف یہ لکھ کر بھیجا ہے

حسام الدین بھی غمخیز نکلتے

مرے حق میں ہنسنا ہی نہ لگتے

جواب میں پیر صاحب خود پہنچ گئے۔

(۱۰)

جس زمانے میں "پاکستان رائٹرز گھلڈ" وجود میں آیا ہی تھا کہ میرے سپرد یہ کام کیا گیا کہ میں جوش صاحب کو گھلڈ کا ممبر بنانے کے لیے اُن کے پاس جاؤں۔ "گھلڈ" کے کارکنان کا یہ خیال تھا کہ جوش صاحب میرے کہنے سے ممبر ضرور بن جائیں گے۔

میں گیا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ میں ایک پرچہ لکھ کر فارم اور خط چھوڑ آیا۔ یہ دو دنوں چیزیں انگریزی میں تھیں، جب وہ گھر واپس آئے تو یہ چیزیں نظر سے گزریں۔ اردو کے ادیبوں کی انگریزی زبان میں کارگزاری دیکھ کر چراغ پا ہو گئے۔ فارم پر یہ لکھ کر واپس کر دیا۔

"انگریزے زی میں انجمن کا نام چھاپ کر چڑائی فرموس فرمایا گیا ہو گھلڈ"

زندہ باد انجمن مصنفین پاکستان!

پائندہ باد اردو زبان!!

دخشنده باد جماعت دارایانِ لسان!!

اور اس کے نیچے یہ لکھا تھا:

"حضرت جمیل"

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنرمیں پیکتا ہیں

کیوں ہمیں بناتے ہیں آپ ہم عیاں اپنا

جوش مرحوم

یہ سارا غصہ اس بات پر تھا کہ یہ سب کچھ انگریزی میں کیوں ہے اس بات کا یہ

نتیجہ ہوا کہ جوش صاحب آج تک "پاکستان رائٹرز گھلڈ" کے رکن نہ بننے لگے۔

لوگ ہزار طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر بات صرف یہ ہے۔

(۱۱)

جوش صاحب کو پابندی وقت کا بہت خیال رہتا ہے۔ ایک دفعہ میرا سبیل الحی

صدیقی، مولانا قدوسی، جوش صاحب اور بعض دوسرے احباب کا حیدر آباد جانے کا پروگرام تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ صبح اٹھ بجے چلیں گے تاکہ ٹھنڈے وقت حیدر آباد پہنچ جائیں۔ لیکن سب کو جمع ہوتے ہوتے نو بج گئے۔ اور جب جوش صاحب کے ہاں پہنچے تو دس بجے تھے۔ دو گھنٹے کا انتظار جوش صاحب کے بس کا کہاں تھا۔ جیسے ہی ہم پہنچے تو بچے نے ایک پرچہ لاکر دیا جس پر لکھا تھا:

”میں نے آج بکھن پڑھنے کا کام نہیں کیا، اور اس قدر عجلت کے ساتھ طیارہ کی کڑھیک سو اٹھ بجے ملبوس ہو کر بیٹھ گیا تاکہ آپ کو ایک دقیقہ بھی انتظار کی رحمت نہ گوارا کرنا پڑے۔“

لیکن آپ نہ آنا تھے نہ آئے اور جب شدید انتظار کرتے کرتے میں خود اپنی نگاہوں میں الحق معلوم ہونے لگا تو میں نے ”إِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ“ کا نعرہ لگایا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ تاکہ آپ کو نصیحت حاصل ہو۔ اور آپ آئندہ کسی اللہ کے بندے کو کرب انتظار میں مبتلا فرما کر اسے اپنے کو الحق سمجھنے پر مجبور نہ کریں۔

مرجوم جوش

یہ خط پڑھ کر اس تاخیر سے مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ اور میں سوچنے لگا کہ واقعی بہت بُرا ہوا۔ سارا پروگرام کرکرا ہو گیا۔ میں نے قدوسی صاحب سے کہا کہ ”اب کیا ہو۔ جوش صاحب کو کہاں تلاش کیا جائے؟ ان کے بغیر میں تو نہیں جاؤں گا۔“

اسی اوجھڑائی میں آدھ گھنٹہ گزر گیا۔

ابھی ہم لوگ صلاح و مشورہ کر ہی رہے تھے کہ موصوف گھر کے اندر

سے پر آمد ہوئے اور کہنے لگے :

”کہئے کیسی زحمت ہوئی؟“

اور یہ کہہ کر منہ سے ہونے لگاڑی میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا ہے

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں وہ جوش سے مل کر

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

فیض احمد فیض

میں جذباتِ غم سے اتنا بوجھل ہوں کہ میرے لیے اس وقت شاید یہ ٹکٹو نہیں ہے کہ میں فیض صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کر سکوں۔ لاہور میں، ہر ذمہ کو مشکل کے دل و پھر کے وقت فیض صاحب وقت پا گئے۔ یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کا غم ہماری نسل کو ہمیشہ اسی طرح یاد بن کر ستا رہا ہے گا جس طرح خود فیض صاحب کے اہل خاندان کو۔ تیرے شاید یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا تھا:۔

کن فیضِ ادب تو سوتا ہے لے چشمِ گریہ ناک
مکانِ دھکولِ مشہر کو سیلاب لے گیا

جانے والے چلے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کو نہیں آتے لیکن ان کی یادیں اور ان کے کام ہمیشہ زندہ و باقی رہتے ہیں۔ فیض صاحب ایک بڑے شاعر اور ایک بڑے انسان تھے جو برسوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں۔ جب میں ان کا طالب علم تھا تو اس وقت بھی فیض صاحب میرے محبوب شاعر تھے اور کبھی جب طالب علم کے زمانے کو کئی جنگ بیت گئے، فیض صاحب میرے محبوب شاعر ہیں۔ اتنے عرصے کسی شاعر کا محبوب رہنا کوئی معمول بات نہیں ہے۔ شاعر تو عمر کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ آج جو محبوب ہے فردی نہیں ہے کہ وہ کل بھی محبوب رہے لیکن بڑے شاعر جب ایک دفعہ محبوب ہو جاتے ہیں تو وہ ہمیشہ محبوب رہتے ہیں۔ فیض صاحب ایک ایسے بڑے شاعر تھے۔

فیض صاحب کا اور میرا کم و بیش چالیس سال کا تعلق تھا۔ میں نے کھانا شروع کیا تو اپنا پہلا مضمون فیض احمد فیض کی شاعری پر لکھا جو ۱۹۴۸ء میں صدر شاہین و ممتاز شیرین کے نیا دور

میں شائع ہوا۔ اس وقت تک فیض صاحب کا ایک ہی مجموعہ "نقشِ فراہی" شائع ہوا تھا۔ ان کا باقی کلام سب میرے زمانہ شعور میں شائع ہوا اور جب بھی شائع ہوا میں نے شوق سے پڑھا اور نطفہ اندوز ہوا۔ پچھلے دنوں ان کا تازہ کلام ایک صاحب نے لاہور سے بھیجا۔ پڑھا تو محسوس ہوا کہ فیض صاحب ہمیشہ شاعرِ کرب بھی تازہ دم ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت اب بھی شاعری کا صور کھونک رہی ہے۔ ابھی چند ماہ قبل فیض صاحب میرے گھر تشریف لائے تھے۔ محفلِ سماعت تھی۔ رات گئے تک بیٹھے رہے اور نطفہ اندوز ہوتے رہے۔ اسی وجہ سے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر سگریٹ چھوڑ چکے تھے۔ لیکن بظاہر صحت ابھی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی وہ اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔

فیض صاحب جیسے شریف النفس انسان میں نے کم دیکھے ہیں۔ نہ شکوہ، نہ شکایت، نہ دشمنی، نہ انتقام، سب کو گلے لگانے کے جذبے سے سرشار اور اپنی ذات میں گم۔ اگر انسان دنیا کو لانتہا کائنات کے تعلق سے دیکھے تو وہ وسیع المشرب ہو جائے۔ تنگ نظری سے دور اور تنگ دلی سے پاک۔ فیض صاحب ایک ایسے ہی وسیع القلب عظیم انسان تھے۔ ایسے انسان جن سے انسانیت کا بھرم قائم ہو نہ سکے۔

تجے مشہور کہ کم لوگوں کو زندگی میں اتنی شہرت میسر آتی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ پچھلے دنوں چینی ارمیوں کا وفد کراچی آیا تو بطور تعارف انھیں بتایا گیا کہ اس جلسے میں ملک کے نامور ادیب و شاعر موجود ہیں۔ یہ سن کر وفد کے سربراہ نے ہجرت سے پڑھ چکا کہ کیا اس میں فیض بھی موجود ہیں۔ وہ حرفِ فیض صاحب ہی کو جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اردو زبان کے عظیم شاعر ہیں۔ عظیم ہیں وہ لوگ جو عظمتوں کے اس رعبے کو پہنچتے ہیں۔ فیض صاحب اردو کے وہ واحد شاعر تھے جو صحیح معنی میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ جن سے پاکستان کی قومی زبان کا رتبہ بڑھا اور جن سے عظمتوں کے نئے پہاڑ بنے۔ سچ فیض احمد فیض ہم میں نہیں ہیں اور آج ان کے بغیر ہم اس لیے تنہا رہ گئے ہیں کہ اب ان کی جگہ لینے والا بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک ایسا الہیہ ایک ایسا آہنگ دیا جس میں اردو شاعری کی روایت بھی بول رہی تھی اور عہد حاضر کی روح

بھی۔ یہی اہم جان کی پہچان تھا جس میں عوام کا جذبہ کرب بھی شامل تھا اور ان کی قوت بھی جس میں
 دکھی انسانیت کا انورہ بھی موجود تھا اور آنے والے دور کا نغمہ بھی۔ فیض احمد فیض اسی نئے شعور
 کے نامزدہ شاعر تھے۔ وہ شعور جس سے زندہ قومیں اپنی فکر کے تار و پود نکالتی ہیں۔ فیض صاحب
 اسی لیے کرج بھی عظیم ہیں اور کل بھی عظیم رہیں گے۔ انھوں نے اردو شاعری پر لازوال نقوش ثبت
 کیے ہیں۔ ان کا دل عشق کی آگ سے روشن تھا۔ اور یہی روشنی ان کی شاعری کی روشنی تھی۔ ان
 کی وفات سے شاعری کی کوکھ گھٹی ہے لیکن شعور کی وہ روشنی جو انھوں نے عوام اور معاشرے
 کے دلوں میں پیدا کی ہے وہ ہمیشہ ساری دکھی اور غریب انسانیت کو منزل کا راستہ دکھاتی
 رہے گی۔ فیض صاحب کا پیغام آفاقی تھا۔ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ کرج آفاقی
 شاعری کا یہ دیوتا ہم سے منہ موڑ کر چلا گیا ہے لیکن اس دیوتا کا پیغام آنے والی نسلوں کو اپنی
 شاعری کی تخلیقی عظمتوں سے ہمیشہ گرویدہ بنائے رکھے گا۔ فیض کی وفات سے اردو شاعری
 کا وہ عظیم دور جو اقبال سے شروع ہوا تھا اب جوش ملیح آبادی کے بعد فیض احمد فیض پر ختم
 ہو گیا۔ اب ہم سدا اس باب کو پڑھتے رہیں گے اور فیض کی ذہنی نگری، تخلیقی اور سماجی
 صلاحیتوں کی تقریظ لکھتے رہیں گے اور انھیں برسوں۔ برسوں یاد کرتے رہیں گے کرج بھی اؤ
 آنے والے زمانے میں بھی :

یوں تیر تو غم اپنا برسوں کہا کریں گے

اب رات کم ہے سوؤ اس ہونچکی کہانی

فیض صاحب کی زندگی کی کہانی بس غرور ہونچکی ہے لیکن آنے والے دور کا داستان گو اس کہانی
 کو ہمیشہ بیان کرتا رہے گا۔

فیض احمد فیض

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو منگل کے دن دوپہر کے وقت لاہور میں فیض احمد فیض وفات پا گئے۔ یہ خبر شعلے کی طرح اٹھی اور سارے پاکستان میں اور پاکستان سے باہر ساری دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ انتقال کے وقت فیض صاحب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر تھے اور اب ان کے بعد ان کے قدا اور ان کی شہرت کا کوئی دوسرا ادیب و شاعر دور و دور نظر نہیں آتا۔ فیض کی وفات اسی لیے ایک سانحہ بھی ہے اور المیہ بھی۔

فیض احمد فیض نہ صرف ایک بڑے شاعر اور دانشور تھے بلکہ ایک بڑے انسان بھی تھے۔ دھیمے مزاج کے فراخ دل انسان۔ بہت کم عمر کے آخری حصے میں شہرت کی معراج کو پہنچے ہیں۔ فیض ابتدائی دور سے مشہور ہوئے اور ان کی شہرت طالع آفتاب کی طرح مسلسل بڑھتی رہی اور جب وفات پائی تو ان کی شہرت نصف النہار پر تھی اور وہ لاکھوں کمرؤروں انسانوں کے محبوب شاعر تھے۔ وہ شاعر جوان کے دلوں کی ترغبات کرتا ہے۔ ان کے بے نام جذبوں اور گونگے احساسات کو زبان دے کر نیا شعور اور نئی آگہی دیتا ہے۔ فیض کی شاعری میں عوام کا جذبہ کرب بھی شامل تھا اور ان کی قوت بھی۔ اس میں دکھی انسانیت کا نوحہ بھی موجود تھا اور آنے والے دور کا نغمہ بھی۔

بڑے شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے دور میں بڑے ہوتے ہیں لیکن جب وہ دور ختم ہوتا ہے اور رجحانات بدلتے ہیں تو ان کی شہرت کا سورج بھی دونوں وقت ملتے ہی غروب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دور کے ساتھ جیتے ہیں اور اپنے دور کے ساتھ

ہی مہ جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے بڑے شاعر وہ ہیں جو اپنے دور کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے دور کو کٹنے والے دور سے ملا بھی دیتے ہیں۔ فیض احمد فیض دوسری قسم کے بڑے شاعر تھے۔ وہ آج کے بھی شاعر تھے اور کل کے بھی۔ یہی ان کی عظمت ہے۔ فیض کی شاعری کا اپنا مخصوص آہنگ اور اپنا مخصوص لب و لہجہ تھا۔ اس لہجے میں اردو شاعری کی روایت کا حسین ماضی بھی شامل تھا اور زمانہ حال کا شعور بھی۔ فیض نے روایت ماضی کو حال میں جذب کر کے نئے مستقبل سے ملا دیا۔ اسی لیے فیض کی شاعری اپنے زمانے کی دھڑکنوں کو کٹنے والے زمانوں کی دھڑکنوں سے ملا کر اس نئی شاعری کی تخلیق کرتی ہے جو ان کی پہچان ہے۔ مداموں کا یہ خوب صورت استخراج کبھی کبھار دھڑکنوں میں آتا ہے۔ فیض اسی نئے استخراج کے نمائندہ تھے۔

فیض جبر و استحصال کے دشمن تھے۔ عدل و انصاف کے داعی تھے۔ عوام کو انسانی قوتوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ وہ عوام جہن سے قوتوں کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں۔ صنعت و حرفت پہلنے پہلنے مچتی ہیں اور زندگی کے چشے پہلنے لگتے ہیں۔ ان کی شاعری عوام کی اسی قوت کی ترجمان ہے۔ وہ قوت جو مستقبل کی حقیقی قوت ہے۔ جو قوموں کو بلند و بالا اور انہیں سرخرو کرتی ہے۔ فیض کی وفات سے شاعری کی کونجھ گئی ہے لیکن شعبہ کی رہنمائی جو انہوں نے عوام اور معاشرے کے دلوں میں پیدا کی ہے، ساری دھڑکی انسانیت کو ہمیشہ منزل کا راستہ دکھاتی رہے گی۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

فروغ نگلشن و صوبت ہزار کاموسم

فیض صاحب اسی لیے ساری عمر مجھے عزیز و محبوب رہے۔ چند ماہ پہلے میرے گھر آئے اور رات گئے تک بیٹھے رہے۔ اپنا نیا کلام سنایا اور پھر فرمائش پر پرانا کلام بھی سنایا۔ ان کی پرانی شاعری سے تازگی کی وہی خوشبو آ رہی تھی جتنے کلام سے آ رہی تھی۔ ان کی تخلیقی قوت ابھی آج بھی اسی طرح تازہ و زندہ تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فیض صاحب کے ٹھٹھنے کا انداز اچھا نہیں تھا لیکن مجھے ان کا کلام خود ان کی زبان سے سن کر ہمیشہ اچھا لگا۔ اس موقع پر شعر کی معنویت

اور لہجے کے بہت اس طرح کھٹے محسوس ہوتے تھے جیسے نیم سحری سے بندھکیاں غٹے، اور غٹے پھول ہی جاتے ہیں۔

فیض کی وفات کے ساتھ اردو شاعری کا ایک عظیم دور ختم ہو گیا۔ یہ ایک ایسا عظیم دور تھا جس پر ہر زبان اور اس کی تاریخ فکر کر سکتی ہے۔ یہ افتخار بیسویں صدی کی بہت کم زبانوں کو حاصل ہے۔ اس دور نے اردو زبان کو دنیا کی جدید زبانوں میں بلند درجہ دیا اور اس عظیم دور کی تاریخ میں فیض کا کلام ممتاز دنیا یاں ہے۔

فیض کی شاعری نئی نسل کے شاعروں کو ایک سبق بھی دیتی ہے اور وہ سبق یہ ہے کہ وہ شاعر جو اپنی روایت سے کٹ کر دوسری زبانوں کی شاعری کی پیروی کرتے ہیں اپنی تاریخ کے تخلیقی ستونوں سے کٹ کر بے جان اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کا رشتہ اس زبان کی تہذیبی روح اور تخلیقی روایت سے ہمیشہ گہرا اور استوار رہے جس زبان میں وہ شاعری کر رہے ہیں اور اس زبان کی روایت کی تخلیقی قوت ان کی شاعری کا اصل جوہر ہو۔ فیض نے اپنی شاعری میں یہی کام کیا اور روح عصر کو اردو شاعری کی تہذیبی روح اور روایتی اصناف میں سمو دیا۔ اسی لیے وہ آج عظیم شاعروں کی صف میں کھڑے ہیں۔ اب فیض ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کی کہانی بس ہو چکی ہے لیکن کہنے والے دور کا داستان گو اس کہانی کو نئے نئے انداز سے ہمیشہ بیان کرتا رہے گا۔ معصوم کا ایک شعر ہے :

جن کی باتوں سے کبھی ہوتی تھی نکتہ فیکین دل
رہ گئے تنہا ہم اور وہ آشنا جاتے رہے

فراق گورکھپوری

شاعروں اور ادیبوں کی وہ نسل جس نے میری ذہنی پرورش کی تھی تیزی سے رخصت ہو رہی ہے۔ ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو حضرت جوش ملیح آبادی ہم سے رخصت ہو گئے۔ ابھی یہ زخم تازہ تھا کہ ۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو حضرت فراق کی سناٹنی آگئی۔ ایک قلم ہے جو چلا جاتا ہے۔ ایسا قافلہ جس کا ہر فرد میر کا مدعا ہے:

قافلہ قافلہ چلتے ہیں چلے کیا کیا لوگ

نیر غفلت زدہ حیران سے کیا پیٹھے ہو

جب جوش کا انتقال ہوا تو فراق صاحب اسپتال میں تھے۔ خبر سنی تو آواز نہ دے گئی اور کہا۔ ”آج جوش کے مرنے کے بعد میں ماتم کرنے کو رہ گیا ہوں۔ یہ خبر میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ہے۔“ چند ہفتے قبل جب فراق صاحب کسی نے پوچھا کہ آج کے دور میں سب سے بڑا شاعر کون ہے تو انھوں نے جواب دیا۔ ”جوش اور صرف جوش اس جہان میں جوش کی شاعرانہ عظمت پر روشنی پڑتی ہے وہاں اُس شریفانہ فرائض دلی کا بھی پتا چلتا ہے جو اس نسل کے مزاج کا ایک حصہ تھی۔ ایک بار جوش ملیح آبادی اپنے ہم عصروں کی طبائی دذہانت کا ذکر کر رہے تھے۔ جب فراق صاحب کا ذکر کیا تو جوش نے کہا کہ ”فراق دلتوار ہے نہ خنجر نہ چکر۔ یہ شخص فقط دھار ہی دھار ہے۔“ غور کیجئے کہ کیا ہماری نسل کے شعرا و ادبا بھی ایک دوسرے کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں؟ یہ لوگ رشک کے پرستار تھے اور ہم حسد کے مریض ہیں۔ جیسے جوش اس دور میں قلم کے سب سے بڑے شاعر تھے اسی طرح فراق صاحب اس دور میں غزل کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ جوش کی طرح فراق نے بھی اپنی زندگی میں ایک کلاسیک

کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ گزشتہ چالیس برس میں ایسا کون سا قابل ذکر شاعر ہے جس نے فراق کا اثر قبول نہیں کیا۔ فراق کی ذہانت و طباعت نے ان کے انداز نظر نے ان کی صاف ستھری فکر نے ان کے زبان و بیان نے اردو شاعری کے رنگ و آہنگ کو ایسا نکھار دیا کہ جدید دور کی رو بہ فراق کی غزل میں دھڑکنے لگی۔ فراق نے اردو غزل کی روایت کو ایک نیا رخ دیا اور اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا مگر اس صدی کی اردو شاعری کا احاطہ کیا جائے تو اس میں ائمہ آبادی اور اقبال کے علاوہ جن شاعروں کی آوازیں نمایاں ہیں ان میں بھی جو خوش اور فراق کی آوازیں سب سے اگلی سب سے نمایاں اور منفرد ہیں۔ فراق نے نثر اور نظم دونوں سطحوں پر اہم کام انجام دیئے۔ ایک طرف انھوں نے اردو شاعری کی روایت کو نیا رخ دیا اور دوسری طرف تاشرائی تنقید کے بہترین نمونوں سے اردو تنقید کو ایک نیا رخ دیا۔ فراق ایک آزاد خیال مفکر تھے۔ انسان ان کی فکر کا مرکز و محور تھا اور احساس جمال کا حجرہ ان کی شاعری کا شعور تھا۔ فراق صاحب نے کہیں کہا تھا کہ "شاعری معنی شاعری کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے لیے وجدان کی ایک ریاضت ہے۔ بلند شاعری ایک ایسا جمالیاتی شعور پیدا کرتی ہے جو قومی زندگی کو بیک وقت گہرا اور اونچا بنا دیتی ہے۔ اور تو نا و طاقتور بھی اور اسی شعور سے بار و حوائی عالم سے عمل کے سرچشمے بھومٹے ہیں۔ بڑی شاعری میں گہری سے گہری بات معصومیت کا روپ دھارتی ہے۔" فراق صاحب کی شاعری نے اردو شاعری کو یہی رخ دیا جو نیا بھی تھا اور خوب صورت بھی۔

کہاں ہر ایک سے بار نشاط اٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی جنت کے سرگئی ہوں گی

یہ عظیم شعر جس عظیم شاعر نے کہا تھا آج وہ دنیا سے اٹھ گیا ہے اور ہم لوگ اسی عظیم ہستی کو خراج عقیدت و تحنیں پیش کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ فراق اردو ادب کا ایک عظیم نام ہے۔ فراق ایک سچے سچے پاک اور شاعری کی نئی روایت کا ایک عظیم نام ہے۔ فراق اردو تنقید کا بھی ایک عظیم نام ہے۔ اس دور میں جب ہندوستان میں اردو کو سرسری کے عالم میں سسک رہی تھی فراق وہ عظیم نام ہے جس نے اس زبان کے خون و جمال کے گیت گھلے

کسی زبان کو مٹانا قتل اور خون کے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ اردو کا مٹانا تو قتلِ عام کے بھی میں زیادہ سنگین جرم سمجھتا ہوں۔ یہ تو ماضی حال اور آئندہ کی نسلوں کے قتل کے برابر جرم ہے۔ جہدِ کثرتِ مندی پرستوں نے حکومت اور تعلیمی اور دیگر افسروں کی مدد سے اردو کو قریب قریب مٹا ڈالا ہے ان کی اس کارروائی کے متعلق میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کی یہ حرکت اس سے کم منکر وہ حرکت نہیں ہے جو ہٹلر نے یہودیوں کی پوری قوم کو ذبح کر کے کی تھی۔ آج مجھے ہر ہندی حمیرے اردو کے خون سے رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہماری حکومت نے بھی مجرمانہ تساہلی اور چشم پوشی سے اس معاملہ میں کام لیا ہے اور حکومت کے کئی ہا اقدار و ذریعوں اور عہدہ داروں نے اردو کے قاتلوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ میں پھر بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اردو و مثالی نہیں جاسکے گی۔ اس وقت مثالی تو اردو جا رہی ہے لیکن مٹ رہی ہے۔ ہندی اور اس صدی کے ختم ہوتے ہوئے وہ ہندی سارے ہندوستان سے مٹ جائے گی اور کم سے کم اُتر پردیش سے مٹ جائے گی جس کی بنیاد اب سے سو برس پہلے رکھی گئی تھی۔ کھڑی بولی کو بد صورت بنا کر اردو ہندی میں نہایت پھوپھڑ اور بد صورت اور قابلِ نفرت تصنیف بازی تخیلی شرن گیت، اپنت، انزالا، پرشاد اور جھا دیوی نے کی۔ یہ چٹاتی ہندی درخواست کے چھنے سے نیچے آکر سکتی ہے اور نہ خواص کے۔ یہ صرف کتابوں میں دفن رہے گی۔ اسے تو ہم چلنا پھرنا سارے جہاں نہیں کہہ سکتے بلکہ ایک دفن شدہ مڑی ہوئی لاش کہہ سکتے ہیں۔ اردو کے دشمن ابھی طرح اپنے دل میں جلتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہے اور سب سے زیادہ خوب صورت۔ اور لطیف بھی۔ اردو دشمنوں کو حقیقتاً اپنے گنوار پن پر غصہ آتا ہے۔ اردو کو مٹانے کے کثافت لطافت کو کہیں معاف نہیں کرتی :

یہ فراق کے الفاظ تھے۔ اس دور میں جب چاروں طرف سے اردو کے غلام آواز دیا
 اٹھ رہی تھیں، فراق صاحب نے اردو والوں میں ایک نئی روح پھونکی اور ان کی حق پرست
 آواز دوسری آوازوں کے ساتھ مل کر اردو زبان کو زندہ و سلامت بچا کر ۱۹۸۲ء تک لے
 آئی اور آج اردو دوبارہ اپنی حیات لو کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ مستقبل پر نظر جمائے
 ہوئے ہے۔

فراق اس دور کی روح کی آواز تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ مجسم ذات و
 نشاط تھے۔ اور اپنی خوش دلاء طبیعتی باتوں سے وہ سنسنے والوں پر ایسے گہرے نقوش چھوڑتے
 تھے کہ خود فراق صاحب ان کی ذات و شخصیت کا حقد بن جاتے تھے۔ جن لوگوں نے فراق
 صاحب کو دیکھا ہے، ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوئے ہیں، ان کی صحبتوں میں بیٹھے ہیں
 وہ اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ فراق صاحب سے ملنا ایک یادگار واقعہ ہوتا تھا۔
 فراق صاحب نے کہا تھا:

آنے والی نسلیں ہم پر رشک کریں گی ہم عمرو

جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا تھا

اور خواتین و حضرات! میں نے بھی فراق کو دیکھا تھا۔ اس زندہ فراق کو جو آج ہم میں نہیں ہے:

ہمید اکہاں ہیں ایسے پر آگندہ طبع لوگ

شاید کہ تم کو میرے صحت نہیں رہی

غلام عباس

۱۹۸۲ء کا یہ سال ادیبوں اور دانشوروں پر سخت اور بھاری گزرا۔ جوش ملیح آبادی گئے اور اپنے ساتھ اردو شاعری کی ایک روایت لے گئے۔ فراق گورکھپوری گئے اور اپنے ساتھ لہند و غزل اور دانشورانہ تنقید کی ایک روایت لے گئے۔ میر حسام الدین راشدی گئے اور اپنے ساتھ تاریخ سندھ کی روایت لے گئے۔ طارق مستور گئیں اور اپنے ساتھ اردو افسانے اور ناول کی ایک روایت لے گئیں اور دوسری نومبر کی درمیانی شب کو اردو کے منفرد افسانہ نگار غلام عباس کو بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے اور اپنے ساتھ اردو افسانے کی کلاسیکل روایت لے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بظاہر کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ اچھے اور صحت مند تھے۔ یکم نومبر کو دن میں گیارہ بجے کے قریب مجھ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ کہنے لگے جمیل صاحب مجھے دو دن اور ویدیہ کیے "نوجوان انسانہ نگار کے نام خط" کے چند صفحے رو گئے ہیں۔ بس جمعرات کو لے لیجئے۔ رات کو ایک بجے کمانڈر الاؤ کا فون آیا۔ بتایا کہ عباس صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر یہ تو بچکا تھا اور جب میں جمعرات کو ان کے سوگ میں شریک ہوا تو مجھے یاد آیا کہ سہی وہ دن اور وقت تھا جب مجھے عباس صاحب سے ملنا تھا۔ مگر وہ تو جا چکے تھے۔ وہاں جا چکے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا:

رہنے کی کوئی جاگہ شاید نہ تھی انھوں کی

جو یا اسے اٹھ گئے ہیں بے لکڑ کھوئے آئے

غلام عباس صاحب ایک شریف النفس کم گو اور مہربان مہذب انسان تھے۔ لکھنا پڑھنا ان کا اور بھنا بکھنا تھا اور خاموشی سے آہستہ آہستہ کام میں لگے رہنا ان کی زندگی کا بہتر نمونہ نہ

مگر وہ بندی سے دل چسپی، متعلقات عامہ سے سروکار نہ کیا۔ یہاں کی زندگی تھی اور اسی بے نیازی کی وجہ سے عباس صاحب نے اردو زبان کو ایسی عظیم کہانیاں دیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ آنندی اکتبہ، جوادی، اور کوٹ، سایہ کن رس، حمام میں اس کی بیوی، بدو، فروغ وغیرہ وہ کہانیاں ہیں جو گزشتہ کل کی طرح آج بھی اور آج کی طرح آنے والے کل میں بھی دل چسپی کے ساتھ پڑھی جاتی رہیں گی۔ سہائی امر ہے اور سہائی کا انعام خود تحریر کو بھی امر بنا دیتا ہے۔ غلام عباس صاحب نے زندگی کے سمندر سے سچا پلو کے ایسے ہی موتی چن کر انھیں خوب صورت ہار کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ وہ بھی اسی لیے امر ہیں۔

غلام عباس صاحب سے میری ملاقات کی عمر تقریباً تیس سال سے۔ ۱۹۵۳ء کی بات ہے اور یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ لندن سے نئے نئے واپس آئے تھے اور پہلی ملاقات ہی میں ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۸۲ء کے درمیان تعلقات و دوستی میں کوئی کشیدہ آیا اور نہ کوئی ایسی بات ہوئی کہ دلوں کی کلی مرجھا جائے۔ بہت سے واقعات ہیں جو میرے حلقے میں محفوظ ہیں۔ ہمارے دل کی ایک بات ہے جو میرے ذہن کے درجوں پر دستک دے رہی ہے لیکن ان کے بیان کا نہ یہ موقع ہے اور نہ محل ایسا وقت تو ہم غلام عباس صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے دل ان کی جدائی سے بھاری ہیں۔ ہماری آنکھیں ان کی وفات سے پر غم ہیں اور ہمارا وجود ان کی موت پر توجہ کثافت ہے۔ میں تو اپنے بچپن سے عباس صاحب کو جانتا تھا جب وہ بچوں کے رسالے پھول لاہور کے ایڈیٹر تھے۔ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور رسالہ پھول کا خریدار تھا۔ کچھ عرصے بعد نے دیکھا کہ غلام عباس صاحب کا نام اب بحیثیت ایڈیٹر رسالے پر آنا بند ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے نام کو رسالہ پر نہ دیکھ کر مجھے انتہائی حلال ہوا تھا اور میں نے رسالہ پھول کو ایک خط بھی لکھا تھا۔ یہ بات تو بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ پھول رسالے سے الگ ہو کر اسی زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اسکول کی لائبریری سے لے کر میدانے "انحراف"

افسانے پڑھے تھے اور یہ دل میں اترنے والی ایسی خوب صورت کہانیاں تھیں کہ ان کے مجرّد حسین نقوش کن بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ ”مجسمہ“ ۱۹۳۴ء میں ”کاروان“ لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے بچوں کے لیے ان کی کئی کتابیں جاپانی اور دوسری کہانیاں، چاند کی بیٹی، ٹریا کی گڑیا، برف کی بیٹی، انمرا کے افسانے وغیرہ شائع ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنا زندہ جاوید افسانہ ”آئندہ“ لکھا۔ اسی نام سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۸ء میں ”مکتبہ جدید لاہور“ سے شائع ہوا اور پھر ۱۹۶۰ء میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ”جائزے کی چاندنی“ کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں جزیرہ سمندران دہلی سے شائع ہو چکا تھا۔ کن رس کے نام سے ان کا ایک اور مجموعہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ غلام عباس صاحب نے جو کچھ لکھا وہ منتخب ہے۔ غلام عباس صاحب کو صحیح معنی میں خراج عقیدت پیش کرنے کا اب واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کی ساری کتابوں کو مرتب کر کے شائع کریں تاکہ اب جب عباس صاحب ہم میں نہیں ہیں ہم اور کئے والی نسلیں ان کی کتابوں کے مطالعے سے انھیں یاد کر سکیں اور تاریخ ادب میں ان کے صحیح مقام کا تعین کر سکیں۔

غلام عباس صاحب ہمارے وہ افسانہ نگار تھے جو اپنی زندگی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ وہ دھیمے مزاج کے انسان تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کی کہانیوں کا مزاج ہے۔ غلام عباس نے مسافری افسانے نہیں لکھے بلکہ ان انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں جو آفاقی اور ابدی ہیں اور اسی لیے ان کے افسانے وقت کے ساتھ اپنی دل چسپی نہیں کھوٹتے بلکہ اسی طرح تازہ و زندہ رہتے ہیں جس طرح وہ اس وقت تھے جب لکھے گئے تھے۔ ان کے افسانوں کا ”خاتمہ“ بھی ہوتا ہے اور نقطہ عروج بھی اور ایسا گہرا اثر چھوڑتا ہے کہ پڑھنے والا حیرت و استعجاب کے ساتھ ان کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ ان کی اپنی زندگی کا افسانہ بھی پہلی اور دوسری نمبر کی درمیانی شب کو ایک ایسے ہی نقطہ عروج پر ختم ہوا۔ وہ خوش و غرم اپنی جوی سے تھیں کہ آٹا خانہ میں وہ ہو گیا جس کی امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ غلام عباس اس دنیا سے جا چکے تھے اور یہاں پہنچی کر ان کے

ایک افسانے ”دو تاشے مکے“ یہ آخری جملے یاد آرہے ہیں۔

”ابن مرزا صاحب“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”آپ رورہے تھے؟“
 ”نہیں تو“ مرزا نے بھڑائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ”آنکھوں کو ذرا
 سگریٹ کا دھواں لگ گیا تھا۔۔۔۔۔ ارے بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سرکار ایسے
 دردناک قلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے؟“
 اور شاید اس وقت میری آنکھوں کو بھی سگریٹ کا دھواں لگ گیا ہے۔

(۶ نومبر ۱۹۸۲ء)

~~~~~

## رئیس احمد جعفری کی خدمات

سید رئیس احمد جعفری نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو وفات پائی۔ اس طرح آج ان کی وفات کو سولہ سال سے ایک دن اوپر ہو گیا ہے اور مرنے کے سولہ سال بعد تک کسی لکھنے والے کا اس طرح زندہ و باقی رہنا کہ آنے والی نسلیں اس کا نام احترام سے لے کر اس کی تحریروں سے استفادہ کریں اس بات کا اشارہ ہے کہ رئیس احمد جعفری کی تحریروں کا ایک حصہ یقیناً ایسا ہے جو وقت کی حدود سے گزر گیا ہے یا گزر رہا ہے۔ رئیس احمد جعفری ایک اچھے انسان تھے۔ کم گو اور کم آمیز۔ اچھے علمی و مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ریاض خیر آبادی کے نوے تھے۔ ایسے زور نویس کہ مطبوعہ صفحات کتب کی تعداد کے اعتبار سے شاید ہی ہم دوسرا نام لے سکیں۔ جو کام کیا جلدی کیا اور جم کر کیا۔ سید سے ساونے۔ نہ ٹیم ٹام، نہ دکھاوا، نہ شہرت سے مغرور ہوئے اور نہ دولت سے مغرور ہوئے۔ میں نے ہمیشہ انھیں خیر والی میں ملیں پایا۔ یا انھیں کہ شیر والی کے سارے بن کہیں بند کیے ہوں۔ حسرت موہانی کے معتقد مولانا محمد علی جوہر کے عاشق۔ خود دار بھی اور خدا ترس بھی۔ کھلا کر خوش ہونے والے اور دوست احباب کی خدمت کر کے شکر بھیجنے والے خادم اسلام اور خادم قوم۔ ان موصوفات پر جب بھی لکھا دل نکال کر رکھ دیا۔ ساری عمر لکھتے رہے۔ نہ جلسے نہ جلوس۔ نہ کسی پلیٹ فارم سے وابستہ۔ جو کچھ کہا یا لکھا کر لیا۔ دولت بھی اور شہرت بھی نہ ہی لکھنے والے کی منزل ہے۔ جس نے ایسا کر کیا وہ منزل تک پہنچا۔ جو انھیں بازی میں اٹھارہ۔ آہیں کا نہ رہا۔ کام کرنے والے کو کبھی جیتے ہیں اور کام نہ کرنے والے جیتے ہوئے بھی مر جاتے ہیں۔ ہرجیت، کامیابی، ناکامی کاپتا اُس وقت چلتا ہے جب پیروں تلے سے زمین

نکل چکتی ہے۔ اس لیے نئی نسل کے لکھنے والوں کو عبرت پکڑنی چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ کام ہی زندگی ہے اور کام ہی کامیابی ہے۔ اصل زندگی اشارے سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ اشارہ جو کسی مقصد کے لیے کیا جائے اور وہ کامیابی جو اس مقصد کو حاصل کرنے سے حاصل کی جائے اور لکھنے والا کہہ سکے عہد

شادمان زندگی خویش کرکارے کردم

سید رئیس احمد جعفری کی زندگی سے یہی پیغام حیات ملتا ہے۔

رئیس احمد جعفری صاحب کے بارے میں ایک بات میں اختصار کے ساتھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ رئیس احمد جعفری ایک اچھے ادیب لیکن مثالی صحافی تھے۔ ادیب صرف اپنے موضوعات پر سوچتا اور لکھتا ہے۔ وہ زندگی کی تخلیقی توانائیوں کو زندگی کے تعلق اور حوالے سے غفلتوں میں مبتلا اور پروتا ہے اور اس طرح خود زندگی کی تشکیل دہیں ہاتھ بنا کر زندگی کو کسے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ نہ صرف زندگی کی بلکہ اس زبان کی بھی جس میں وہ لکھ رہا ہے تخلیقی قوتوں کو دریافت کرتا اور ابھارتا ہے۔ یہ ایک مثالی ادیب کا دائرہ عمل ہے۔ مثالی صحافی بھی زندگی کے دائرے میں کام کرتا ہے لیکن اس میں ایسی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ہر اس موضوع پر کم وقت میں لکھنے کی قوت رکھتا ہے جو اسے دیا جائے اور پڑھنے والا جب اس تحریر کو پڑھے تو مطمئن ہو جائے۔ مثالی صحافی کے ہاں اسی لیے موضوعات کا تنوع ہوتا ہے، پھیلاؤ ہوتا ہے۔ میں جب رئیس احمد جعفری صاحب کو مثالی صحافی کہتا ہوں تو اس کے ثبوت میں میں ان کی تحریروں کے تنوع اور پھیلاؤ کو پیش کرتا ہوں اور یہ وہ تحریریں ہیں جو بہت کم وقت میں لکھی گئی ہیں۔ وہ ناول نگار بھی تھے اور مترجم بھی۔ سوانح نگار بھی تھے اور مورخ بھی۔ مذہبی موضوعات پر بھی لکھتے تھے اور سیاسی موضوعات پر بھی۔ غرض کہ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر انھوں نے نہ لکھا ہو یا نہ لکھ سکتے ہوں۔ انھیں کا ادارہ ہو یا کالم۔ کسی اہم خبر کا مسئلہ ہو یا کسی تازہ و گرم موضوع پر قلم اٹھانے کی بات ہو رئیس احمد جعفری کا قلم ہمیشہ زندہ و تازہ رہا۔ انھوں نے ایک طرف اقبال پر لکھا، اقبال، اقبال اپنے آئینے میں اقبال اور عشق رسول اور دوسری طرف سفر نامہ ابن بطوطہ، طلسم ہوشیار اور

فسادِ آزاد کی تلخیص کی اور انھیں مرتب کیا۔ ایک طرف اسلام منزل بہ منزل کے عنوان سے کتاب لکھی تو دوسری طرف انفا و است محمد علی، سیرت محمد علی، مطاہات محمد علی، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد اور حیات قائد اعظم لکھی۔ ایک طرف اگر انھوں نے مستند عربی کتابوں کے ترجمے کیے تو دوسری طرف پچاس سے زیادہ ناول لکھے۔ ایک طرف کامریڈ کا انتخاب مرتب کیا تو دوسری طرف RARE DOCUMENTS کے نام سے نایاب سیاسی و قہذیبی اہمیت کی دستاویزوں کو مرتب کیا۔ یہ کٹھا وہ تنوع اور پھیلاؤ جس کے باعث میں رئیس احمد جعفری صاحب کو مثالی صحافی کہتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ لن کا وہ اصل مقام ہے جہاں وہ منفرد ہیں اور کوئی دوسرا لکھنے والا ان کو نہیں پہنچتا۔

(۲۸ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

# امداد صابری: تاریخ صحافت

جناب امداد صابری اردو زبان کے نامور مصنف ہیں۔ جنہوں نے ایسے مصنفت اردو زبان کو ایسی پیش بہا کتابیں دی ہیں کہ ان کا نام و کام صدیوں زندہ و باقی رہے گا۔ ان کے موضوعات کے تین دائرے ہیں۔ صحافت، تصوف اور تذکرہ نویسی۔ صحافت ان تینوں دائروں میں سب سے بڑا اور سب سے وسیع دائرہ ہے اور اس دائرے میں ان کا سارا بنیادی اور اہم کام آجنا ہے۔ ان کی مشہور زمانہ تصنیف ”تاریخ صحافت اردو“ کی اب تک ۵ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کام مولانا امداد صابری صاحب نے ایک خاص منصوبے کے مطابق کیا ہے۔ پہلی جلد میں ۱۸۳۳ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ صحافت بیان کی ہے، دوسری جلد میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۵ء تک تیسری جلد میں ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۰ء تک چوتھی جلد میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک اور پانچویں جلد میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک کی تاریخ صحافت بیان کی ہے۔ تاریخ بیان کرتے ہوئے جہاں مولانا امداد صابری صاحب نے مخصوص رجحانات، حالات و ظہور کو بیان کیا ہے، وہاں وہ نادر واقعات، ادبی، علمی، تعلیمی و ثقافتی واقعات بھی نقل کر رہے ہیں جن سے تاریخیں مرتب ہوئی ہیں۔ انہیں کے ساتھ ساتھ اخبارات، رسائل کے ایڈیٹروں کے مستند حالات بھی درج کر دیے ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اخبارات اور ان کے مدیروں کے بارے میں جو سوانحی حالات اور دوسری متعلقہ معلومات اس

لے ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء مطابق ۳۰ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ بروز پنجشنبہ مولانا

امداد صابری دہلی میں وفات پا گئے۔

کتاب میں شامل ہیں وہ اس طور پر کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔ تاریخ صحافت کی یہ پانچوں جلدیں معلومات کا ایک بحرِ ذخار ہیں جن کے مطالعے سے ادب سیاست اخبار اور عام مورخ کو وہ مواد مل سکتا ہے جو اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ ان پانچ مطبوعہ جلدوں کے مطالعے سے ہم انیسویں صدی کے وسط سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کی سیاسی و تہذیبی تاریخ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے حالات و عوامل اور جدوجہد کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب اکام تھا جسے مولانا امداد صابری ہی کر سکتے تھے۔ یہ بات کہ مولانا امداد صابری صاحب ہی یہ کام کر سکتے تھے میں نے اس لیے کہی کہ مولانا کے پاس اتنا بڑا ذاتی کتب خانہ ہے جس میں انیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک کے اخباروں کے مشترقاتل موجود ہیں اور ساتھ ساتھ ان کے پاس وہ اخلاص اور وہ لگن بھی موجود ہے جو فراد کو جمع نہیں لانے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان پانچوں جلدوں کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کام کے مولانا امداد صابری نے ہمارے آج کے مادہ پرست اور زر پرور معاشرے میں عشقِ صادق کی ایک لازوال مثال قائم کی ہے اور اردو زبان کو قیمتی اسناد چمکنے والے اصلی موتیوں سے مالامال کر دیا ہے۔ "تاریخ صحافت اردو" ہر قسم کی معلومات کا ایسا خزانہ ہے کہ ہم اسے ایک طرح سے قانونِ صحافت کہہ سکتے ہیں۔ ان جلدوں کے مطالعے سے ان تہذیبیوں کا بھی واضح طور پر احساس ہوتا ہے جو ہندوستان میں بسنے والی قوموں کے باطن میں آئیں اور عظیم پاک و ہند کے نقشے کو تبدیل کر گئیں۔ ان جلدوں میں تاریخ کا دیا ہماری نظروں کے سامنے رواں دواں ہو جاتا ہے اور ہم تاریخ کے ساتھ خود بھی سفر کرنے لگتے ہیں اور جو کچھ گزشتہ ڈیڑھ صدی میں ہوا اس کی بہتی جاگتی متحرک تصویریں فلم کی طرح سامنے آجاتی ہیں۔ اخبار واقعات کا روزنامہ ہوتے ہیں اور واقعات کا اظہار زندگی کا اظہار ہے۔ اخبار نویس واقعات کو بیان کرتا ہے اور ان پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں ہونے والے واقعات کو ہم تک پہنچاتا ہے اور اس طرح ہماری معلومات اور شعور میں اضافہ کرتا ہے۔ ہمیں اپنے نقطہ نظر سے قریب لانا ہے اور ایک ہی بات کو بار بار کہہ کر ہمیں قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس طرح سیاسی جذبہ

کو تیز کر کے زندگی کو آگے بڑھانے میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ ادیب یہ کام اس طور پر نہیں کرتا۔ وہ اپنے دور کی روح کا اظہار کر کے اسے گنے والے زمانوں کی روح سے پیوست کر دیتا ہے اور اس روح کا اظہار اس طور پر اور اس انداز بیان کے ساتھ کرتا ہے کہ روح کی آواز ہماری زبان بن جاتی ہے اور ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اسی لیے صبح کا اخبار سب کچھ کر کے شام کو باسی ہو جاتا ہے لیکن ادب اسی طرح تازہ رہتا ہے۔ مولانا امداد صابری نے تاریخ صحافت اردو لکھ کر صحافت کی تاریخ کو ہمارے سامنے لا کر دکھایا ہے اور یہ کتاب بڑا کام ہے کہ مولانا امداد صابری کو جتنی داد دی جائے وہ کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخ صحافت اردو کی چھٹی جلد بھی جلد نظر کا پر آجائے گی جس میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۸۰ء تک کی تاریخ بھی اسی طرح بیان کی جائے گی۔

امداد صابری صاحب کی دوسری اہم تصنیف ”گلدستہ صحافت“ ہے جس میں مولانا نے اُن گلدستوں کو مرکز مطالعہ بنایا ہے جو بزرگ عظیم پاک و ہند کے طول و عرض میں تقریباً انیسویں صدی کے وسط سے شائع ہونا شروع ہوئے اور شعر و ادب کی ترویج و اشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اب تو گلدستوں کا رواج باقی نہیں رہا لیکن اس زمانے میں جب شعر و شاعری کا چرچا عام تھا، طبعی و غیر طبعی مشاعرے مقبول تھے، چھاپے خانے عام ہو گئے تھے یہ گلدستے وہ کام کرتے تھے جو آج رسائل و جرائد اور اخبارات کرتے ہیں، مولانا کی تحقیق کے مطابق اردو کا سب سے پہلا گلدستہ ”گل رعنا“ کے نام سے مولوی کریم الدین نے دہلی سے جاری کیا یہ وہی مولوی کریم الدین ہیں جن کا تذکرہ طبقات شعرائے ہند ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا اور آج بھی اردو زبان کے قابل ذکر تذکروں میں شامد ہوتا ہے۔ مولانا امداد صابری صاحب نے اس ”گلدستہ صحافت“ میں ۱۰۰ گلدستوں کا تعارف کرایا ہے اور انتخاب کلام کے ساتھ مرقب اور نگینے والوں کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے بھی اردو زبان و ادب کے بہت سے نامعلوم گوشے سامنے آجائے ہیں۔ اس کی نوعیت بھی ایک طرح سے ادبی تذکرے کی ہے۔ یہ ”گلدستہ صحافت“ کی جلد اول ہے۔ مولانا نے وعدہ کیا ہے کہ بقیہ گلدستوں کے شعر اور اُن کا کلام وہ اگلی جلد

میں پیش کریں گے۔ کیونکہ ہم سب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مولانا امداد صابری صاحب کو صحت کے ساتھ اتنی عمر عطا فرمائیں کہ وہ سارے علمی و ادبی کام پورے کر سکیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا کے دو تذکرے ”تھانہ مقدس کے اردو شعرا“ اور ”جنوبی افریقہ کے اردو شاعر“ مشہور ہو چکے ہیں اور ان کے علاوہ روح صحافت، فرنگیوں کا جال، تذکرہ حضرت ضامن شہید، فرنگ، تذکرہ قاری عبداللہ کی وقاری عبدالرحمن الہ آبادی، کلکتہ شرف، تذکرہ مولانا شاہ حکیم، دہلی کے قدیم مدارس و مدرس، شہیدان وطن، ضلع مراد آباد اور اردو کے اخبار نویس وغیرہ شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ میں مولانا کا ذاتی طور پر اس لیے بھی شکر گزار ہوں کہ ان کی کتابوں سے میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے حتیٰ کہ میرے دادا جالب دہلوی صاحب مرحوم و مغفور کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں انھوں نے درج کی ہیں جن کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔ خدا مولانا کو صحت و عمر دے اور اس کے ساتھ خوش و خرم رکھے تاکہ وہ اسی طرح کام کرتے رہیں۔

مولانا نے تاریخ صحافت اردو کی ۵ جلدیں اور گلدستہ صحافت کی ایک جلد لکھ کر وہ کام کیا ہے جو فرد نہیں بلکہ ادارے کرتے ہیں۔

۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء



# پیر حسام الدین راشدی

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ موت نے گھر دیکھ لیا ہے۔ جوش گئے، فراق گئے، احسانِ دانش گئے اور اب ان لوگوں کا غم تازہ تھا کہ ایک دن میں دو ہستیاں حضرت جعفر شاہ پھلواری اور پیر حسام الدین راشدی بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے:

کئی نیندوں اب تو سوتی ہے لے چشم گر یہ پاک  
سڑا گاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

یہ وہ لوگ تھے جو صدیوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں اور اپنی نظر کو میاگر سے خاک کو سونا بناتے ہیں۔ پیر حسام الدین راشدی انہیں ہم سب پر صاحب کے نام سے پکارتے تھے کراچی شہر کی علمی زندگی کی ابرو تھے۔ ایک اچھے انسان، ایک متواضع مہمان نواز، کھلے دل کے بے پاک دوست، صاحبِ علم اور صاحبِ نظر۔ کام میں ڈوب کر کام کرنے والے، نگہ رانی میں جاکر دواؤں تحقیق دینے والے۔ ۱۹۵۲ء میں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں اور شاہد احمد دہلوی مرحوم مسیح کے وقت ان کے گھر گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں 'جو زمین سے لے کر چھت تک کتابوں سے بھرا ہوا تھا، اپنی بڑی سی میز کے سامنے بڑی ہولی گرسی پر بیٹھ چائے پی رہے تھے۔ دروازہ قاتمِ اصحت منگد تھا، ہوا جسم، چمک دار گندمی رنگ، شگفتہ چہرہ، بڑے تپاک سے ملے۔ چلنے پھرنے کی اور بہت دیر تک علم و ادب کی باتیں کرتے رہے اور پھر دسمبر ۱۹۸۱ء میں ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ وہ علاج کے لیے لندن چلے گئے تھے۔ دروازہ قاتم تو ہائی تنی، لیکن چہرے کی چمک غائب ہو چکی تھی۔ آواز بھاری اور ٹھنی ہوئی تھی لیکن مزاج کا مردانہ پن اسی طرح قائم تھا۔ کئی آپریشن ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی بہت اسی طرح

باقی تھی اور زندہ رہے کا حوصلہ اسی طرح زندہ تھا۔ چہرہ چلے گئے اور مارتھ میں جب وہیں  
 گئے تو حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ سرطان جسم کے مختلف حصوں میں پھیل چکا تھا اور وہ  
 بہت تکلیف اٹھا رہے تھے۔ ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر وہاں  
 چلا آیا۔ دو دن بعد دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال میں داخل کر دئے گئے جہاں یکم اپریل  
 ۱۹۸۲ء کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار اسپتال میں داخل ہوئے  
 تھے لیکن ہر بار صبح وصال گھر لوٹ گئے تھے۔ ابھی ۵ سال پہلے کی بات ہے۔ آپریشن کے بعد  
 روس سے واپس آئے ہوئے انھیں خاصا وقت ہو چکا تھا اور اب وہ صحت مند تھے۔ میں  
 نے انھیں ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ کچ شام کو دعوت میں عزت و تشریف لائیں۔ وہ  
 جب بھی دعوت کرتے تو مجھے عزت دلاتے اور میں جب بھی دعوت کرتا انھیں عزت و زحمت  
 دیتا۔ جب قاصد خط لے کر گیا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ گھر والوں نے خط لے لیا۔ مغرب کے  
 وقت میرے ہاں آئے۔ گلے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا پیر صاحب خیر تو  
 ہے۔ کہنے لگے میں اسپتال میں داخل تھا۔ آپریشن ہوا ہے۔ آپ کا خط آیا تو اسپتال سے چلا آیا۔  
 وہاں پڑے پڑے ہی گھر آگیا تھا۔ سوچا آپ سے اور دوسرے دوست احباب سے ملاقات  
 ہو جائے گی اور گپ شپ سے دل بہل جائے گا۔ چہرہ پر وہی ہشاشت تھی جو ہمیشہ ان  
 کی پہچان رہی ہے۔ رات گئے تک بیٹھے رہے۔ کھانا کھایا اور پھر اسپتال واپس چلے گئے۔  
 اسپتال جانا، آپریشن کرانا ان کے لیے معمولی بات بن چکی تھی۔ میں نے ایسے موڈی بیماری کے  
 مریض کو اتنا جری اتنا بہادر کبھی نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت سے بھی ہنستے  
 کھیلتے ہم کنار ہونا چاہتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں پہلی بار ان پر دل کا شدید دورہ پڑا  
 تھا۔ اس کے بعد وہ آٹھ سال تک نہایت احتیاط سے زندگی بسر کرتے رہے۔ سگریٹ  
 بھی تھوڑی تھی لیکن جب میں دسمبر ۱۹۸۱ء میں ان سے ملا تو وہ پھر کثرت سے سگریٹ پی  
 رہے تھے۔ شاید انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب وہ اس منزل میں ہیں جہاں کثرت سے  
 سگریٹ نوشی بھی ان کو مزید نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ ۱۹۵۸ء کی زندگی کا اہم موڑ  
 تھا۔ اس کے بعد ہی ان کی تصنیف و تالیف کا اصل دور شروع ہوتا ہے۔ ان کی بیشتر

اور قابل ذکر تالیفات ۱۹۵۸ء کے بعد ہی مرتب و شائع ہوئیں۔

پیر حسام الدین راشدی بنیادی طور پر تاریخ کے عالم تھے اور تاریخ کے حوالے ہی سے ان کی نظر مختلف علوم و فنون پر تھی۔ پیر صاحب نے سندھ کی تاریخ و تہذیب کے ان بنیادی مآخذ کو مرتب و شائع کر کے سندھ کی علمی و تہذیبی زندگی کو حیات نو بخشی۔ سچ جو سندھ کی نئی نسل علمی و تحقیقی کام کر رہی ہے وہ پیر صاحب کی تالیفات ہی سے روشنی حاصل کر رہی ہے۔ پیر صاحب نے جدید تحقیق کی روایت کو اہل سندھ سے روشناس کرایا۔ ان کی یہ خدمت تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

پیر حسام الدین راشدی نے فارسی سندھی اور اردو میں کم و بیش ۵۰ کتابیں تصنیف، تالیف اور مرتب کیں جن میں محمد اصلاح مرزا کا تذکرہ شعرائے کشمیر، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی کے تذکرے حنفیہ الکرام، مقالات الشعراء، مکی نامہ اور معیار سالکان، طریقت بھی شامل ہیں اور غلیل ٹھٹھوی کا تذکرہ مکملہ مقالات الشعراء، میرک یوسف کی تاریخ مظہر شاہجہانی، میاں نور محمد کھلوڑہ کی تاریخ منشور الوصیت، سید عبدالقادر ٹھٹھوی کی حدیقۃ الاولیاء اور میر محمد ٹھٹھوی کا ترخان نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پیر صاحب کی تحقیق و ترتیب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہاں صحت متن پر فوری توجہ دیتے تھے وہاں متعلقہ معلومات کو بھی ساتھ ہی یکجا کر دیتے تھے۔ یہ دوسری افادیت ان کی مرثیہ کتاب میں ملے گی۔ وہ بہت محنتی، اُن ٹھک انسان تھے۔ اکثر وہ یہ کہتے کہ کتاب کو اس طرح مرتب کرنے کو اس موضوع کو دو بوجھ دیکھ کر مکمل کر دیتے مثلاً محمد اصلاح مرزا کے تذکرہ شعرائے کشمیر کو مرتب کیا تو اصل تذکرے میں ۳۰۵ شعرا کا تذکرہ و ترجمہ درج تھا۔ پیر صاحب نے نہایت محنت و کاوش سے ان فارسی شعرائے کشمیر کو مزید شامل کر دیا جو محمد اصلاح کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے تھے اور اس طرح تقریباً ۳۱۲ نئے شعرا کا اسی انداز سے اور اضافہ کر دیا۔ پھر میر شاعر کے بارے میں ضروری و مفید معلومات بھی شامل کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تذکرہ اب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں اقبال تک کم و بیش سارے فارسی شعرائے کشمیر شامل ہو گئے ہیں۔ یہی

مورث کی نام کی ہے۔ یہ کی نام کا اصل متن ۶۹ صفحات پر مشتمل ہے اور حواشی اور اضافے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اپنے اس تحقیقی عمل سے انھوں نے نہ صرف قدیم کتابوں کو نئی زندگی دی بلکہ تحقیق کی صبر آزما روایت کو بھی قائم کر دیا۔ روزبان میں ان کی دو تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک ”مرزا غازی خان اور اس کی ہزم ادب“ جسے انجمن ترقی اردو نے چند سال پہلے شائع کیا تھا اور دوسری ”دو حجازی محفل“ جس میں اہل فنیہ معلومات کے علاوہ غالب کے شاگرد ناطق مکرانی کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ نادر اور اچھوتی ہیں۔ ان کی تہہ پکتا ہیں متعلقہ دور کی دوسری ساری کتابوں سے کم و بیش بے نیاز کر دیتی ہیں۔ پھر جن نادر مخطوطات، کتابوں، تحریروں اور دستاویزات تک ان کی رسائی تھی بہت کم اہل علم ان تک رسائی رکھتے تھے۔ وہ جو کچھ لکھتے اس دور کو ساتھ ہی سمیٹ لیتے۔ میں نے شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد ان کی یاد میں ساقی کراچی کا شاہد احمد دہلوی ہنرمند کیا تو پیر صاحب سے بھی درخواست کی کہ وہ بھی ایک مضمون شاہد صاحب کے بارے میں لکھیں۔ انھوں نے مضمون لکھا اور اس میں ۱۹۳۷ء کے بعد سے شاہد احمد دہلوی (وفات تک کے دور کو سمیٹ کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا) اس مضمون کے آخر میں پیر صاحب نے لکھا:

”زندہ رہنے والے مرنے والے کو قبر میں اتار کر جب تک پوری قبر نہ اٹ جائے اس وقت تک مختلف فوٹیوں میں بیٹ کر اپنی خوشی گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ کوئی کسی کے پیچھے نہیں گیا۔ دنیا یوں ہی چلتی رہے گی۔ دنیا کا کاروبار اور انسانوں کے مشاغل ویسے ہی جاری رہیں گے۔“

شاہد احمد دہلوی کی وفات کے ۵ سال بعد پیر شمس الدین راشدی بھی ہم سے رخصت ہو کر زہرِ زمین خاک میں آسودہ ہو گئے۔ لوگ چلے جاتے ہیں اور پھر حاکمِ واپس نہیں آتے۔ شاہد دہلوی آرام بہت ہے۔

پھر آئے جو ہوئے خاک میں  
غالباً زہرِ زمینِ تیر ہے آرام بہت

## مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، سال کی عمر میں، ۲۳ مئی ۱۹۸۵ء کو اشام کے سواچھ بکچہ کراچی میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ وہ سلطان کے موزی مرض میں مبتلا تھے اور کافی عرصے سے بیمار تھے۔ مرن کی نوعیت ان سے پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ وفات سے آٹھ دس دن پہلے جب میں اور مشفق خواجہ صاحب ان کی عیادت کے لیے ان کی بیٹی اور ہم نام داماد لے ایم سعید صاحب کے گھر پہنچے تو صاحب خانہ نے ہمیں بتایا کہ ان کی بیماری کے بارے میں کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ ہم خاص دیر ان کے ساتھ رہے۔ انھیں لالہ ان کے چہرے سے عین تھا۔ ہمد کھردری اور سیاہ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھے اور پھر کچے کے سہارے صوفے پر بیٹ گئے۔ ہمارا استین کو اوپر کر کے اپنے ہاتھوں کو کھجاتے رہے۔ اس عرصے میں علم داد پ کی باتیں ہوتیں۔ انھوں نے اپنے آئندہ کے منصوبوں کا ذکر کیا۔ شیخ الہند کا دمی کے مسائل اور منصوبوں کی وضاحت کی اور بتایا کہ وہ اب جلد انجلہ ہندوستان واپس جا کر اپنے کاموں میں لگ جانا چاہتے ہیں۔ حضرت علیؑ کی حیات دیمرت کو مکمل کرنے کا بھی ذکر آیا۔ ان سے گفتگو کر کے محسوس ہوا کہ مولانا ذہنی طور پر اسی طرح مستعد ہیں جس طرح وہ بیماری سے پہلے تھے۔ اس سے پہلے ہی ان سے گزشتہ تین چار سال میں دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی اور ہر بار مولانا کی خوش مزاجی، اندازِ تکلم اور دصت علم سے میں متاثر ہوا تھا۔ وہ ایک اچھے روشن دماغ، فراخ دل اور وسیع النظر انسان تھے۔ ان کی تصانیف پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو کسٹریں کے اندر سے نہیں بلکہ کائنات کی دستوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ اسی لیے ان کی تحریریں آج کی نسل کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ ان کے دل کے نہیں

خافز میں اتر جاتی ہیں۔ یہ بصیرت بے نہایت وسیع و عریض زندگی کے حوالے سے، علم اور فکر کے گہرے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور یہی بھار کوئی شاہ ولی اللہؒ کوئی سرسیدؒ اور فنا کوئی شبلی نعمانیؒ کوئی الطاف حسین حالیؒ کوئی ڈاکٹر محمد اقبالؒ کوئی نیدر سیمان ندویؒ اس بصیرت کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مرکز بھی ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ انسان فانی ہے لیکن اس کے کلام سے اس کی بصیرتیں یقیناً لافانی ہیں اور اسی لیے مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی اس دور کے حوالے سے یقیناً زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بہت کچھ اور اپنے خیالات کو تحریر و تقریر و دونوں سطح پر معاشرے تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں زبان بھی دی تھی اور قلم بھی۔ وہ عربی و فارسی پر بھی عبور رکھتے تھے اور اردو و انگریزی پر بھی۔ ان کے پاس علم بھی تھا اور اس کے اظہار کا وسیلہ بھی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے چون کہ زندگی کو پورے پھیلاؤ کے ساتھ دیکھا تھا اس لیے ان کے مزاج میں شہرِ اَواعتدال اور حلم اس درجہ تھا کہ مسائل کو سلجھانے اور حل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر ان میں انتظامی صلاحیت بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ انسانی دشمنوں کی نزاکت و لطافت کا وہ پورا خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ محفل آرا بھی تھے اور حنائی محفل بھی۔ اس دور میں ایسے اعتدال پسند روشن دماغ اور ہر دلی عزیز مولانا خال خال نظر آتے ہیں اور انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اپنی تین ملاقاتوں میں میں نے محسوس کیا کہ مولانا سے ملنا زندگی کو سنوارنے اور ثوابِ داریں حاصل کرنے کا درجہ رکھتا ہے۔ اُن سے مل کر اور ان سے گفتگو کر کے انسان تازہ دم ہو جاتا تھا۔ فارسی و اردو اشعار سے اظہار میں تازگی پیدا کرتے تھے اور حاضر علم اور وسیع معلومات سے ملنے والے کے دماغ کو روشن کر دیتے تھے۔

مولانا ۱۹۰۸ء میں اصغر گونڈی اور جگمڑا آبادی کے تڑشد حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کی دعاؤں سے پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور مولانا نور شاہ کشمیریؒ علامہ براہنم علاء شہید احمد عثمانیؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ مفتی محمد شفیعؒ اور محمد اویس کاندھلویؒ کے علم کا نور حاصل کیا۔ کچھ عرصہ ڈاکٹر اہل میں تدریس کا کام بھی کیا اور پھر جدید تعلیم کے لیے سینٹ ایڈمز کالج دہلی میں داخل ہو کر ایم اے پاس کیا اور پھر یہیں استاد مقرر ہو گئے۔ ۱۹۳۸ء تک

ندوة المصنفین قائم کیا اور ماہنامہ "برہان" جاری کیا اور وفات تک وہ اس کے مدیر اعلیٰ رہے۔  
 ماہنامہ "برہان" نے علمی و مذہبی حلقوں میں جلد وہ مقام حاصل کر لیا جو اس دور میں صرف  
 "معلات" عظیم جگہ کو حاصل تھا۔ ۱۹۳۷ء تک وہ سینٹ اسٹیفن کالج سے وابستہ رہے اور  
 پھر آزادی کے بعد جب مسلم ولی ابراہیمی تو وہ پرنسپل کی حیثیت سے مدرسہ عالیہ کلکتہ سے وابستہ  
 ہو گئے اور اس ادارے کو دوبارہ قائم کر کے اور اس میں علم و زندگی کی نئی روح پھونک کر گیارہ  
 سال بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات کے صدر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ علی گڑھ  
 سے ریشاز ہو کر وہ مجدد دہلی کے تحقیقی ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ مسلم یونیورسٹی کے نزلے  
 میں وہ ایک سال تک میکمل یونیورسٹی کناڈا سے بھی وابستہ رہے اور آخر میں دارالعلوم دیوبند  
 میں شیخ الہند اکیمیڈی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ وفات تک اسی اکاڈمی سے  
 ان کا تعلق رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ علمائے ہند کی مستند علمی کتابوں کو از سر نو جدید انداز سے ترمیم  
 مدقون کیا جائے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اکابر دیوبند اور شاہ ولی اللہ کی بلند پایہ تصانیف اور  
 خصوصاً حجتہ اللہ البالغہ کو جدید فنِ تدوین کے مطابق مدقون کیا جائے۔ یہ وہ کام ہیں جو  
 یقیناً کیے جانے چاہئیں تاکہ مفید کتابیں دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق مرتب و مدقون  
 ہو کر سامنے آئیں اور مولانا کی روح بھی اس عملِ تدوین سے خوش ہو۔

مولانا سعید احمد آبر آبادی کی تصانیف میں مسلمانوں کا عروج و زوال، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ  
 اسلام میں غلامی کی حقیقت، مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد، وحی الہی، فہم قرآن، خطبات  
 اقبال پر ایک نظر، چار علمی مقالات، صدیق اکبر، نفقۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی  
 حیثیت علمی و مذہبی سطح پر وہ کتابیں ہیں جو طویل عرصے تک دل چسپی سے پڑھی جائیں گی اور  
 حوالے کی کتابوں کی حیثیت سے زندہ رہیں گی۔

مولانا نے اپنی کسی تقریر میں کہا تھا کہ سچ کے مسلم معاشرے میں تین رجحانات پائے جاتے  
 ہیں۔ قدامت پرستی کا رجحان، ترقی پسندی کا رجحان اور آزاد فکری کا رجحان۔ قدامت پرستی  
 ہر مسئلے یا معاملے کو کسی خاص فقہی مسلک کی روشنی میں تلاش کرتی ہے۔ ترقی پسندی کی اصل  
 قانون، قرآن و حدیث ہے اور فقہی مسالک کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے۔

وہ بہائے خود قانون نہیں ہے۔ اس بنا پر کسی جدید مسئلے کا حل پہلے براہ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیئے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیے جو عدالت میں بحث کرنے وقت ایک وکیل نظر ثمر سے لیتا ہے۔ آزاد فکری صرف قرآن کو ماخذ تسلیم کرتی ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتی۔ ان رجحانات پر روشنی ڈال کر مولانا نے فرمایا کہ ان کا تعلق اس رجحان سے ہے جو ترقی پسندی کے ذیل میں آتا ہے۔ مولانا کی فکر و تحریر کا بنیادی رجحان یہی ہے۔

اسی رجحان کی وجہ سے ان کی تحریروں میں روشنی نظر آتی ہے۔ وہ دوسرے مولانا حضرت کی طرح مسائل کو الجھا کر اسلام کو وجہ تفرقہ نہیں بناتے بلکہ اعتدال و توازن کے ذریعے ایسے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں جن سے مسائل سلجھ کر زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مولانا سید احمد اکبر آبادی حنفی العقیدہ ضرور تھے لیکن انھوں نے اسلام کی تفہیم کے سلسلے میں حنفی فقہ سے اختلاف کرنے میں تامل نہیں کیا۔ مثال کے طور پر عین طلاقیں کے مسئلے میں انھوں نے امام ابو حنیفہ کے مقابلے میں حافظ ابن القیم اور امام ابن تیمیہ کے مسلک کو ترجیح دی۔ اسی طرح تسمیہ عند الذبح کے مسئلے میں بھی امام شافعی کے فقہ کو اولیت دی۔ عورتوں کے مساجد میں نماز پڑھنے کے مسئلے پر بھی انھوں نے فقہ حنفی سے مدلل اختلاف کیا۔ وہ فقہی رواداری کے قابل تھے اور فقہ کو موت آفتاب تسلیم نہیں کرتے اور اجتہاد کو دور حاضر میں ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وقت کی ضرورت تھی اور یہی مولانا سید احمد اکبر آبادی کا نقطہ نظر تھا۔

”خطبات اقبال پر ایک نظر“ میں انھوں نے لکھا ہے کہ

”ایک ایسے دور وجود و تعطل زمینی میں جب کروگ اجتہاد کا لفظ زبان سے نکالتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ان پر آزاد خیالی کا لیل نالگ جلنے علامہ اقبال نے اپنی چشم بصیرت سے کئے والے زمانہ کو دیکھ لیا۔۔۔۔۔ کہ وہ زمانہ جلد آ رہا ہے جب مسلم ممالک طوق غلامی سے آزاد ہو کر اپنی اپنی حکومتیں لے کر بیٹھیں گے اور دنیا کی دوسری مملکتوں کے ساتھ استحکام اور عروج و ترقی کے میدان میں مسابقت کرنے پر



مجموعہ ہوں گے۔ اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز  
ترقیات کے عہد میں سینکڑوں ہزاروں ایسے جدید مسائل پیدا ہوں گے  
جن کا حل اجتہاد کے بغیر ناممکن ہو گا۔

(ص ۶۹ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر پریزینٹیشن سہ ماہی نمبر ۸۳/۱۹۸۳ء)

یہ صورت حال جسے علامہ اقبال نے دیکھ لیا تھا آج ہماری نظروں کے سامنے ہے۔  
اب اسلام کی اشاعت اور زندگی سے اس کا گہرا تعلق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد  
کا دروازہ کھولا جائے۔ مسائل زندگی کو اجتہاد کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور روح اسلام سے  
نئی نسلوں میں بصیرت کی نئی روشنی اور اسلام کو زندگی میں عملی طور پر اپنانے اور برتنے کی  
حقیقی صلاحیت پیدا کی جائے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تحریریں اور ان کے افکار  
ہمیں یہی راستہ دکھاتے ہیں۔ اسی لیے وہ درجہ حاضر میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں  
اور ہمارے دلوں میں عزت و احترام کی مسند پر متمکن ہیں۔

اب جب کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہمارے درمیان نہیں ہیں ضرورت اس بات  
کی ہے کہ مولانا کی تمام کتابوں کو خاص اہتمام سے شائع کیا جائے۔ نہ صرف کتابوں کو بلکہ ان  
کے مضامین، مشذرات، انٹرویوز اور مطبوعہ و محفوظ تقریروں کو بھی یکجا و مرتب کر کے طبع  
کیا جائے اور پھر سیٹ کے طور پر پبلک میں پیش کیا جائے۔ مولانا کی یاد کو زندہ و باقی رکھنے  
کا یہی مفید اور کارآمد طریقہ ہے اور اس پر جلد عمل کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم مولانا کے افکار  
کو آنے والی نسلوں تک پہنچا سکیں گے۔ یہ ہم سب کا دینی فریضہ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی  
کی روح کو خوش کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ دیکھئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی حضرت غالب علیہ  
شعرِ ظہور ہے ہی :

کون ہو تک ہے حریف سے مرد انگن عشق  
ہے مکر رہ ساتی پہ صلا میرے بعد

# مجنوں گورکھپوری

۳۲ جون ۱۹۸۸ء کو حضرت مجنوں گورکھپوری ۸۳ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ موت یقیناً برحق ہے لیکن جب ایسے لوگ مرتے ہیں جنہوں نے معاشرے کے جنگل کو کھلایا بنایا ہے یا جنہوں نے گنے والے زمرے کی فزید دے کر معاشرے میں نئے شعور اور نئے احساس کو جنم دیا ہے تو ان کے رخصت ہونے پر ہمیں دل رنج ہوتا ہے اور ہم افسردہ ہو جاتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کی وفات کی خبر جب میں نے سنی تو میں بھی اُداس ہو گیا اور گزشتہ بیس سال کی ملاقاتوں کی تصویریں مخمک ہو کر ذہن کے پردے پر نمایاں ہونے لگیں۔ مجنوں صاحب کی ایک بات تو یہ ہے کہ وہ اسم ہانسی تھے۔ دھان پان سے اُدھے چلے، لاغر و نحیف، دیکھیے تو مجنوں دکھائی دیں۔ یہی ان کا تخلص تھا۔ اسی سے دنیا میں مشہور ہوئے اور یہی نام تاریخ ادب کا حصہ ہے۔ جسمانی طور پر مجنوں لیکن ذہنی طور پر رستم کی طرح طاقت ور رہا۔ ہمارے ہوتے اور اکثر ہوتے لیکن ذہن اسی طرح قنومند و تازہ رہتا۔ بات کرتے تو علم کا دروا ہو جاتا۔ یادداشت ایسی کہ برسوں کی بات یا ربع صدی پہلے پڑھی ہوئی کتابوں کے حوالے حسب موقع فوراً زبان پر آ جاتے۔ اس یادداشت نے ان کا اس وقت بہت ساتھ دیا جب رعشہ کی وجہ سے لکھنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد جو کچھ انہوں نے لکھا بول کر لکھوایا۔ غالب۔ شخص اور شاعر۔ جو ان کی آخری کتاب ہے، اُنم ویش اسی طرح بول کر لکھوائی گئی تھی۔

مجنوں صاحب کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اعتدال و توازن ہے۔ وہ لکھتے وقت جذبات کی زد میں نہیں پھرتے بلکہ مثال اور دلیل سے اپنی بات اس طرح احتیاط سے کہتے ہیں کہ

بات پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے اثرات کو قبول کیا لیکن اس کے ساتھ بہ نہیں گئے۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء اور وہیں رومانیت اور رومانی ادب کا دور تھا۔ ایک طرٹ اختر شیرانی کی آواز ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی اور دوسری طرف نیا ذخیرہ اور ل احمد دغیو کی رومانوی تحریریں اور افسانے قبولیت عام کے پر دل پر اڑ رہے تھے۔ مجنوں صاحب نے بھی اسی زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی اور اسی رنگ میں داؤد حمیرے سے کر شہرت حاصل کی لیکن جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے آنے والے زمانے کی ہوائوں اور تقاضوں کا رخ دیکھ کر افسانہ نگاری کو خیر باد کہا اور ترقی پسند نقطہ نظر کی ترہائی کے معاشرے میں نئے شعور کی پیدائش و ترویج میں مدد دی لیکن یہاں بھی انھوں نے آنکھیں کھلی رکھیں اور ادب ہی کو اپنی ہر تحریر کا بنیادی حوالہ بنایا رہا وجہ ہے کہ جب ہوائیں نئے فکر و خیال کی سطح پر رخ بدلا، ان کی تنقیدی تحریریں اسی طرح تازہ دم رہیں اور آج بھی اپنی صوت اور جہاں باقی رنگ کے باعث دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں اور ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

وفات سے دس پندرہ سال پہلے وہ اپنی خود نوشت لکھوانا چاہتے تھے تاکہ ان کا دور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائے لیکن مناسب لکھنے والے کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ البتہ ان کی خواہش ایک حد تک اس طرح پوری ہو گئی کہ میرے دوست لطف اللہ خان صاحب نے پندرہ سولہ گھنٹے کا انٹرویو سب پر محفوظ کر لیا۔ میں سوال کرتا تھا اور مجنوں صاحب اس کا جواب دیتے تھے۔ میں نے اس انٹرویو میں صرف رقم دینے کا کام کیا اگر مجنوں صاحب زیادہ سے زیادہ بول سکیں۔ اس انٹرویو میں گفتنی بھی ہے اور ناگفتنی بھی۔ لطف اللہ خان صاحب کو شاید کپ نہ چلنے ہوں لیکن انھوں نے جو کام کیا ہے وہ ادارے بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس آوازوں کا جو ذخیرہ ہے برصغیر میں تو یقیناً کسی فرد یا ادارے کے پاس نہیں ہے۔ شاید دنیا بھر میں کسی فرد کے پاس آوازوں کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں ہو گا۔ مجنوں صاحب کی آواز کی بات تو میں نے کی۔ ایک ذرا اسی شال اور دیتا ہوں۔ فیض احمد فیض کا سارا کلام خود ان کی زبانی محفوظ ہے۔ وہ بھی جو شائع ہو چکا ہے اور وہ بھی جو شائع نہیں ہوا۔ لطف اللہ خان صاحب بھی اب شرے

بہتر ہے ہو رہے ہیں اور ہم سب کو حکومت کو اداروں کو اس ذخیرے کو محفوظ کرنے کی فوراً سبیل کرنی چاہیئے۔ مجنوں صاحب کا یہ پندرہ سولہ گھنٹے کا یہ انٹرویو بھی کتابی صورت میں شائع ہونا چاہیئے۔

مجنوں صاحب نے افسانے بھی لکھے اور تنقید بھی۔ جمالیات پر سب سے پہلی کتاب انھوں نے لکھی۔ مغربی ادب کے شاہکار ادب پاروں کے اردو میں ترجمے بھی کیے۔ نئی فکر کو اولیٰ تنقید میں سمجھ کر اسے ایک ایسی صورت عطا کی کہ وہ مجنوں صاحب کی انفرادیت بن گئی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ مجنوں صاحب اسم بامستی تھے۔ ان کا خاندانی احمد مدنی تھا۔ ادب میں انھوں نے صدیقیت کی ترویج کی اور پریشہ صداقت اور سچائی کا اظہار کرتے رہے۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

” مجھے بے ہاکی کے ساتھ کھڑے کو کھرا اور کھڑے کو کھوٹا، سچ کو سچ،

جھوٹ کو جھوٹ، اصلیت کو اصلیت، غریب کو غریب کہہ دینے میں کبھی کوئی تاثر نہیں ہوا اور میری زبان اور میرے قلم نے اس معاملے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔“

یہی ان کی تحریروں کی خوبی ہے اور اسی خوبی کی وجہ سے وہ آج کی طرح کئے والے زعمانوں میں بھی دل چسپی سے پڑھی جائیں گی۔ انسان فانی ہے لیکن اس کی سدا بہار تحریروں اسے لافانی بنا دیتی ہیں۔ پروفیسر احمد صدیق یقیناً وفات پا گئے ہیں لیکن حضرت مجنوں گورکھپوری زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

# ڈاکٹر سید عبداللہ: ایک تعارف

یہ انتہائی مستر کا موقع ہے کہ اردو کے محابہ استادوں کے استاد اردو فارسی زبان و ادب کے محقق اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب <sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup> آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں ڈاکٹر عبداللہ نے ساری عمر اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزاری ہے اور اپنی بلند پایہ تصانیف سے اردو زبان کو مالا مال کیا ہے۔ ان کی تصانیف ہماری زبان کا وہ قیمتی سرمایہ ہیں جنہیں آنے والی نسلیں محبت و احترام کے ساتھ سنبھال کر رکھیں گی۔ انہیں دیکھ کر، ان سے مل کر، ان سے باتیں کر کے نہ صرف زندہ رہنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے بلکہ ساری عمر کام اور صرف کام کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ان کی ذات مجسم خلوص ہے اور اسی خلوص کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک ایسی دل کشی پیدا ہو گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے محبت کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات حادواثر، ان کی گفتگو پُر سحر اور ان کی تحریر پُر اثر ہے۔ ڈاکٹر صاحب صرف ادیب ہی نہیں ہیں بلکہ حقیقی ادیبوں کی اس عظیم بلوری سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تحریروں کے دائرے میں سارے مروجہ علوم آجاتے تھے اور اسی لیے ان کی تحریروں کا دامن وسیع، ان کا نقطہ نظر فراخ اور ذہنی تناظر پھیلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ صاحب اردو کے ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں جو لکھتے اردو میں

ہیں۔ شہرت کی دولت، اردو کے وسیلے سے بڑھتے ہیں اور پھر مجبوراً کرسی کے دلال بن کر اسی  
 جہنم یا جہنم چھید کرتے ہیں جس میں کھدے ہیں۔ ابھی کچھلے دنوں ایک سیمینار میں شرکت کرنے  
 کے لئے قہراً اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر عبداللہ صاحب فرما رہے تھے۔ وہاں کچھ ادیبوں  
 نے جب اپنے مقام پر تھے تو ان مقالوں کی ایک اہم خصوصیت تو یہ تھی کہ وہ موضوع سے ہٹے  
 ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات صرف اپنی بات کہنے کے لیے سیمینار کے پلیٹ فارم  
 کو استعمال کر رہے ہیں۔ جن صاحب کا موضوع سائنسی معاشرے میں ادب کا مقام تھا انھوں  
 نے اس موضوع پر تو ایسے کہا کہ اپنی بے ربط باتوں میں کہیں کہیں لفظ سائنس شامل کر دیا اور  
 پھر جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہنے لگے مثلاً ایک جگہ ایک ہی سائنس میں انھوں نے دو باتیں کہیں۔  
 ایک یہ کہ اردو درباری زبان ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو مشکل زبان ہے۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ  
 اردو جو آج تک عوام کی زبان نہیں ہے اور جس کے ذریعے سارے پاکستان کے مختلف الزبان  
 علاقے ایک دوسرے سے بات نہ کر سکتے ہیں، کیسے درباری زبان ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے  
 دل اور درباری زبان کے معنی عوامی زبان کے ہوں۔ بہر حال اردو وہ واحد زبان ہے جس کا تعلق کیا  
 پیدا کش سے لے کر آج تک عوام سے رہا ہے۔ انگلستان و امریکہ میں انگریزی عوامی زبان ہے لیکن  
 پاکستان میں انگریزی عوام کی نہیں سرکار و بار کی زبان ہے۔ اس لیے اگر وہ یہ کہتے کہ پاکستان میں  
 انگریزی درباری زبان ہے تو بات کچھ میں آتی لیکن ان کا مقصد تو ایک نعرہ دینا تھا۔ ایک لائن دینی  
 نئی ٹیکری لائن اختیار کر کے اردو کے نفاذ کو معرض التوا میں ڈال دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا  
 کہ اردو مشکل زبان ہے۔ اگر یہ مشکل زبان ہوتی تو عوام کی زبان نہیں بن سکتی تھی اور چون کہ یہ عوامی  
 زبان ہے اور درباری کی زبان ہے اس لیے مشکل کیسے ہو سکتی ہے اگر مشکل سے مراد یہ نئی کہ اس  
 میں ذہنی و فنی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو مشکل ہیں تو وہ یہ بھول گئے کہ فارسی و عربی ہماری وہ زبانیں ہیں جن  
 سے ہماری خواہ ہم کو کتنی ہی بھی زبان بولتے ہوں، عربی و ہندی و ایرانی رشتہ ہے اور وہ تو میں بولنے زبان  
 اپنی نہیں اور اپنی نئی راہ گامی کے رخ سے اپنا رشتہ منقطع کر رہی ہیں تو وہ اپنے حافظے کو کھو بیٹھتی ہیں اور حافظہ کھنٹے  
 سے جیسے نر ل اگل ہو جائے اسی طرح حافظہ کھنٹنے کے بعد معاشرہ بھی اگل ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں  
 تقریباً دو تہائی سے کچھ زیادہ بنیادی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کی مختلف صورتوں کا توبہ لکھی ہے ہزار الفاظ جن کے

ہیں۔ ان دو ہزار بنیادی الفاظ میں سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سے زیادہ الفاظ ایسے ہیں جو اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور ان میں سے کم و بیش پانچ سو الفاظ ایسے ہیں جو اردو اور پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں مثلاً سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، بھارتی وغیرہ میں مشترک ہیں۔ سندھی کو سچے۔ سندھی میں تقریباً ۲۵۰ فی صد الفاظ فارسی زبان کے ہیں۔ کیا اس فطری ہسانی اشکر سے روگردانی کر کے ہم ملک کی یک جہتی اور قومی اتحاد کو نقصان نہیں پہنچائیں گے؟ یہ بات یاد رکھیے کہ اگر اس ملک میں اردو زبان کو جلد نافذ نہ کیا گیا تو ہماری قومی یک جہتی روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی جائے گی اور ایک دن گئے گا اور خدا کے وہ میری زندگی میں نہ گئے کہ آسمان ہمارے رسول پر گر پڑے گا۔ اردو، جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کل اور برسوں اپنے لیکچروں میں بتایا، کم مایہ زبان نہیں ہے۔ وہ زبان جس نے تیرا غالب، اقبال جیسے شاعر پیدا کیے ہوں وہ زبان جس نے مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے جادو بیان مقرر پیدا کیے ہوں، وہ زبان جس نے مسرتیبا احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد، اقبال کلاک آزاد اور شبلی و حال جیسے نثر نگار پیدا کیے ہوں، وہ زبان جس نے مولانا مودودی، ابو الحسن علی ندوی اور عبداللہ الماجد دریا بادی جیسے اردو نثر لکھنے والے پیدا کیے ہوں کیا کم مایہ زبان کہلائی؟ اس وقت ہمارا معاشرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور نور دونوں سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ اچھائی اور بھڑائی میں استہزاء کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو گیا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا ملک ہے جہاں دو نظام تعلیم رائج ہوں، ایک انگریزی تعلیم کا نظام اور دوسرا اردو تعلیم کا نظام۔ انگریزی تعلیم حاکم پیدا کر رہی ہے۔ ایسے حاکم جو لارڈ میکالے کے تصورات کی جیتی جاگتی تصویر ہیں جن کے ذہن، جن کی روح، جن کی فکر برسی اور سامراجی ہے اور دوسرے اردو تعلیم، جو رعیت اور محکوم پیدا کر رہی ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ اپنی بہترین صلاحیتوں سے محروم ہو کر اسی راستے پر چل رہا ہے جس پر ہیں انگریزی سامراج چلا گیا تھا۔ اسی لیے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی و مغربی سامراج کا نمائندہ و ترجمان ہے اور جاہل عوام ہماری تہذیب، ہماری ثقافت اور ہماری روایت کے ترجمان ہیں۔ اسی لیے گزشتہ ۳۵ سال سے ہم مسلسل عدم استحکام

کا شکر رہے ہیں۔ صاحبزادے میں اس طرح نہیں بنتی جس طرح ادریسؑ کا شکر رہے ہمارے حکمران ۲۵ سال سے اسے مٹا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب اسی نقطہ نظر کے ترجمان اور اسی مقصد کے علمبردار ہیں۔

میں نے ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی کم و بیش ساری تحریریں اور کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کی کتابوں اور خیالات سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی جوان بختی سے اپنے اندر کام کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ میں یہاں ان کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ نہیں لے رہا ہوں بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر عبداللہ جیسے لوگ روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ اب جس مشن کو لے کر وہ آئے ہیں، اردو کے نفاذ کے سلسلے میں وہ جو کچھ عملی اقدام کر رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سب ان کا ساتھ دیں، ان کی ہمت بڑھائیں تاکہ وہ اردو کے نفاذ کی تحریک کو منزل مقصود تک پہنچا سکیں۔ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ احساس محرومی کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ حکمران طبقے کو راجہ راست پر لانے اور انہیں شعور و عقل سے مشقت کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کو اہل ارتقا پہنچانے حضرات جیسے ہمارے ملک میں قحط سالی کے زمانے میں بارش کے لیے نماز مستحکم ادا کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہم گنہگاروں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرما کر بارش بھیج دیتے ہیں اسی طرح کیے ہم نفاذ اردو، ملکی سلامتی اور قومی یکجہتی کے لیے ”نمائندہ نفاذ“ ادا کریں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر جلد ہوش و شعور کی بارش برسائے اور اہل اقتدار کا تہذیبی حلقہ واپس آجائے۔



# مولانا اعجاز الحق قدوسی

مولانا اعجاز الحق قدوسی کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ سقوطِ حیدرآباد کے بعد ۱۹۵۱ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی ملاقات میں اپنی شائستگی و خوش گفتاری سے انھوں نے میرا دل موہ لیا تھا۔ باتیں ایسے کرتے جیسے شہرِ گول رہے ہوں۔ ٹھنڈے انسان میٹھی باتیں، مہذب الطوار، شائستہ انداز، خاکسارانہ وضع، عالم فاضل، تخلیقِ روایت کے عین مطابق۔ — شخصیتِ کھردری ڈالو سی، بڑی چمک دار آنکھیں، کشلا پیشانی، گنگھا ہوا جسم، بھرے بھرے گال، سر پر گھنے بال مگر حد و حد کے اندر قد چھوٹا مگر ست پنک سے بالا، چھوٹی مہری کا پاجامہ، گنگا بند شیر والی۔ یہ ان کی ایسی رسکے بند وضع تھی کہ جہاں جاتے دُور سے پہچان لیے جاتے۔ پاکستان آئے تو مصنف کی حیثیت سے معروف تھے لیکن ۱۹۵۸ء میں دہلی کے واقعہ کے بعد پاکستان میں شریعہ ہوا اور گذشتہ تیس اکتیس سال میں انھوں نے اتنا دور اچھا کام کیا کہ بہت کم لکھنے والے اس زمرے میں آتے ہیں۔

پاکستان صوفیوں کی سرزمین ہے۔ انھوں نے اسی نوخیز کو اپنا اور تذکرہ صوفیائے سندھ لکھا جو اتنا مقبول ہوا کہ ان کی شہرت سارے پاکستان میں پھیل گئی۔ آدھی ہمت والے ہیں، دھن کے پکتے اور مستقل مزاج۔ اس کے بعد پاکستان کے مختلف علاقوں کے صوفیائے کرام پر لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ صوفیائے پنجاب، صوفیائے بنگال، صوفیائے سرحد، شیخ عبدالقدوس

گنگوہی اور اقبال کے محبوب صوفیا وغیرہ اسی سلسلے کی تصانیف ہیں جو کئی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی اثناء میں متعدد مضامین بھی لکھے جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ فارسی و عربی کی فاضلانہ استعداد رکھتے ہیں۔ ترک جہانگیری کا اردو میں ایسا ترجمہ کیا جو نہ صرف مستند مانا جاتا ہے بلکہ اپنے حواشی کی وجہ سے بڑی افادیت کا حامل ہے۔ "سیرالاولیا" کا اردو ترجمہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ کام اور صرف کام مولانا اعجاز الحق قدوسی کی حقیقی زندگی ہے۔ اب تک اردو میں کیا سندھی میں بھی سندھ کی کوئی ایسی تاریخ نہیں تھی جو سارے ادوار کا احاطہ کرتی ہو۔ مولانا نے تین جلدوں میں تاریخ سندھ لکھی جو ان کی دوسری کتابوں کی طرح اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے اور یونیورسٹی کالجز کی اعلیٰ جماعتوں میں شامل نصاب کی گئی۔

مولانا سے علیے تو ان کے چہرے کی گنگولی، ان کے مسکراتے ہونٹ، ان کی بولتی آنکھیں کپ کپ کبھی احساس نہیں ہونے دیں گی کہ انھوں نے ساری عمر فلسفی میں بسر کی ہے۔ معمولی آمدنی، بڑا کنبہ، جب یہ صورت ہو تو لکھنے پڑھنے والے انسان کے لیے ہمارے متفک معاشرے میں سانس لینا بھی دو بھر ہو جاتا ہے۔ لطف یہ کہ اس کام میں نذر دہی ہے اور نہ عزت و احترام۔ معاشرہ لکھنے پڑھنے والے کو ایک ایسا دیوانہ سمجھتا ہے جو اپنا وقت، اپنی عمر اور اپنی زندگی بے کار گنوار رہا ہے۔ مولانا قدوسی اگر مستند کتابیں لکھنے کے بجائے، اسی لکھنے کے ساتھ، شہید لگاتے تو تیس سال میں نوب النساء اسٹریٹ، انارکلی یا راجہ بازار میں ان کی بڑی سی دوکان ہوتی، کار میں کوٹلی سے نکلتے، بچوں کو انگلستان، امریکہ تعلیم کے لیے بھیجتے۔ معاشرے میں "دولت کی وجہ سے، ان کی عزت ہوتی۔ بڑی بڑی دعوتوں میں بلائے جاتے۔ اہل سیاست ان سے چندہ لینے آتے اور اقتدار ملنے پر خطبات اور درآمدی پرشوں سے نوازتے۔ مولانا کی حالت یہ ہے کہ آج سے آئیس سال پہلے بھی بے زاری کا شکار تھے اور کچھ بھی۔ ہندوہ ہزار صفحات اور پچاس لاکھ سے زیادہ الفاظ لکھ کر، ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۲ء سال کی عمر میں اسی طرح مفلس اور تلاش

معاش میں سرگرداں ہیں اور رعشہ زدہ ہاتھ سے لیاقت آباد (لا لکھیت) کے گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد کمرے میں بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے اور اپنے سفاک معاشرے کے خلاف اعلان جہاد کر کے کوجی چاہتا ہے۔ وہ معاشرے جہاں اہل علم بے عزت ہوں، جہاں ادب و فن گھاس پھوس سے بھی زیادہ بے قیمت ہوں، جہاں اہل ادب کے ساتھ بدسلوکی ہے امتحانی ہوتی جاتی ہو، جہاں انھیں حقارت سے دیکھا جاتا ہو، اور اہل اقتدار منافقت کے ساتھ بے فیض تعریف کرتے ہوں وہاں علم و حکمت اور عقل و دانش کے پھول کیسے کھل سکتے ہیں اور سرسید احمد خان، محمد علی جوہر، علامہ اقبال کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟ بہر حال علم و ادب کے شیدائیوں نے ان حالات میں بھی کام کیا ہے اور ان شیدائیوں میں مولانا اعجاز الحق قدوسی کا نام معدود سے چند لوگوں میں سے ایک اور محترم نام ہے۔ اب جب کہ عمر کے برگد کو ٹنڈ اور تیز ہوائیں ہلا رہی ہیں مولانا قدوسی نے اپنی زندگی کے پچھتر سال کی داستان بھی قلم بند کر دی ہے جو دل چسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ قدوسی صاحب نے رعشہ زدہ ہاتھ سے اپنی داستانِ حیات لکھ کر احباب کی اس فرمائش کو پورا کر دیا ہے جس کا اتفاقاً وہ برسوں سے کر رہے تھے۔

ہر باشعور انسان کی زندگی، اس کے تجربے، اس کی جدوجہد، کشمکشِ عمل و ردِ عمل کی لہریں، روایت و انحراف کے دائرے، عملِ تخیل کی نئی نئی صورتیں اتنا اور ایسا مواد فراہم کرتی ہیں کہ ان سب کا بیان ناول کی طرح دلچسپ بن جاتا ہے۔ اسی لیے خود نوشت سوانح عمری ایسی دلکش تصنیف ہوتی ہے جس میں انسان کے باطن میں لگی ہوئی روح جلوہ فگن ہوتی ہے اور دل کی آواز رس گھونتی ہے۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کی خود نوشت بھی اسی لیے دلچسپ ہے۔ اس تصنیف میں زندگی کے تجربوں کے بیان میں ایک ایسی ادبیت ہے کہ ہر شخص اسے روانی و ذہنی انہماک کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ مولانا کے لکھنے کا پنا انداز ہے جس میں ادبی شائستگی، مہذب انسان کی نرم مزاجی، ہماری روایتی شعرِ ہستی اور بات کو میٹھے سلونے لہجے میں کہنے کے تخلیقی عمل نے ایسا رس گھول دیا ہے کہ

ان کی عبارت دل موہ لیتی ہے۔ اس تصنیف کو پڑھ کر ایک حساس، باشعور انسان کی زندگی کے وہ پہلو سامنے آجاتے ہیں جو پڑھنے والوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں۔ اس خودنوشت میں ہماری ملاقات ایسے بہت سے انسانوں سے بھی ہوتی ہے جنہوں نے انسانی رشتوں کو تقدس عطا کیا ہے، جنہوں نے گریزوں کو سہارا دیا ہے جنہوں نے علم و فضل سے معاشرے کو روشنی عطا کی ہے جنہوں نے بے لوثی و ایثار کا چراغ روشن کر کے انسانیت کو زندہ رکھا ہے جنہوں نے اس صدی کے بڑے حقے کی ترجمانی و نمایندگی کی ہے اور جواب تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کی یہ سرگذشت حیات اسی لیے دل چسپ اور اہم ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اسے میری طرح اشوق سے پڑھیں گے۔

(۲۲ مئی ۱۹۸۱ء)

# اے کے بروہی کی یاد میں

جناب اے کے بروہی بھی وفات پا گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ موت برحق اور ایک ایسا عمل ہے جس سے ہر ذی روح کو دو چار ہونا پڑتا ہے لیکن ممتاز ہستیوں کی وفات سے جو غلا پیدا ہوتا ہے وہ کبھی پر نہیں ہوتا۔ اے کے بروہی مرحوم ایک ایسی ہی ممتاز ہستی تھے جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد علم و دانش، فلسفہ و فکر اور قانون و انصاف کے دائرے میں وہ کارنامے انجام دیے کہ ان کا نام اس حوالے سے برسوں تک یاد رہے گا۔ ۱۹۴۷ء میں جب میں پاکستان آیا تو وہ یکینیت و کمال عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور شام کو سڑ پر مسلم لاکالج میں اصولی قانون (Jurisprudence) پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں میں بھی ایل ایل بی کا طالب علم تھا۔ سندھ مسلم لاکالج اپنی موجودہ عمارت میں منتقل نہیں ہوا تھا بلکہ سندھ مدرسۃ الاسلام ہی میں واقع تھا۔ ہم روز شام کو صدر دروازے سے داخل ہوتے، وسیع و سبز صحن کو پار کرتے اور سلمے کی عمارت میں سیڑھیوں سے اوپر چڑھ جاتے جہاں تھوڑے سے طلبہ کلاسوں سے کتے جاتے یا برآمدے میں کھڑے باتیں کرتے نظر آتے۔ یہ پاکستان کا ابتدائی دور تھا اور زیادہ تر بڑھیاں پاک و ہند کے دور دراز گوشوں سے کتے والے نوجوان ہی یہاں دکھائی دیتے تھے۔ مولوی صاحب، خدا ان کی مغفرت فرمائے، پرنسپل تھے، نیک، دل نیک، نہاد اور نیک سیرت، سدا بڑھیاں ہندو مسلم فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ کراچی شہر پاکستان کا نیا دار الحکومت تھا۔ قائد اعظم اور یاقوت علی خان زندہ تھے۔ خیا جیروں کے قافلے کراچی پہنچ رہے تھے اور نہایت محبت و خلوص کی فضا میں ہر شخص ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو رہا تھا۔ جب معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے غم

بانٹ لیتے ہیں تو بڑے سے بڑا سانحہ بھی ہنستے کھیلے گزر جاتا ہے۔ اس سارے بحر ان اور قتل و  
 غارتگری کے باوجود ہم سب سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن ہماری  
 طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اسے کے بروہی صاحب اکثر کلاس میں دو  
 قومی نظریے پر روشنی ڈالتے اور بزرگ عظیم پاک و ہند میں ہونے والے واقعات پر اپنے مخصوص  
 انداز سے اظہار خیال کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب وہ کلاس لے رہے تھے تو اچانک  
 بجلی چلی گئی۔ سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ دُور سے  
 ریڈیو پر گھگانے کی آواز آرہی تھی۔ بروہی صاحب نے کہا بجلی چلی گئی ہے۔ اسے بھول جائیے۔  
 اب میں موسیقی کے پس منظر میں نصاب سے گریز کر کے کچھ اور باتیں کروں گا۔ پھر انھوں نے  
 پاکستان اور بھارت کے بارے میں پُر سفر گفتگو کی۔ بجلی آئی تو یہی وہ اسی موضوع پر باتیں  
 کرتے رہے۔ کج جب میں اس گفتگو پر غور کرتا ہوں تو بروہی صاحب حیرت انگیز پاکستان کے  
 ایک ایسے دائمی نظر آتے ہیں جن کی ساری فکر و نظر کا محور پاکستان تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ  
 بروہی صاحب متاثر ہوتے گئے اور ایک ایسی شخصیت کے روپ میں ابھرے جسے قومی سطح کی  
 شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ عام انسان انسان کی قید میں رہ کر خوش ہوتا ہے لیکن بڑا انسان وہ  
 ہے جو اپنے لگاؤں اور اپنے علاقے کی سطح سے اٹھ کر ملک کی سطح پر ابھرے اور پھر اپنا رشتہ اپنی  
 زمین کے ساتھ ساتھ، ساری زمین سے جوڑ لے۔ بروہی صاحب نے یہی کیا اور ساری عمر اسی  
 لیے وہ پھیلتے، بڑھتے اور بلند ہوتے گئے۔ اس تمام عرصے میں گھلے گا ہے ان سے ملاقات ہوتی  
 رہی اور جب کراچی یونیورسٹی میں طبی نفسیات کا انسٹیٹیوٹ قائم کیا گیا تو اس کے بورڈر میں نے  
 اپنے خاص نمائندے کے طور پر ان کا نام تجویز کیا اور ان سے اس تجویز کو قبول کرنے کی دھڑکتی  
 کی جیسے انھوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

بروہی صاحب کا تعلق کسی مذہبی یا سیاسی جماعت سے نہیں تھا۔ ان کی ذات اور ان کی  
 دانش و حکمت ان سب چیزوں سے بلند تھی۔ وہ سفیر بھی رہے اور وزیر بھی لیکن ان کی شخصیت  
 عہدوں سے ہمیشہ بلند رہی۔ ان کی حقیقی حیثیت ایک ایسے فلسفی اور دانش ور کی تھی جو  
 اسلام کا شہدائی تھا۔ وہ ملک کے چٹائی کے کھیل تھے اور اس حیثیت میں ان کا نام خود ایک

افسانہ بن گیا تھا۔ قانونی دلائل اور قانون کا علم ان کی شناخت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جس عدالت میں جلتے عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔

اسلام کے تعلق سے انھوں نے ہمیشہ مجدد حاضر کے ان فلسفیوں کے نظریات پر تنقید کی جو سائنس کو مذہب پر فوقیت دیتے رہے ہیں اور جن میں سگنڈ فریڈ، کارل ملرکس، ماہر غرائف، درخیم وغیرہ شامل ہیں۔ بروہی صاحب کا زاویہ نظریہ تھا کہ مذہب دراصل عقیدے اور ایمان کا معاملہ ہے جس کے ساتھ صاحب ایمان شب و روز بسر کرتا اور زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔ اس عمل سے وہ مذہبی شعور پیدا ہوتا ہے جو زندگی کی تاریکیوں کو روشن کر دیتا ہے۔ بروہی صاحب کا بنیادی نقطہ نظریہ تھا کہ انسانی صورت حال ہی کچھ ایسی ہے کہ انسان بغیر مذہب کے با معنی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس صورت حال میں انسان کے سامنے دو راستے رہ جاتے ہیں: آیا وہ سچا مذہب اختیار کرے یا جھوٹا مذہب اختیار کرے۔ مذہب اس کی فزولہ بھی ہے اور مجبوری بھی۔ انسان کی شخصیت کی حقیقی نشوونما اسی شعور سے پیدا ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے جو مذہبی سچائی سے وابستہ ہے۔ یہ کائنات گہرے اور با معنی مقصد کے ساتھ پیدا کی گئی ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے سجدگی کے ساتھ جدوجہد کرے۔ یہ کائنات ایک مربوط وحدت ہے اور اصولاً توحید کے تحت چل رہی ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان علامات اور اشاروں سے خدا اور اس کی قدرت کو اس کے جلال و جمال کو احسن و قفط کو ذہن و تاریخ میں بلکہ اپنے باطن کی گہرائیوں میں مسلسل تلاش کرے۔ یہ اس کا مذہبی فریضہ ہے۔ بروہی صاحب کی تقریریں اور تحریریں اسی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اب بروہی صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی ساری فلسفیانہ تحریروں کو یکجا کر کے دو جلدوں میں شائع کر دیا جائے اور انھیں طاقہ تاریخ پر رکھ دیا جائے تاکہ تاریخ ان کی اصل قدر و قیمت کا تعین کر کے بروہی صاحب کا درجہ تعین کر سکے۔





ایسی بے ساختگی سے پڑھنے کہ گفتگو میں نکھار آجاتا اور بات سیدھی دل میں اتر جاتی۔ ان کی سادگی، وسیع المشرنی، وطن کی محبت، وسیع مطالعہ، نئی نئی کتابوں کی باتیں۔ مضامین تو کئے انہار لگ جاتے۔ مسائل حاضرہ پر ایسے گفتگو کرنے کہ سنتے والے کا ذہن روشن ہو جاتا۔ ساری گفتگو مصلحت سے پاک اور بے لگ ہوتی۔ کوئی اختلاف کرتا تو توجہ سے سنتے اور پھر اس کا جواب دیتے۔ بعض دفعہ تو اسی عمل میں گفتگوں گزر جاتے۔ اب ایسے لوگ کم ہو گئے ہیں جو مسائل کو غور و فکر اور تبادلہ خیال سے صاف کریں اور رحمت اپنا بلکہ دوسروں کا ذہن بھی نکھار دیں۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کا مطالعہ اقتدا وسیع ہو جتنا میر علی احمد تالپور صاحب کا تھا۔ کتاب پڑھنے اور کتاب جمع کرنے کا شوق ایسا تھا کہ آج بھی ان کا کتب خانہ دیکھنے اور دکھانے کی چیز ہے۔ ایک دن گیارہ بجے پیر حسام الدین راشدی مرحوم اور میں دونوں ان کے گھر گئے۔ میر صاحب نے اندر ہی بلا لیا۔ بستر پر ڈھیر ساری کتابیں رکھی تھیں اور میر صاحب کروٹ سے لیٹے ہوئے کتاب پر کھڑکڑیا کی سیر کر رہے تھے۔ دنیا کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی۔ میں جب بھی ملا انھیں کتابوں کے اندر دیکھا۔ میر صاحب نے جو کچھ علم حاصل کیا اپنے ذوق اور مطالعہ سے کیا۔ انھیں فارسی، اردو، انگریزی اور سندھی پر دسترس حاصل تھی۔ کثرت مطالعہ نے ان کے ذہن کو روشن اور دل کو فراخ کر دیا تھا اسی لیے وہ دوسرے سیاست دانوں سے بالکل مختلف تھے۔ مسائل میں اور جوڑ توڑ سے پاک۔

ایک خاص بات میر صاحب میں یہ تھی کہ وہ کچے کانوں کے نہ تھے۔ جب آدمی اقتدار میں ہوتا ہے تو اس کے حوالی مالی اپنا پسند و ناپسند اور ضرورت و مصلحت کے مطابق صاحب اختیار کے کان بھرتے رہتے ہیں اور اس طرح اصل حقائق کو اس سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ جناب میر علی احمد تالپور کہا کرتے تھے کہ اقتدار کے دوران ان لوگوں کو کچھ اپنا نہایت ضروری ہوتا ہے تاکہ حقائق اور سچائیاں نظروں سے پوشیدہ نہ ہوں۔ میر صاحب سیاست دان ہوتے ہوئے بھی اسی لیے صاف گو اور بے پاک انسان تھے۔ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ سندھ میں پی پی پی کی مقبولیت میں ان کا بڑا

ہاتھ تھا لیکن جب یہ جماعت برسرِ اقتدار آئی تو میر صاحب دو چار سال کے بعد ہی اس سے الگ ہو گئے۔ میر صاحب قومی اسمبلی کے ان چار اراکین میں سے ایک تھے جنہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر اصول کی بنیاد پر دستخط نہیں کیے اور جب پانی سر سے گزرنے لگا تو پاکستان قومی اتحاد میں سرگرم عمل ہو کر ایسی تحریک چلائی جو کچھ ہی عرصے میں کامیابی سے ہم کنار ہو گئی۔

میر صاحب کی پُر عظمت شخصیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ متحل مزاج تھے اور ان کے مزاج کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت ہے کہ جس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ اس سے معاشرہ سدھرتا ہے اور انسانیت جنم لیتی ہے۔ میں نے میر صاحب کو ہمیشہ ہی کرتے دیکھا غریبوں کے ہمدرد و کمزوروں کے حامی و کھوروں میں سب کے شریک و شرافت و انسانیت کے پیکر، اصولوں پر سبک خوار لیکن محبت و اخلاص میں — ریشم کی طرح نرم — میر صاحب یقیناً جہنمی تھے۔

میر صاحب سے میری آخری ملاقات دسمبر ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ وہ لندن چلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہشاش بشاش تھے۔ حسبِ معمول حکمت و دانش کی، علم و ادب کی سیاق و تدریج کی اور نئی کتابوں کی باتیں کرتے رہے۔

میں نے میر صاحب کو کبھی ملاؤس نہیں دیکھا۔ اس شام انہوں نے بہت دلچسپ باتیں کیں۔ اپنے بچپن کی باتیں کرتے رہے۔ پاکستان بننے سے پہلے اور بعد کے واقعات بیان کرتے رہے۔ مختلف نامور شخصیات کے بارے میں پُر لطافت قصے سناتے رہے۔ میں نے کہا میر صاحب! اگر آپ اپنی خود نوشت لکھ دیں تو گزشتہ تین چوتھائی صدی کی تہذیبی، علمی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ محفوظ ہو جائے گی۔ میر صاحب نے آمادگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو دو عمدہ قسم کے رجسٹر بھیجوں گا۔ آپ روز ناشتے کے بعد کسی کو بلا کر لکھا کر دیجیے۔ چند ماہ میں یہ سب باتیں محفوظ ہو جائیں گی۔ دوسرے دن میں نے رجسٹر بھیج دیئے۔ ایک ہفتے بعد فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لندن چلے گئے ہیں اور

پھر تین مہینے بعد جب ان کا جسدِ خاکی واپس آیا تو میر صاحب وہاں جا چکے تھے جہاں سے  
چاکر کوئی واپس نہیں آتا

قابلِ سیر نہیں بس کہ جہانِ گذراں  
جو گویا اس نے نہ پھر کر دیکھا  
(مصحف)

میر صاحب جیسی شخصیتیں روزِ روز پیدا نہیں ہوتیں۔ ہمیں ان کی یادگار  
قائم کرنی چاہیے۔ ان کے خاندانی قواعد کتابیں اور سب اشیاء کو محفوظ کر کے ان کے  
نام پر بنائے ہوئے ادارہ میں محفوظ کر دینی چاہئیں تاکہ صدقہ سہاریہ کا ثواب ہم بھی حاصل  
کر سکیں۔ اپنے قومی محسنوں کو یاد کرنے اور رکھنے کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہے۔

(۷ اپریل ۱۹۶۸ء)

# صادقین کے بارے میں

۱۰ فروری ۱۹۸۷ء منگل کے دن صبح ہی صبح سید صادقین احمد نقوی، جنہیں دنیا زمانہ صادقین کے نام سے جانتا تھا، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انارشہ وراثۃ الیہ راجعون۔ مرزا ایک فطری عمل ہے اور موت زندگی کی سب سے بڑی سفاک حقیقت ہے لیکن صادقین کی وفات کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ دنیائے فن سے ایک ایسا فن کار رخصت ہو گیا تھا جو نہ صرف ممتاز و منفرد بلکہ بے بدل تھا۔ ایسے جو ہر کچھ کھار پیدا ہوتے ہیں۔ اخبارات چھپ چکے تھے لیکن صادقین کی وفات کی خبر آگ کی طرح آگ آگ آگ آگ میں پھیل گئی اور ہمارے ہر شخص شامل تھا جو صادقین کو جانتا یا اس کے فن سے آشنا تھا۔ تیر کا یہ شعر بار بار میرے ذہن کے درجے سے جھانک رہا تھا:

کن فیندوں اب تو سوتی ہے لے چشم گرے ناک

مرزاں تو کھول مشہر کو سیلاب لے گیا

صادقین میرے دوست تھے۔ ایسے دوست کہ جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور دلوں میں محبت کی خوشبو بھی بسانے جب بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کا وجود محبت و خلوص کی ادھی خوشبو سے بہک اٹھتا ہے اور ملنے والے ایسے تازہ دم ہو جاتے ہیں جیسے ابھی غسل کیا ہوئے یاد ہے کہ صادقین سرری پبلی ملاقات غالباً ۱۹۵۵-۵۶ء میں اسپین سے ساجی سیر اور شہید سہروردی کے بڑے بھائی مرحوم شاہد سہروردی کے کمرے میں جہانگیر ریڈو پر واقع ایک کوٹھی کی ذیل داری میں ہوئی تھی۔ اسی سال کی عمر، دہلا پتلا جسم، مائل کاٹھ ہوا کرتا، چوڑے پانچوں کا پانچاوار، آنکھوں پر عینک، استخوان ناک، چھوٹی چھوٹی

سی کترواں مریجھیں، ڈاڑھی صاف نکھلتا ہو آگندمی رنگ، آواز میں کراہا پن اقیل سے چپکنے  
 ہوئے سیاہ بال، موزوں قد۔ شاہ سہروردی صاحب نے جو ادب اور آرٹ کے عالم،  
 انگریزی کے شاعر، تہذیب و شائستگی کا نمونہ تھے، میرا تعارف کرایا۔ اس زمانے میں ان کے  
 فن کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی اور وہ ایک ہونہار مصور کی حیثیت سے فن کے افق پر  
 نمودار ہو رہے تھے۔ کچھ دیر تک رک کر باتیں ہوئیں اور پھر وہ چلے گئے۔ کوئی دو ہفتے بعد ایک  
 دن میرے پاس دفتر آئے اور کوئی دھماکا تین گھنٹے بیٹھے رہے۔ پھر آنے جانے کا یہ سلسلہ جاری  
 رہا۔ میرے اور ان کے درمیان خلوص و محبت کی جو شرح روشن ہوئی تھی وہ مرنے دم تک باقی  
 رہی۔ کراچی آتے تو ایک بائیسلی فون موز کر تے۔ ایک دن ملاقات ہوئی۔ دل چپ باتیں  
 ہوئیں۔ کہنے لگے جو شرح صاحب میری ٹائٹس میں آئے تھے۔ میں نے پوچھا حضرت کیسی رہی۔  
 کہنے لگے بھئی سمجھ میں نہیں آئیں۔ فقیر نے کہا جو شرح صاحب! جب میں دس برس کا تھا تو آپ  
 کی شاعری مجھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صادقین نہایت ذہین انسان تھے۔ خوب صورت باتیں  
 کرتے تھے۔ ایسی دلدرا باتیں کہ ذرا سی دیر میں مرکز توجہ بن جاتے تھے۔ ۱۹۶۲ میں وہ پیرس  
 میں تھے۔ میں بھی اُس زمانے میں کوئی دو مہینے پیرس میں رہا۔ روز ملاقات ہوئی "ٹری ڈر"  
 کیفے میں ہم گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ دہر کو کھانا عام طور پر ساتھ کھاتے۔ دنیا زمانے کی باتیں  
 ہوتیں۔ ابھی بھی ٹری بھی۔ کاغذ اور پنسل، قلم ان کے ساتھ ہوتے کسی کا چہرہ پسند آیا۔ ذرا  
 دیر میں اس کی تصویر بنا ڈالی۔ اکثر یہ ہوتا کہ وہ جس کی تصویر بن رہی ہوتی خود اٹھ کر ہماری  
 میز پر آجاتا اور اس کیجے دیکھ کر بار بار ہوا ہوا۔ دس بارہ دفعہ ایسا ہوا کہ وہ خاک لے جاتا اور  
 سو پچاس ڈالر ذریعہ فنی صادقین کے سامنے رکھ جاتا۔ صادقین منہ کرتے مگر بورپ و امریکہ کا  
 یہی دستور ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ فن کار ساری عمر جھوٹا کرتا رہتا ہے اور فن کے پرستار،  
 زرداری کے باوجود تصویر پر مفت حاصل کرنے کی سبیل نکال لیتے اور اسی بیماری میں  
 مبتلا رہتے ہیں۔ پیرس میں میں نے صادقین کو پہلی بار کسی مالی بحران میں مبتلا نہیں دیکھا۔  
 صادقین کے مزاج میں ایک درویشی تھی۔ ایسی درویشی جو مرنے کا اور ادیب شاعر  
 میں ہونی چاہیے۔ فن ان کا اور عذاب کھونا اور ان کی زندگی کی منزل تھا۔ ساری عمر اسی میں نگاہی

دشادی بیاد کے تجھٹ میں پڑے اور نہ گھر بار کے بکھیروں میں اُلجھے۔ اچھی کامیاب زندگی گذاری اور زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق بسر کیا اور اس طور بسر کیا کہ کوئی نذر دار صاحب ثروت ایسی بھرپور دلچسپ اور بامعنی زندگی بسر کرتا۔ وہ ہر دم فن کی دنیا میں رہتے تھے اور ہر لمحہ فن کی خوشبوؤں میں ہی دلہن کے ساتھ ریاض کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا کام صادقین نے کیا نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا میں بہت کم معاصر فن کاروں نے اتنا کام کیا ہے۔ انتھک محنت کے بغیر نہ فن کی دنیا آباد ہو سکتی ہے اور نہ خوں جگر کی نمود ہو سکتی ہے۔ صادقین نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ عوام، مظلوم عوام، انسان کی عظمت، ثقیف اور جبر و استحصال سے بغاوت ان کی مصوری کے عام موضوعات تھے۔ ان کا ایک کمال یہ تھا کہ انھوں نے خطاطی کے ذریعے فن کو خواص و عوام تک پہنچا دیا۔ اسی لیے پاکستان کا کوئی دوسرا فن کار ایسا نہیں ہے جسے خواص و عوام دونوں اس طور پر جانتے پہچانتے اور جاتے ہوں۔ اس وقت موقع نہیں ہے کہ میں تفصیل سے صادقین یا ان کے فن کے بارے میں کچھ بات کروں۔ یادوں کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈ آتا ہے۔ اس وقت تو میں قریب اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے

پیدا کیے تھے چرٹا نے جو خاک چھلان کر

## محمد نقوش کے بارے میں

ہنسل کا نوجوان خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر سے وہ اپنے راستے اور اپنی منزلیں مقرر کرتا ہے۔ میری نسل کا نوجوان جب خواب دیکھتا تھا تو اس میں بڑا مصنف، بڑا شاعر، بڑا صحافی، بڑا مؤجد یا علم حاصل کر کے بڑا آدمی بننے کی خواہش مضمر ہوتی تھی اور وہ نوجوان خود کو اپنے خواب کی تعبیر کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ یہ وہ خواب تھے جن سے معاشرے میں بڑے آدمی پیدا ہوتے تھے اور معاشرہ ہر دم سرسبز و شاداب رہتا تھا۔ آج کا نوجوان بھی بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتا ہے لیکن ان خوابوں میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سیٹھنے کی آرزو شامل ہوتی ہے۔ آسائش سے معذور زندگی، اور دولت کی ریل پیل، یہی آج بڑے آدمی کی پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں آسائش سے معذور بڑے گھروں اور کاروں کی تو کثرت ہے لیکن بڑے آدمیوں کا کال پڑ گیا ہے۔ محمد طفیل مرحوم نے بھی ”اپنے نسل کے خوابوں کے عین مطابق“ بڑا مدیر اور بڑا ناشر بننے کا خواب دیکھا اور ساری عمر اسی خواب کی تعبیر میں لگا دی اور پھر یہ ہوا کہ محمد طفیل کو سادے دنیا زمانے نے اپنے دور کا سب سے بڑا مدیر تسلیم کر لیا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے اور اسی کارنامے سے ان کا نام نہ صرف آج روشن ہے بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی روشن رہے گا۔

محمد طفیل کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ نوجوان تھے، سپیدھے سادے، خاموش طبع، کم آواز لیکن ملتسار، دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے غم گسار، مولانا اسماعیل میرٹھی کی نظم ”پن پختی“ کی طرح دن رات کام میں لگے رہنے والے، دُھن کے پورے۔

کام کے کچے، نقوش کے مرشد بھی اور نقوش کے مرید بھی۔ یہی کام تھا۔ یہی مقصد حیات تھا۔ کثرتِ ذکر سے دھڑوں ایک ہر ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ محمد طفیل کا ذکر کیجیے تو وہ محمد نقوش کا ذکر ہو گا، محمد نقوش کا ذکر کیجیے تو وہ محمد طفیل کا ذکر ہو گا۔ تاکس زنگوید بعد ازین من دیگر م تو دیگری۔ اسی لیے دونوں اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جس طرح میاں بشیر احمد اور ہایوں مولانا صلاح الدین احمد اور ادبی دنیا، نیا فتح پوری اور نگار شاہ احمد طہوی اور ادبی حکیم یوسف اور نرگس خیال، بیادلی جہانم کا عظیم دور تھا اور محمد طفیل اور نقوش اسی روایات کی پختی کرتے تھے۔ ”نقوش“ کے کسی فکری یا ادبی تحریک کو جنم نہیں دیا لیکن اردو ادب کے بہترین شہ پاروں کو گھر گھر بچا کر فروغِ ادب کی عظیم خدمت انجام دی اس میں معاصر ادب بھی شامل ہے اور کلاسیکی ادب بھی۔ نقوش کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ محمد طفیل اسے معیاری مواد سے مزین کر کے حسنِ ترتیب اور ذوقِ جمال کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جو پڑھتا داو دیتا اور پھر سنبھال کر محفوظ کر لیتا۔ اسی لیے نقوش وہ واحد رسالہ تھا جو پڑھا بھی جاتا تھا اور سینٹ کر، سنبھال کر رکھا بھی جاتا تھا۔ نقوش کی شہرت کا راز یہ بھی تھا کہ محمد طفیل نے ایسے معیاری اور بلند پایہ خاص نمبر شائع کیے کہ جو مواد کے اعتبار سے منفرد اور حسنِ ترتیب کے اعتبار سے بے مثل تھے اور جن کی مجموعی تعداد سنا ہے۔ محمد طفیل معیاری ادب کا اتنا بڑا گلاسِ مہالب بھر کر پیش کرتے کہ قارئینِ ادب کے ذوق کی پوری طرح آسودگی ہو جاتی۔ غزل نمبر، شخصیات نمبر، مثنوی نمبر، مکاتیب نمبر، شوکت کھاناوی نمبر، آپ بیتی نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر اور اسٹیمیں رسول نمبر وہ خاص شمارے ہیں جو اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں اور جن کا ذکر کا سارے بزرگ عظیم میں بک رہا ہے۔

محمد طفیل مرحوم نے نقوش میں بلند پایہ تحقیقی مقالات شائع کر کے جدید اور قدیم کی حد فاصل کو پاٹ دیا۔ اس سے ایک طرف جدید تحقیقات کی روشنی نے علمِ ادب کے معلقوں کو متوجہ کیا اور دوسری طرف خود نقوش نئی تحقیق کا حوالہ بن گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اساتذہ یہ حوالے پھیلنے اور بڑھتے جائیں گے اور انہیں حوالوں کے تعلق سے نقوش کی اہمیت ہمیں قائم و دائم رہے گی۔ نقوش اور دوسرے علمی و ادبی رسالوں میں یہ بنیادی



فرق ہے اور اسی لیے نقوش نئے اور پرانے دونوں حلقوں میں یکساں مقبول تھا اور مقبول رہے گا۔

محمد طفیل کی شخصیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ کم گو تھے۔ یہ خصوصیت اس نسل کے دور کے ادیبوں کی ایک عام مشترک خصوصیت تھی۔ اس دور کے ادیب کم بولتے اور زیادہ لکھتے تھے۔ آج کے دور کے ادیب کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور پر زیادہ بولتے اور کم لکھتے ہیں۔ زیادہ بولنے میں فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ رنگ چوکھا آتا ہے اور کم بولنے اور زیادہ لکھنے میں نقصان یہ ہے کہ فائدے کا پتا بہت دیر میں چلتا ہے۔ محمد طفیل کے نفع نقصان کا پتا بھی اسی لیے دیر سے چلا اور اسی لیے وہ مرنے کے بعد آج بھی زندہ ہیں۔

محمد طفیل کے نام کام اور شخصیت کے ساتھ مثنوی مولانا جامی کی وہ حکایت مجنوں یاد آتی ہے جس میں ایک صحرانورد نے مجنوں کو تنہا بیٹھے اور اپنی انگلیوں کے قلم سے ”ریت پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا“ صحرانورد نے مجنوں سے پوچھا کہ یہ خط کس کے نام لکھ رہے ہو ابھی تیزا ہوا کا ایک جھونکا آئے گا اور سب کچھ مٹا کر رکھ دے گا۔ مجنوں نے جواب دیا :

گفت شرح حسن بیلے می دہم  
خاطر خود را تسلی می دہم  
تا چشم دیدم جرعه از حباب او  
عشق بازی می کنم با نام او

یہی سچے عاشق کی پہچان ہے اور محمد طفیل، خدا انھیں کر دے کر دے چھین دے، ایک ایسے ہی عاشق تھے جو ساری عمر اپنے خوابوں کو حقیقت

میں ہد لئے کئے لیے ادب سے عشق بازی کرتے رہے۔ ان کے کام کی خوشبو آج بھی  
چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور ہمارے مشام جاں کو معطر کیے ہوئے ہے شاید  
جرات نے یہ شعرا ایسے ہی عاشقوں کے لیے کہا تھا :

جو مرہیق تھا پڑا جاں بلب خبر اور کچھ نہیں اس کی اب  
مگر اتنا کہتے ہیں لوگ سب کہ بڑا یہ نیک خصال تھا

(۶ جولائی ۱۹۸۷ء)

## مولانا ماہر القادری

انسان فانی ہے اور اسے ایک نہ ایک دن اس کو دنیا سے رخصت ہونا ہے لیکن اس کے کلام اور اس کے کارنامے ہر سوں بلکہ صدیوں تک زندہ و باقی رہتے ہیں۔ گویا تخلیق کم فانی یا لا فانی ہوتی ہے اور یہی وہ حقیقی معیار ہے جس پر ہر کسی شخص کی جڑانی کو پکھنا چاہیے۔ اس دور میں جب علم و ادب اور فن و ہنر بے وقاحت ہو کر رہ گئے ہیں اور انسان کی جڑانی صرف روپے کی ریل پیل سے ناپی جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ علم و ادب و فن معاشرتی اقدار کے عدم توازن کا شکار ہو کر اپنی پشت چلے گئے ہیں اور بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو اپنی زندگی کا مقصد علم و ادب کو قرار دیتے ہیں۔ اسی منفی رجحان کی وجہ سے ادب و فن کے نام پر اب وہ کام سامنے آ رہے ہیں جن کا مقصد تخلیق کے بجائے صرف حصولِ زر ہے۔ آج ہمارا معاشرہ محبِ زر کی شدید بیماری میں مبتلا ہے اور یہ بیماری اب کم و بیش ہر طبقہ میں پھیل گئی ہے۔ آج کے اس معیار سے دیکھیے تو مولانا ماہر القادری صاحبِ زر نہیں تھے اور اس لیے بڑے آدمی بھی نہیں تھے لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود ہم ان کی یاد منانے کے لیے یہی نادر منعقد کر رہے ہیں۔ یہی نادر تو بڑے لوگوں کے لیے منعقد کیا جاتا ہے؟ اس ہی نادر کے انعقاد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں ایک طبقہ کج بھی ایسا موجود ہے جو ذریعہ ہستی کے دھماکا کو معیارِ زندگی تسلیم نہیں کرتا بلکہ تخلیقی فن کو عظمت کی کسوٹی سمجھتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کی وجہ سے علم و ادب اب گہما گہما و زندہ ہیں۔

علم اخلاق کے جوہر کو چلا دیتا ہے اور جہل کے پردے کو اٹھا دیتا ہے۔ اسی سے

عظمت انسان نہیں ہوتی ہے۔ مولانا ماہر القادری اسی لیے بڑے کومی تھے۔ انھوں نے ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں گزاری اور اپنی ساری صلاحیتوں کو جہل کے پردے اٹھانے اور اخلاق کے جوہر کو جلا دینے پر صرف کر دیا۔ ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی بیباکی کے ساتھ سچائی کا اظہار تھی۔ وہ جس بات کو حق جانتے ہوئے اس کا اظہار کرتے۔ اسی وجہ سے وہ ہر محفل میں اکثر بحثوں میں گمبھ نظر آتے۔ مولانا سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی اور شعر و ادب کی محفلوں میں اکثر ہوتی رہی۔ جب ملتے محبت و غلوں سے ملتے اور ہمیشہ پوچھتے: "اب کون سی کتاب پر کام ہو رہا ہے؟" "فاران" پابندی سے مجھے بھولتے کبھی دسٹی کبھی ڈاک سے۔ خط لکھنے میں بڑے ماہر تھے۔ پابندی سے جواب دیتے۔ ایک دفعہ کسی محفل میں زبان کے مسئلے پر مجھ سے الجھ پڑے۔ میں نے عرض کیا کہ جب بات بڑھ جلتی تو ضروری ہے کہ مستند کتابوں سے رجوع کیا جائے تاکہ بات صاف ہو جائے۔ کہنے لگے کہ ہاں یہ بات آپ نے ٹھیک کہی۔ میں نے گھر آکر لغات دیکھیں اور اتفاق سے میری بات درست نکلی۔ مولانا کا دوسرے دن فون آیا۔ کہنے لگے کہ لغات میں تو وہی لکھا ہے جو آپ کہہ رہے تھے لیکن بات اس کے علاوہ بھی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں زبان کے نکات و رموز پر اتنی قدرت حاصل ہو۔ زبان کے سلسلے میں سیکڑوں صفحات پر پہیلی ہوئی ان کی تحریر ہی آج بھی مختلف رسائل و جرائد میں بکھری ہوئی ہے جنہیں یکجا و مرتب کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ "آر و لغت" کے سلسلے میں جس جانفشانی و محنت سے زبان و معنی کے نکات کو بغیر کسی معاذ حقے کے بیان کیا اس کی داد ہمیشہ دی جائے گی۔

مولانا کی فکر و شخصیت کی کئی جہتیں تھیں۔ وہ شاعر تھے اور اپنے دور کے نامور شاعر تھے جن کا کلام نہ صرف ہر اچھے رسالے میں شائع ہوتا تھا بلکہ کوئی بڑا مشاعرہ ان کے بغیر بڑا ہونے سے کچھ کم رہ جاتا تھا۔ وہ جان مشاعرہ بھی تھے اور جان محفل بھی۔ اپنے فقروں و طیفیوں اور دلچسپ انداز سے محفل کو زعفران زار بناتے رہتے تھے جیسی محفل ہوتی تو جیسی ہی غزل یا اشعار پڑھتے ان کے خریطہ کلام میں ہر قسم کا مال تھا جسے وہ چپ

طلب تقسیم کرتے رہتے۔ ان کی شخصیت کی دوسری جہت یہ تھی کہ وہ ایک ممتاز ماہر زبان تھے۔ الفاظ و محاورات کے معنی و مفہوم کے لطیف و ہاریک پردوں کو وہ جس طرح اٹھاتے تھے بہت کم لوگوں کو یہ سلیقہ و شعور حاصل ہے۔ تیسری جہت یہ تھی کہ وہ ایک باسلیقہ مدیر تھے۔ ۱۹۴۹ء سے وفات (مئی ۱۹۷۸ء) تک وہ باقاعدگی سے فاران نکالتے رہے جو ان کی وفات کے بعد اب بھی مولانا اسماعیل احمد میمن کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے نے دو قابل ذکر کام کیے۔ ایک یہ کہ صحت زبان کے مسئلے کا اپنے پڑھنے والوں میں شعور پیدا کیا۔ دوسرے ادب و اخلاق کے رشتے کو گہرا اور استوار کیا۔ مولانا ماہر کا مقصد ادب یہ تھا کہ ادب اخلاق کے جوہر کو چلا دیتا اور پاکیزگی فکر و خیال کو پروان چڑھاتا ہے۔ دین ان کی سیاست تھی اور یہی وجہ ہے کہ فکری سطح پر وہ مولانا مودودی مرحوم سے بہت متاثر تھے۔ اسی انداز نظر سے فاران کا مزاج بننا تھا۔

مولانا ماہر القادری عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔ اس کا اظہار کثرت سے اور بار بار ان کی شاعری میں ہوا ہے۔ ان کی نعیں ہم عام طور پر محفل میلاد میں آج بھی سنتے ہیں اور اس طرح سنتے ہیں کہ ہمارے دلوں کی تاریکی نور کی حرارت سے دور ہو کر آنسوؤں کی صورت میں بہہ جاتی ہے۔ ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کا اخلاص تھا۔ وہ ایک سمجھدار مخلص انسان تھے۔ ایک خلوص نے شعور ہوتا ہے اور ایک خلوص باشعور ہوتا ہے۔ بے شعور خلوص بارش کے پانی کی طرح ٹائیلوں میں بہہ کر ضائع ہو جاتا ہے اور باشعور خلوص انسان و انسانیت کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ماہر القادری نے انسان و انسانیت کی قدروں کو اس دور زر پرستی میں بھی پروان چڑھایا۔ مولانا کے دو شعر ہیں :

خوف ہو یا لالچ ہو یا رے! موت ہے یہ فنِ کاروں کی  
دیس کی دھن میں گھانے والو! یہ دھن تو درباری ہے  
اہل قلم کا پاک جانا ہے علم و ادب کی رسوائی  
سچی بات کہے گا کیا وہ جس کی زباں سرکاری ہے

یہی وہ اخلاص ہے جس نے ان کے قلم، ان کی زبان میں پائی اظہار کی نوک کو تیز کر دیا تھا اور یہی وہ اخلاص تھا جس کی گرمی سے سننے والوں کے دل پگھل کر آب ہو جاتے تھے۔

کچھ بہت کم لوگوں کو یہ بات شاید یاد ہے کہ مولانا ماہر القادری افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھے اور ان کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو کر عام پڑھنے لکھنے والے (۱۹۳۶ء)، غلام حیات (۱۹۳۷ء)، محبت بھرے خطوط (۱۹۴۱ء)

حسن و شباب (۱۹۳۵ء)، پہلے (۱۹۳۶ء)، ٹینگے (۱۹۵۳ء) ان کے افسانوں کے چھوٹے مجموعے ہیں۔ جب میں جون پٹی (۱۹۴۲ء) کردار (۱۹۴۲ء) اور کائناتی ہاؤس (۱۹۴۹ء) ان کے تین ناول ہیں، رشتہ کی یہ سب کتابیں خالص رومانوی انداز کی ہیں۔

کاروانی حجاز ان کا ایک سفر نامہ ہے۔

مولانا ماہر القادری کی شاعری کے بھی کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں ظہورِ ندی

(۱۹۳۶ء)، نعتیہ کلام، محسوسات، ماہر (۱۹۴۱ء)، انغمات، ماہر (۱۹۴۳ء)، جذبات، ماہر (۱۹۴۳ء)، ذکر و جمیل (۱۹۴۳ء)، فردوس (۱۹۵۵ء) شامل ہیں۔ ابھی

ان کا بہت سا کلام ایسا ہے جو کتابی صورت میں شائع کیا جانا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک طویل مثنوی انھوں نے کراچی کو موضوع بنا کر لکھی تھی اور اس کی ایک نقل مجھے بھی نیا دور میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی۔ آج ان کی شاعری کے مجموعے عام طور پر نہیں ملتے۔ بہتر یہ ہے کہ کلیات، ماہر القادری کے نام سے ان کے سارے کلام کو یکجا

کر کے زمانے کی گود میں ڈال دیا جائے۔ یہ کام مداحانِ ماہر کو فوراً کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کی نثری تحریروں، بالخصوص ان مضامین کو جو زبان کے تعلق سے لکھے گئے ہیں، جمع کر کے شائع کرنا چاہیے۔ مرحوم اودھو شعر کے بارے میں جو تحریروں انھوں نے فاران میں لکھیں وہ تو کتابی صورت میں کچھ عرصہ پہلے شائع ہو گئی ہیں۔ اب ان کی دوسری تحریروں کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مولانا ماہر اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ کراچی کی ادبی محفلیں سونی ہو گئی ہیں۔ مشاعرے اب بے رونق ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان محفلوں کو دوبارہ آباد کرنے

کے لیے ضروری ہے کہ ہم مولانا مہار کے مدرسہ فکر کو آباد کریں اس کی ترویج و اشاعت کریں اور ادب و فن کی تخلیق کی اہمیت کو دوبارہ اپنے معاشرے میں قائم کریں۔ تخلیق ہی سے معاشرے کو پاتے اور زندہ رہتے ہیں ورنہ جنگل بن کر دشت و صحرا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

(۱۶ جولائی ۱۹۸۶ء)

## ابراہیم جلیس

تاریخ اور دنیا و نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ ۱۵۵۰ کا موسم گرم تھا جب ابراہیم جلیس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ کسی اخبار میں کام کرتے تھے۔ اور بہادر یار جنگ ہائی اسکول میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا ڈرامہ "دلی کی آخری شمع" دیکھنے آئے تھے۔ نظر حیدر آبادی مرحوم نے تعارف کرایا کہ یہ ابراہیم جلیس ہیں۔ مشہور افسانہ نگار۔ یہ سن کر ابراہیم جلیس نے قہقہہ لگایا۔ یہی قہقہہ آج بھی میرے کان میں گونج رہا ہے۔ منہ مکھ شاداب چہرہ، لمبا قد، گھنے سیاہ بال، بھرا بھرا جسم، روشن آنکھیں، پیر پرے پر خلوص کی نرمی جو آنکھوں کی چمک میں بھی شامل تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ شاید برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں اس وقت ان کی دو کتابیں "چالیس کروڑ بھکاری" اور "چور بازار" چڑھ چکا تھا اور ان کے متعدد افسانوں سے لطیف اندوز ہو چکا تھا۔ ابراہیم جلیس نہ صرف موہنی شخصیت کے مالک تھے بلکہ ان کا قلم بھی موہنی قلم تھا۔ ان کی تحریر دلوں میں اتر جاتی تھی۔ جو چڑھتا تھا ان کا گردیدہ ہو جاتا تھا۔ ان کی تحریریں ان تحریروں پر مشتمل ہوتی تھیں جو براہ راست زندگی سے حاصل کیے گئے تھے۔ ان کا دل دردمند عوام کے دل کے ساتھ دھڑکتا تھا اسی لیے اس میں وہ روح معاشرہ شامل تھی جو تحریروں کو پُر اثر بنادیتی ہے۔

پاکستان اگر اس دور کے ہر نوجوان کی طرح، انھوں نے اپنی صلاحیت اور اپنی محنت سے اپنی زندگی کو بنایا اور وہ شہرت اور عزت حاصل کی جو کم لوگوں کو میسر آئی۔ وہ ساری عمر کسی نہ کسی اخبار سے وابستہ رہے اور اپنی خوش رنگ تحریروں سے قارئین کے ایک وسیع حلقے



کو متاثر کرتے رہے۔ جدید اردو صحافت کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی ابراہیم جلیس کا نام روشن حروف میں لکھا جائے گا۔ انھوں نے اپنے کالم سے تحریر کا ایک نیا مزاج پیدا کیا۔ اپنے پڑھنے والوں میں ایک نیا شعور پیدا کیا۔ معاشرتی مسائل کی طرف ان کی توجہ دلائی اور اس طرح عوام و خواص کے ذہن کو بدلنے اور اسے آگے بڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

ابراہیم جلیس زندہ دل انسان تھے۔ ہر محفل میں سمجھتے تھے اور ہر حلقے میں مقبول تھے۔ چھوٹوں میں چھوٹے اور بڑوں میں بڑے۔ نہایت مہذب اور شائستہ۔ شریف النفس اور وضع دار۔ دوسروں کے کام کئے والے۔ دکھ درد میں شریک ہو کر دوسروں کے غموں میں ہاتھ بٹانے والے۔ اس زمانے میں جن نوجوانوں نے ادب کے افق کو وسیع کیا ان میں نظر ڈیپاہن کا خواجہ معین الدین، صدیقی نقوی، عبدالقیوم اور عبدالماجد کے علاوہ ابراہیم جلیس کا نام شامل تھا۔ اب یہ سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور اپنا اپنا وقت پورا کر کے چلے گئے ہیں :

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

لیکن ان کے نام، ان کے کام کے ساتھ کج بھی ہمارے لیے شمع نور ہیں۔ ابراہیم جلیس روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ایسا جاندار و پُر اثر قلم ہر کھنڈنے والے کو نہیں دیتے۔ جس صلاحیت اور قوت قلم کا اظہار مرحوم ابراہیم جلیس نے سترہ سال کی عمر میں کیا وہ ۵۵ سال کی عمر تک روز افزوں قوت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ تحریر یا فسرہ ہو کر مزہا نہ لگتی ہے لیکن ابراہیم جلیس کا قلم آخر وقت تک تو مزہ تو اتار رہا اور اس کا رنگ و اثر ہمیشہ قائم رہا۔ اگر پاکستان کے نامور صحافیوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو ابراہیم جلیس کا نام فہرست کی لوح پر لکھا جائے گا۔ وہ ساری عمر نامور ادیب اور صفت اول کے صحافی کی حیثیت سے مشہور رہے اور یہ اللہ کی دہی ہے جسے بھی

ابراہیم جلیس اب ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی وفات کو ۸ سال ہو گئے ہیں۔ آٹھ سال کا عرصہ انسان کی زندگی میں خاصا عرصہ ہوتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کل ہی اس جہان سے گزرمے ہیں۔ اس احساس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں کا جادو کچ بھی ہمارے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ابراہیم جلیس یقیناً مر گئے ہیں لیکن ابراہیم جلیس آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی تحریروں آج بھی اپنی شگفتہ بیانی سے ہمارے دلوں کو موہ رہی ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی شاید اسی طرح متحرک رہیں گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی مختلف تحریروں اور کالموں کا ایک کڑا انتخاب کر کے شائع کیا جائے تاکہ ان کی تحریروں اخباروں کے قبرستان سے زندہ معاشرے کے صاحبان ذوق تک پہنچ سکیں۔ ابراہیم جلیس کی یاد کو تازہ رکھنے، ان کی تحریروں کو نئی نسلوں تک پہنچانے کا سب سے بہتر اور سب سے موثر طریقہ یہ ہے۔

موت برحق ہے۔ وہ سب کو آتی ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہی موت ہے۔ اس وقت مجھے حیرت کا یہ شعر یاد آتا ہے:

دنیا میں دیر رہنا ہوتا نہیں کسو کا

یہ تو سرائے فانی اک کارواں مر رہے

مرنے والوں کی یاد کو زندہ و تازہ رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو ان کی تحریروں کو آنے والی نسلوں تک پہنچاتے رہنا چاہیے اور یہی میری آپ سب سے گزارش ہے۔

# کامل القادری مرحوم

۲۷ جولائی ۱۹۸۲ء کو کامل القادری اچانک وفات پا گئے اور کہیں تیسرے دن اخباروں کو معلوم ہوا کہ کراچی شہر کی علمی و ادبی زندگی کو نہان کرنے والا شخص مسافہ روڈ کے ایک کوارٹرس میں پر صول رات مر گیا ہے:

ہن جن کو ہم یہ عشق کا آزار مر گئے  
اکثر بہارے ساتھ کسے یاد مر گئے

وہ لوگ جو کامل القادری کو جانتے تھے میرے ساتھ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ ایک بہت مخلص انسان تھے۔ سونے کی طرح کھرے اور کینے کی طرح صاف۔ علم و ادب ان کی زندگی تھے اور وہ دن رات اپنی دھن میں مگن اسی کام میں لگے رہتے تھے۔ زبان کے سچے۔ بات کے کچے۔ متعدد کتابوں کے مصنف، شاعر، ادیب، محقق، نقاد، بلوچستان اور اس کی تہذیب کے عاشق، کامل القادری پہلے پاکستانی ادیب و محقق ہیں جنہوں نے بلوچستان کو اپنا موضوع بنایا اور اس کی تہذیب و تاریخ کے بارے میں کئی کتابیں اردو و انگریزی اور بلوچی، برہوی میں لکھیں۔ کامل القادری کے اس کام نے، اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، بلوچستان کی نئی نسل میں ایسا اعتماد پیدا کیا کہ اب وہاں اس موضوع پر کام کرنے والوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔ کراچی میں رہتے ہوئے بھی ان کا دل بلوچستان کی وادیوں اور کہساروں میں بٹکتا رہتا تھا اور ان کی بے قرار روح ہر وقت وہاں کی تہذیب و تاریخ میں سفر کرتی رہتی تھی۔ برہوی زبان میں ان کی کتاب ”سُرخ“ برسوں سے شامل نصاب ہے۔ جس لگن اور دل جمعی کے ساتھ

کامل القادری مرحوم نے بلوچی ادب و تہذیب کی خدمت کی اسے پاکستان کی تہذیبی تاریخ جو کسی ملک کی بنیادی تاریخ ہوتی ہے، فراموش نہیں کر سکتی۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا ایک اہم علمی مقالہ ”اردو اور براہوئی“ شائع ہوا تو اس مقالے نے لسانی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ مہات بلوچستان کے نام سے دو جلدوں میں ان کی کتاب تقریباً دو سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اتفاق دیکھئے کہ ۱۳/۱۱/۱۹۸۱ء کو کامل القادری اپنی اس کتاب کی تقریب رونمائی میں اسٹیج پر موجود تھے اور محترم میر علی احمد خان تاپور صاحب آج کی طرح، جہان گرامی و خصوصاً تھے اور یہ خاکسار آج ہی کی طرح اصد رجلسہ تھا اور آج ۱۲ فروری ۱۹۸۳ء کو ہم سب ماشاء اللہ موجود ہیں لیکن کامل القادری اس لیے موجود نہیں ہیں کہ وہ اب ہم سے اتنی دور چلے گئے ہیں کہ واپس بھی نہیں آسکتے۔

بہرہ آگئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ

غائباً زیر زمیں قیبر ہے آرام بہت

کامل القادری بڑی خوبیاں اور بڑی صلاحیتوں کے انسان تھے۔ میں نے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں جو پوش و شعور کے ساتھ باطل زندگی گزارتے ہیں لیکن یہ عمل ان کی اپنی ذات یا اپنے فائدے کے لیے نہیں بلکہ علم و ادب کی خدمت کے لیے ہوتا ہے جس سے معاشرے کا ذہن روشن اور تہذیبی ترقی کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوتا ہے۔ کامل القادری نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں بلکہ قوم و معاشرے کے لیے وقف کر دی تھی۔ ساری عمر وہ یونہی بسر کرتے رہے اور آخر دم تک اسی عمل میں لگے رہے اور جب ۱۲ جولائی ۱۹۸۳ء کو انھوں نے اچانک وفات پائی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ خان کا کوئی ذاتی مکان تھا اور ان کے پاس پیسہ تھا اور حکومتی ایسا وسیلہ جس سے ان کے بعد ان کی بیوی اور ان کے چھ چھوٹے چھوٹے بچے اپنا پیٹ پال سکیں۔ ایسے معاشرے میں جہاں کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہے زندگی کی بنیادی ضروریات کو چھوڑ کر علم و ادب کی خدمت کرنے بظاہر کوئی عقل مند ہی کی بات معلوم نہیں ہوتی لیکن کامل القادری جیسے لوگوں کی دلچسپی ہی نے اس دنیا دار اسلامی معاشرے کو زندہ رکھا ہے اور اسے نور و روشنی عطا

کی ہے۔ یہ بات دنیا دار معاشرے کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور آئی بھی نہیں چاہیے کہ یہ اس کے اختیارِ فہم سے باہر ہے لیکن اگر معاشرے میں علم و ادب، تاریخ و تہذیب کی بے لوث خدمت کرنے والے دیوانے باقی نہ رہیں تو سارا معاشرہ محض بڑا سا گھٹا جنگل بن کر رہ جاتا اور اس میں رہنے والے دشمن درندے سب ایک دوسرے کو کھا جائیں۔ اس لیے وہ صاحبانِ اقتدار اور وہ صاحبانِ دولت و ثروت، جو جوش مند ہوتے ہیں، علم و ادب کے دیوانوں کو سہارا دیتے ہیں، ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں اور ان کے اس عمل سے اپنے نام کو روشن کر کے تاریخ میں نیک نام ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ علم و ادب کے دیوانے اپنے اچھے ٹہرے کو نہیں سمجھتے یا وہ کم عقل اور کند ذہن ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے لیے یہی کٹھن اور اذیت ناک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ کانٹوں بھرا راستہ جسے صاف کر کے وہ خود تو بولہا ہو جاتے ہیں لیکن سارے معاشرے کے لیے خوشبو و لطافت کے سدا بہار پھول کھلا جاتے ہیں اور اس طرح معاشرے کی 'بصارت' میں 'بصیرت' کا اضافہ کرتے ہیں۔ اسے صاحبانِ اقتدار و ثروت انھیں حقارت کی نظر سے مت دیکھو کہ یہ غریب لوگ یہ دیوانے فی الحقیقت بہت بڑے لوگ ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں جو محض اقتدار اور دولت سے نہیں کیا جاسکتا۔ میر، غالب، اقبال نہ صاحبانِ اقتدار تھے اور نہ صاحبانِ دولت لیکن آپ خود دیکھیے کہ آج ہم اپنے معاشرے کو، اپنی تہذیب کی روح کو، اپنی بصیرت کو انھیں کے ناموں کے سہانے ہیں۔ آج ہی دیوانے ہمارے معاشرے کی، ہماری تہذیب کی شناخت ہیں اور ہم خود کو انھیں دیوانوں کے حوالے سے جلتے اور فخر کرتے ہیں۔ مگر ہمارے فرزانے، صاحبانِ اقتدار اور صاحبانِ دولت ان دیوانوں کو ان کی اپنی زندگی میں پہچان لیں اور ان کے لیے صرف اتنا کریں کہ جو ایک زندہ قلمی معاشرے میں انسان کی بنیادی ضرورت کہلاتا ہے تو ہمارا معاشرہ کتنا زندہ اور کتنا فعال و پُر قوت ہو کر دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں شامل ہو جائے۔ ہمارے ادیب، ہمارے مفکر و دانش ور جن حالات میں کام کرتے ہیں، معاشری بدحالیوں کی جس کش مکش سے ہر وقت دوچار رہتے ہیں اور اپنی باطنی آواز سے مجبور ہو کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اُسے ہم فی سبیل اللہ جہاد ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ

بات ہم سب کو یاد رکھنی چاہیے کہ روئی پٹرا مکان انسان کی فی الواقع بنیادی ضرورت ہے اور جب یہ میسر آجائے تو اس کے بعد ہی دوسری ذہنی و علمی اور فکری و تخلیقی سرگرمیاں شروع ہوتی ہیں ہمارے ہاں صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ادیب ہمارے دانشور ہمارے مفکر ساری عمر اسی بنیادی ضرورت کو پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ وہ نہیں کر پاتے جو وہ کر سکتے ہیں اور جس سے معاشرے ذمہ دار فتن اور فیک نام ہوتے ہیں۔

کامل نقادری مرحوم نے ان ساری مشکلات کے ساتھ علم و ادب کی دنیا میں بہت کام کیا اور اپنے اس کام سے نہ صرف اپنے معاشرے کا نام روشن کیا بلکہ اس کے شعور اور فکر و نظر میں بھی بہت اضافہ کیا اور اب جب وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی ہم سے رخصت ہو گئے ہیں ان کے یومی بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم ان اداروں کے پتہ دل سے شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنی ذمہ داری محسوس کی اور ان اداروں کے بھی یقیناً شکر گزار بلکہ احسان مند ہوں۔ تمہے جو اپنی اس قومی ذمہ داری کو جلد محسوس کرتے ہو۔

مرنے والے مرجلتے ہیں اور جانے والے چلے جاتے ہیں۔ ہم ان کے تعزیتی جلسے بھی کرتے ہیں اور ذرا دیر کو علم و اندوۃ کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ اس جانے والے کی تصانیف اور تحریروں کو شائع کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے کتنے بڑے بڑے ادیب اور دانشور ان چند سالوں میں ہم سے جدا ہو گئے۔ مڑھاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا۔ لیکن ان کی کتابیں جو کبھی چھپی تھیں اب نایاب ہیں۔ کیا یہ ہماری قومی ضرورت نہیں ہے کہ ہم مرنے والے دانشوروں ادیبوں اور مفکروں کو خراج تحسین پیش کرنے اور علمی ادبی و فکری روایت کے تسلسل کو باقی و زندہ رکھنے کے لیے ان کی ساری مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں کو شائع کریں تاکہ نئی نسل ان کی تحریروں سے فکر و ادب کے چراغ کو روشن رکھ سکے اور ساتھ ساتھ ان کتابوں کی رائلٹی سے مرنے والے کے خاندان کی کفالت کر سکیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان اس بنیادی کام کو ختم و خرابی انجام دے سکتی ہے۔

خواتین و حضرات! میں نے جو کچھ عرض کیا اس پر انفرادی حیثیت میں آپ بھی غور کیجیے اور جہاں تک ممکن ہو علم و ادب اور مفکر و دانش کے فروغ کے لیے اپنے اپنے طور پر عملی قدم اٹھائیے اور اپنے معاشرے کو ظلمات کی پاتال سے نکال کر روشنی و نور کا ہم پہنچانے کا سامان کیجیے۔ کامل القادری کی وفات میرے لیے جناب میر علی احمد خاں تالپور صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان، ایک گہرا فاقی غم اور ایک بڑا سانحہ ہے۔

خواجهن سے لطف و زیست سو سے یاد رکھئے

لیکن قومی سطح پر کامل القادری کی وفات ان عبرت ناک معاشرتی حالات کی طرف ہیں متوجہ کرتی ہے جن کی آمد جیوں میں علم و ادب کے چراغ، سمجھ بوجھ جالتے ہیں۔ کیا ہم اس صورت حال کو یوں ہی نظر انداز کرتے رہیں گے؟

(۲۴ فروری ۲۰۱۹ء)

# ڈاکٹر ایوب قادری

انجمنیں افراد سے جلتی ہیں اور افراد کے اتحاد کو عرف عام میں انجمن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ افراد قابل تعریف ہیں جو انجمن بناتے ہیں اور کام کرتے ہیں اور کام اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے دل خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اور سرشار اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ ”پہل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنانا کے مطابق اپنی سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایسے نیک کام کرتے ہیں کہ کام کے حوالے سے ان کا نام بھی زندہ و باقی رہتا ہے۔ محمد تقی تیسرے شاید ہی لیے کہا تھا خدا ایسا کچھ کرے کہ چلویاں کہ بہت یاد رہو

آج کی تقریب میں ”ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایوارڈ“ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جا رہا ہے۔ آج کی تقریب اس لیے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے جو جامعہ کراچی کے وائس چانسلر اور پروفیسر کنگ دہندہ کے نامور مورخ تھے، تاریخ کو اس طور پر پیش کیا کہ ماضی کو حال میں لاکھڑا کیا اور ساتھ ساتھ اسے مستقبل سے ملا دیا۔ یہ تینوں زمانے اور ان زمانوں کا شعور وہ زاویہ ہے جو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے تاریخ کو دیا ہے۔ تاریخ انسان کے حافظے اور اس کے کارناموں کا نام ہے۔ مورخ انھیں یکجا کر کے اس طور پر بیان کرتا ہے کہ انسانی حافظہ زندہ ہو جاتا ہے اور ایک نیا شعور اس کی اجتماعی قوتوں کو تندہ و تیز و تیز بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی نگہ و شعور کو زندہ و متحرک کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ وہ قومیں جو تاریخ کو بھلا دیتی ہیں، تاریخ انھیں بھلا دیتی ہے۔ وہ قومیں جو تاریخ سے



سبق نہیں سیکھتیں ہمیشہ خوار رہیں ماندہ رہتی ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تاریخ ہمیں وہ بتاتی ہے جو ہم ہیں اور ساتھ ساتھ وہ بھی بتاتی ہے جو ہم بننا چاہتے ہیں۔ آج بحیثیت قوم ہم وہ ہیں جو تاریخ نے ہمیں بتایا ہے لیکن ہم وہ نہیں ہیں جو ہمیں بننا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تاریخی شعور کو اپنی قومی زندگی کے دریا میں شامل نہ کر کے خود قوم کے دریا کو خشک کرنے کا عمل شروع کر رکھا ہے۔ ہم اسی لیے زر پرست ہو گئے ہیں۔ ایسے زر پرست کہ میدانِ حشر میں ہونے والی نفساً نفسی کا سماں ہمارے چاروں طرف ہو رہا ہے اور ہم ایک دوسرے سے بے نیاز دولتِ ثور نے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ آدمی دولت حاصل کرے لیکن اس کی محنت میں مبتلا نہ ہو۔ یہی رویہ دولت مند اور زر پرست میں فرق پیدا کرتا ہے۔ ہم بحیثیت قوم مفلس ہیں لیکن ہم بحیثیت فرد حشمتِ زر کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اسی لیے زندگی کی دوسری قدریں ہمارے معاشرے میں سوکھ کر مرجھا رہی ہیں۔ ہم آدمی کو ”دے“ سے پہچانتے ہیں اور ”بے زر“ کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اہل علم بھی اسی لیے زر پرستی کی دوڑ میں لگ گئے ہیں اور علم و ادب اور فکر و شعور کی کھیتی بُری طرح سوکھ رہی ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی کتبِ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ قومیں تاریخی شعور سے زندہ رہتی ہیں۔ ماضی کوئی پتھر یا ڈالا نہیں ہے بلکہ وہ ایک زندہ سماجی شعور کا نام ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری بھی اسی روایت کے علم بردار تھے۔ وہ ساری عمر تاریخ کو کھنگالتے رہے اور صدفِ تاریخ سے گوہرِ آبِ دارِ ہمارے سامنے لاتے رہے۔ وہ صحیح معنی میں صاحبِ علم تھے۔ کتابیں پڑھنا، کتابیں لکھنا، علم کی شمع کو روشن رکھنا اور ماضی کی شمع سے زمانہ حال کو روشن رکھنا یہی ان کا کام تھا۔ مرحوم ایوب قادری نے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ اسی کام سے زندہ رہیں گئے۔ آنے والی نسلیں انھیں اسی کام سے پہچانیں گی اور ان کا نام پاکستان کی علمی دنیا میں عزت و احترام سے لیا جائے گا۔ وہ طبیعتی موت نہیں مرے بلکہ ایک سفاک تیز رفتار سوز و گداز نے انھیں مار دیا اور وہ مر گئے۔ ہمارے عظیم و نامور خطاط استاد یوسف دہلوی بھی ایک ایسی ہی سفاکی کا شکار ہو گئے تھے۔ زر پرست

معاشرے میں صامیان علم کی موت بھی کوئی بڑا قومی سانحہ نہیں جتنی لیکن جب ہمارے معاشرے کو پوٹھ آئے گا تو ہم محسوس کریں گے کہ ہماری خود غرضانہ تیز رفتاری نے کیسا ظلم ڈھایا ہے؟ ایوب قادری کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ ابھی ان کا قلم جواں تھا سکا کرتے کا جذبہ زندہ تھا اور وہ دن رات کام میں لگے ہوئے تھے۔ جب بھی میرے پاس آتے کسی کتاب کی تلاش میں یا کسی علمی موضوع پر تہارڈ خیال کے لیے آتے۔ علم کی یہ نگین اور کام کرنے کی یہ دھن اس دور میں جہاں فرزانے بہت اور دیوانے بہت کم ہیں مجھے خال خال نظر آتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یونی کیرپن نے پس منظر ڈاکٹر ایوب قادری کو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی الوداد دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور یہ اعتراف یقیناً ایک بڑا اعتراف ہے۔

# ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان: ایک تعارف

استاذ الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب ان تابعدار روزگار ہستیوں میں سے ایک اور ممتاز ہیں جن پر نہ صرف ہم سب فخر کرتے ہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔ وہ جامع الصفات ہیں۔ ایک ہی ذات میں اتنی صفات کا یکجا ہونا ایک ایسا کمال ہے جو اس دور میں کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ عظیم استاد ہیں۔ ایسے فاضل و شفیق استاد جن کی مثال اس دور میں نہیں ملتی۔ ان کے شاگرد اس برصغیر اور بیرونی ممالک میں الفی علم و ادب پر چھائے ہوئے، اگیسوں نے زندگی کو اس طور پر سنوار رہے ہیں کہ استاد کا فیض معاشرے کو روشن و منور کر رہا ہے۔ ایسے محقق اور مفکر کہ ان کی تحقیقات نے ادب و فکر کے دروہام پر اٹھا لاکھا ہے۔ ایسے قطب اقطاب اور ایسے بزرگ ملی اشد کہ ہزاروں لاکھوں گم کردہ راہ کو راستی کی طرف مڑ کر ان کی زندگی کو نیکی کے راستے پر لگایا ہے۔ جس پر توجہ کی پادس بن گیا۔ جسے نظر کیمیا اثر سے دیکھ لیا کندن ہو گیا۔ روشن آنکھیں، شگفتہ و خنداں، ذرا نی چہرہ صاف و صیبا بھر دل میں، مژدہ جلنے والا، ہاتھ جیسے گلوں کی خوشبو، کم سخن لیکن ہر سخن میں معنی کا ایک دریا۔ جب کبھی لقمہ بن کر اپنے ہاتھ سے کھلایا اس کی لذت کلام و دہن کا مستقل مزاج بن گئی۔ چشمہ فیض ایسا کہ ہر دم جاری ہے۔ جو آیا شاد کام گیا۔ بیمار کیا صحت مند گیا۔ در ماندوں کے رفیق، دشمنوں کے دوست، سب کے لیے دعا گو۔ جب بھی دیکھنے کا موقع ملا عبادت گزاری میں دیکھا۔ دن کو بھی اور رات کو بھی۔ مزار جا فقیر لیکن امیروں کے پیشوا۔ جو لفظ دل کی زبان سے نکلا مشرف بقبولیت ہوا۔ علم اشد کہ بہت سے عالموں کے پاس مل کر نہ ہو گا۔ لکھائی ایسی کہ جیسے صفحہ قرطاس پر مونی ٹانگ دیے ہوں۔ اردو اور انگریزی پر یکساں قدرت، فلذسی و عربی

پر پوری دسترس داخلوں کے جواب اس تیزی سے دیتے ہیں جیسے ہم آپ سلام کا جواب دیتے ہیں۔ رسول کے عاشق سنت کے پیروکار شریعت و طریقت کے پابند سلسلہ نقشبند یہ ہیں میرے اُستاد۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب۔ ہادی بھی۔ راہنما بھی۔ اللہ تعالیٰ ایسے استاد سب کو دے۔ غالب نے کہا تھا 'رودہی میں' استاد کے لیے کہتا ہوں۔

تم سلامت رہو ہزار برکات ہر برس کے موت و پھاس سحر

## ۲

ڈاکٹر صاحب کی اب تک ساتھ کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں علمی، ادبی تحقیقی کتابیں بھی ہیں جیسے "سید حسن غزنوی" جو عہد غزنوی پر پہلی بنیادی تحقیق کا درجہ رکھتی ہے، "حالی کا ذہنی ارتقا" جس نے تحقیق میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی پر اردو کا اثر، علمی نقوش، 'فدائی کے قدیم شعراء تحقیقی جائزے' 'ادبی جائزے' 'تحریر و تقریر' 'میتیں برائے پوری کے مرثیے'، 'ثقافتی اردو' تو ایک ایسی کتاب ہے کہ یہ موضوع اس انداز سے پہلی بار سامنے آیا ہے! 'اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات' تحقیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے۔ 'سندھی اردو ولخت اور اردو سندھی لغت' وہ لغات ہیں جو آج سے تیس سال پہلے تالیف کی گئی تھیں اور آج تک ان پر اضافہ نہ ہو سکا۔ 'جائزہ القواعد' (حصہ ششم) وہ تصنیف ہے جو کج بھی استاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال ان کا محبوب موضوع ہے اور محبوب اس لیے ہے کہ اقبال کی شاعری میں انہیں 'روح اسلام کا فرما' نظر آتی ہے۔ اقبال اور قرآن اور معارف اقبال جیسی کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین انہوں نے اقبال کی شاعری کے تعلق سے لکھ کر 'روح اقبال' اور 'روح اسلام کو' جا کر کیا ہے۔ دیوانہ روشن اور دیوانہ علیم شوقی تدوین متن کی ممتاز مثالیں ہیں۔ ادب و تحقیق کی طرح تصوف ان کا خاص موضوع ہے اور اس موضوع پر ان کی کم و بیش ۳۰ تالیفات شائع ہو چکی ہیں جن میں رسائل مشاہیر نقشبندیہ، ملفوظات صوفیہ، ارشاد رحیمیہ،

ہدایت الطالبین، تحفۃ کواکب، وسیلۃ القبول، اثبات النبوة، رسالہ تہلیلۃ، مکاشفات عینیہ، تاریخ اسلاف، سونچا میر کلال، سجدہ البیان، گلشن وحدت، مکتوبات سیفیہ، مجمع البحرین، رسالہ سلوک، الواح خاتقاہ مظہریہ، سراج منیر اور تین ضخیم جلدوں میں مکتوبات امام ربانی اور مکتوبات محصویدہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض کتابوں مثلاً حضرات القدس، خزینۃ المعارف اور ذبذبۃ المقامات کے اردو تراجم بھی کیے ہیں۔ انگریزی میں ان کی دو کتابیں تاریخ بہرام شاہ، غازیوی اور برصغیر میں فارسی ادب قابل ذکر ہیں۔ فن لغت پر ایسا عبور کہ ماہرین فن ان کی رائے کے محتاج ہیں۔ سرتاپا انگسار اور سرتاپا علم۔ یہاں ہماری عظیم روایت حق اور کج اسی روایت کے وہ ملک بھر میں واحد اور ممتاز نمائندے ہیں۔

دین اسلام اور اس کی روایت ان کی ہر تحریر میں رنگ و خوشبو پیدا کرتی ہے۔ یہی ان کی تصنیف و تالیف کا مقصد ہے۔ ایک جگہ فی نسل سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں :

”دین کی تکمیل علم، عمل اور اخلاص سے ہو کرتی ہے..... دنیوی معاملات کے لیے بھی یہی تین چیزیں فرمادی ہیں۔ وہ علم ہے کار ہے جس پر عمل نہ ہو اور وہ عمل محض فریب ہے جس میں اخلاص نہ ہو۔ ذرا دیکھیے جو عمل (ادب) ہم پیش کر رہے ہیں اس میں اخلاص کس درجے میں موجود ہے بھی یا نہیں۔ اشتراکیت اور جنسیات اپنی جگہ مردود نہیں اور ان کا موضوع سخی بنانا کوئی عیب نہیں لیکن بقول میر کا

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

یاد رکھیے پاکستان صرف ریت کے ٹیلوں کا نام نہیں۔ وہ جس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے اس کے حصول کی کوشش کیجیے ورنہ آپ کو نہ صرف قوم کے سامنے بلکہ خدا کے سامنے جواب دینا ہو گا۔

(تحقیقی جائزے ص ۱۲۲-۱۲۳)

یہی ان کا نقطہ نظر ہے اور اسی نقطہ نظر کو انھوں نے اردو ادب کے حوالے سے اپنے ایک مضمون ”تہذیبِ جدید کا فکری بحران“ میں واضح کیا ہے۔ ان کے اندازِ نظر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہا پسندی سے پاک ہے اور اعتدال کے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جہاں سچائی اور حق کی چاندنی پھیل ہوئی ہے۔ زبان اور اہل زبان کی بحث یوں تو صدیوں سے ہو رہی ہے لیکن گزشتہ چالیس سال سے پاکستان میں کسی نہ کسی عنوان سے جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر بڑے سچے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

”کسی غیر زبان کے سیکھنے کے لیے ہم لاکھ جتن کریں ہمیں اہل زبان ہونے کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا مثال کے طور پر انگریزی کا کوئی کتنا ہی بڑا عالم فاضل کیوں نہیں جائے اس کو اہل زبان تسلیم نہیں کیا جائے گا لیکن اردو کی ذہیت مختلف ہے۔ انگریزی اجنبی اور پر دہی زبان ہے۔ اردو اسی ملک کی زبان ہے جس کا دوسری ملک زبانوں کے ساتھ خون کا رشتہ ناتا ہے اور لسانی اشتراک کی وجہ سے وہ برصغیر کے ہر حصے میں خود بخود اور اچھی طرح جانی پہچانی جاتی ہے۔ بول چال کی حد تک اس کی حیثیت جین الملکی زبان کی سی ہے اور سرکاری طور پر اسے قومی زبان کا منصب حاصل ہے اس لیے پاکستان کے ہر شہری کو اردو کے اہل زبان بننے کا آئینی حق حاصل ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی عزوری ہے کہ اس کے جو فطری تقاضے ہیں ان سے روگردانی نہ کی جائے۔ صحت کے ساتھ جو شخص بھی اردو لکھے، پڑھے اور بولے وہ اہل زبان ہے۔ اس میں پنجاب، سندھ یا کراچی کی کوئی قید نہیں ہوتی چاہیئے۔ جس طرح دلی اور لکھنؤ کا فرق وقت کے ساتھ خود مٹ گیا اسی طرح یہ امتیاز بھی ختم کرنا ہو گا۔ . . . . . میرے نزدیک ہر وہ شخص اہل زبان ہے جو صحبتِ زبان کی قید کے ساتھ اردو لکھنے اور بولنے پر قادر ہو خواہ وہ کہیں کارہنہ

ہو ۛ (تحقیقی جائزے ص ۸۳-۸۵)

یہی وہ رویہ ہے جس کی ہمیں ہمارے ملک اور قوم کو زندگی کی ہر سطح پر اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس سے مثبت اور تعمیری فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں اور یک جہتی و اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ منفی و انتہا پسندانہ رویوں سے گریز کر کے تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ استاد محترم ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی کو ایک اکائی کے طور پر اسی نظر سے دیکھا ہے اور یہی وہ طرز فکر ہے جس سے علمائے دین، صاحبانِ ادب اور اہل نظر کو ساری زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھنا چاہیے۔ یہ وصل کا راستہ ہے اور باقی سارے راستے فصل کے راستے ہیں۔ مولانا دروم نے کہا تھا:

تو برائے وصل کردن آمدی      نے برائے فصل کردن آمدی

انسانی نسلی و صوبائی تنوعات کے اس دور میں اسی طرز فکر کے باعث ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب ایک ایسی مشعل پر بزرگی حیثیت رکھتے ہیں جس سے پاکستانی معاشرے کی غلطیتیں دور ہو سکتی ہیں۔ وہ از سر تا پا محبت ہی محبت ہیں۔ وہ محبت جس سے غمشیں دل میں بہا رہا جاتی ہے اور زندگی نفرتوں کی دلدل سے نکل کر انسانیت کے بدن میں آجاتی ہے، جہاں ہر طرف مشامِ جان کو معطر کرنے والے پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ اسی شگفتگی اور اسی خوشبو سے ڈاکٹر صاحب دینی و دنیوی زندگی کو حیات و غمش رہے ہیں۔ خدا انہیں ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین۔

۲۸ فروری ۱۹۸۸ء

## اختر حسین رائے پوری

کہیں پڑھا تھا، یاد نہیں کہاں کہ ہر بالغ نظر اور باشعور انسان کی زندگی میں مشاہدات و تجربات کا اتنا تنوع اور اتنا افکھاہن ہوتا ہے کہ اگر انہیں بیان کیا جائے تو ایک دھپ ناول وجود میں آسکتا ہے لیکن عام طور پر آنا پرست اور خود دہرور انسان اپنی جڑائی کے پہاڑ بنانے میں لگ جاتا ہے اور اس کے اصل تجربات جھوٹی جڑائی کے طے طے رب کر رہ جاتے ہیں۔ اسی لیے بہت کم خود نوشتیں ایسی ہوتی ہیں جو پڑھنے والوں کے دل کو ٹھوکتی ہیں۔ ”مگر وراہ“ اس اعتبار سے اردو زبان میں ایک مختلف خود نوشت ہے۔ مگر وراہ کی خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی زندگی کے حالات، اپنے تجربات و مشاہدات کو انتہائی دھیمے انداز میں، انگسار و معروضیت کے ساتھ، آنا پرستی اور خود پروری نے نکال کر اس سادگی سے بیان کیا ہے کہ یہ خود نوشت نا دل سے زیادہ دل چسپ اور زندگی سے زیادہ حقیقی بن گئی ہے۔ ”مگر وراہ“ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ پوری کتاب میں ہیں ایک جہت، ایک زاویے کا احساس ہوتا ہے یہاں زندگی اپنے زمانے کی روح سے پیوست ہے اور زمانہ حالات سے مربوط ہے۔ ساتھ ساتھ واقعات، محالات، تجربات و مشاہدات کے مربوط بیان سے اس دور کی زندگی کے خدو خال اس طور پر ابھرے ہیں کہ زندگی اور زمانے کے رنگ کھڑ کر اس تصویر کو خوب صورت بنادیتے ہیں۔ کتاب بقا ہر مختلف ابواب میں تقسیم کی گئی ہے لیکن زاویے نظر اور جہت کے سرے اس میں ایک



ایسا ربط اور ایسی ترتیب پیدا کر دیتے ہیں کہ شروع سے آخر تک یہ ایک دل کش اور جاذب نظر تحریر بن جاتی ہے۔ یہی ربط اگر درواہ کو ایک خوبصورت اور دل فریب ساخت عطا کرتا ہے اور اسے ایک باقاعدہ تصنیف بنادیتا ہے۔ ایک ایسی تصنیف جس میں فلسفہ حیات بھی ہے اور نظریات و افکار بھی ہیں اور ساتھ ساتھ وہ انوکھی دل چسپی بھی جو ایک داستان میں ہوتی ہے۔ ایک ایسی داستان جسے ایک بالغ نظر بخند کار اور لفظوں کا پارکھ ادیب بیان کر رہا ہو۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے جب مجھ سے کہا کہ ”گر درواہ“ کے آخری پروف میں دیکھ دوں تو میں نے اس محنت کے پیش نظر تقریباً تیس سال سے میرے ادرائے کے درمیان ہے، ہامی بھری اور عرض کیا کہ ایک ماہ میں پروف دیکھ کر واپس کر دوں گا لیکن جب میں نے پروف پڑھنے شروع کئے تو تین دن میں سارے پروف پڑھ ڈالے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ میں تین دن تک اس کے علاوہ کوئی اور کام نہ کر سکا۔ اپنی زندگی کے حالات و واقعات دوسروں نے بھی بیان کیے ہیں اور متعدد خود نوشتیں اردو میں لکھی اور شائع ہوئی ہیں لیکن ”گر درواہ“ اس صنفِ ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے کہ آئندہ خود نوشت لکھنے والے اس تصنیف کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں گے۔ بظاہر یہ ایک عام سا جملہ ہے لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں پوشیدہ ہیں جن کے اظہار کے لیے ایک تفصیلی مضمون کی ضرورت ہے، جو میں کچ تو نہیں لیکن جلد لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

سردست تو میں آپ کی توجہ اس اہم تصنیف کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ جب میں اپنے اس جملے کا طلسم کھولوں تو آپ بھی میرے ساتھ شریک ہوں۔

”گر درواہ“ میں ایک اور چیز جو دل کو موہتی اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے وہ سہانی کا جرات کے ساتھ واقعاتی اظہار ہے جسے اتنی سادگی اور غلوں سے بیان کیا گیا ہے کہ سہانی کا اظہار قاری کو اپنے اثر کے سیلاب میں بہا لے جاتا ہے۔ ادبی صحافت کے اس دور میں، جب ساری زندگی اخبار کے صفحات پر اگر مبتذل ہو گئی ہے، گر درواہ اپنے خاص ادبی اظہار اور ادبی رنگ کی وجہ سے ہمیشہ ویسی ہی تازہ رہے گی جیسی

آج ہے اور جسے پڑھنے والا بار بار پڑھ کر اس کی معنویت سے اس کی خوشبو اور رنگوں کے نطرت اندوز ہوتا رہے گا۔ یہ باتیں میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری میرے سامنے موجود ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب کو دوسری بار پڑھ کر میں اس کے غلم میں اور زیادہ گرفتار ہو گیا ہوں۔ کتنی کتابیں ہیں جو آپ دو بار پڑھ سکتے ہیں۔ کتنی کتابیں ہیں جو آپ لفظاً لفظاً اور سطر بہ سطر پڑھ سکتے ہیں۔ مگر وہ ایک ایسی کتاب ہے جو ایک عرصے کے بعد پھاڑی ہے۔

یہاں میں ایک بات کی طرف اور اشارہ کرتا چلوں کہ گردوارہ میں ایک ایسا اسلوب ابھرتا ہے جو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی شناخت بن جاتا ہے اور جو لہجے کے دھیمے ہیں لفظوں کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنے کے نثر، مشاہدات و تجربات کو ناپ تول کر بیان کرنے کی خصوصیت اور صاف ذہن کے ساتھ اپنی بات پوری طرح پڑھنے والوں تک پہنچانے کے شعوری عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اسی اسلوب نے اس تصنیف کو بلند پایہ، منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب نے اس تصنیف میں بہت سے اردو و فارسی اشعار بھی استعمال کیے ہیں اور یہ سب اشعار اسی برجستگی اور خوبی کے ساتھ نثر کا حصہ بن کر آئے ہیں کہ سوائے ابوالکلام آزاد کے کسی دوسرے ادیب کے ہاں یہ حسن اشعار نہیں ملتا۔ ڈاکٹر اختر حسین صاحب نے نثر کی آگ و دھنی میں اشعار کو گنیے کی طرح جڑ دیا ہے۔ اور بھی کئی پہلو ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن یہ سب پہلو میں آئندہ کسی وقت پیش کروں گا۔

# مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

جامعہ کراچی کے لیے یہ ایک یادگار دن ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کتب ہمارے درمیان تشریف رکھتے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب ہمارے دور کی وہ منتخب روزگار شخصیت ہیں جنہوں نے جدید دور کے تعلق سے اسلام کی ترجمانی کر کے ہمارے ذہنوں کی بے شمار الجھنوں کو دور کیا ہے اور ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے جن کے جواب کی تلاش میں آج کا جدید ذہن سرگرداں ہے۔ مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ان تمام مسائل کا نہ صرف حل پیش کیا ہے بلکہ اس انداز سے پیش کیا ہے جو نئی نسل کے لیے قابل قبول اور حاذق توجہ ہے۔ اقبال بھی اسی وجہ سے مولانا کے مطالعہ کا مرکز ہیں۔ "لقوش اقبال" کے نام سے ان کی ایک تصنیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ میں مولانا کے پہلی ہارن کی معرکتہ الآراء تصنیف "مارتیج دعوت و عزیمت" کے ذریعے متعارف ہوا۔ اس وقت میں خود ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھا جو ۱۹۶۲ء میں "پاکستان کی پہچان" کے نام سے شائع ہوئی۔ "مارتیج دعوت و عزیمت" کی اب تک چار جلدیں میری نظر سے گذری ہیں جن کے مطالعے سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان کتابوں کا لکھنے والا ایک ایسا ذہین رکھتا ہے جس میں فکر و اجتہاد کے ساتھ روایت کا شعور بھی موجود ہے۔ اس کے بعد سے جہاں کہیں مولانا کی کوئی تحریر میری نظر سے گذرتی میں اُسے دل چسپی سے پڑھتا۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "انڈین مسلم" میں نے پڑھی تھی جس سے میں متاثر ہوا تھا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میری نظر سے گذری جس نے مجھ میں ایک نئی روشنی کا احساس پیدا کیا۔ اس کے بعد ان

کی ایک اور کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" جب میں نے پڑھی تو اس میں ایک ایسے زاویے سے جدید دور اور اسلام کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی تھی جو بالکل نئی تھی۔ ان کی ایک اور تصنیف "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش" بھی اسی نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتی ہے۔ ان سب تصانیف میں ہیں ایک ایسے نئے ذہن سے واسطہ پڑتا ہے جس کے لیے جدید دنیا کے مسائل اور ان کے حل کی جستجو ایک منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا کے قلم کی خوبی یہ ہے کہ وہ عام زبان میں بڑی سے بڑی بات کو اس طور پر بیان کر دیتے ہیں کہ ان کی بات پڑھنے والوں تک پورے طور پر پہنچ جاتی ہے۔ بڑی سے بڑی بات کو عام زبان میں بیان کرنے کے کٹھن تخلیقی عمل سے وہی قلم واقف ہوتے ہیں جنہوں نے لاکھوں الفاظ کو استعمال کر کے اس عمل کی شق بہم پہنچائی ہے۔ اس سلسلے میں محترم شخصیتوں پر جو قلمی تاثرات و مشاہدات مولانا نے لکھے ہیں وہ خوب صحت و حمیتوں کا معطر مجموعہ ہے جو "پرانے چراغ کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا پاکستان کو اسلام کی ایک تجزیہ نگاہ سمجھتے ہیں "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ پاکستان کا:

"یہ تجربہ جو اپنی اہمیت، اثرات اور اپنے دور رس نتائج کے اعتبار

سے تاریخ کا ایک اہم ترین اور عہد آفرین واقعہ تھا، ان ہی راہنماؤں کے ہاتھوں کامیاب ہو سکتا تھا جو اسلامی شریعت کی اہمیت اور اسلامی تہذیب کی برتری پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں جن کا خلوص اور صداقت، خود غرضی مفاد پرستی اور مصلحت کو شی سے پاک اور ہر شے سے بالاتر ہو، ان کا ذہن مغربی اقدار و افکار کی غلامی اور ان کی میرٹ غیر اسلامی تحلیل و تربیت کے اثرات سے بالکل آزاد ہو چکی ہو اور ایمان راسخ اور اخلاقی حرکت کے ساتھ جدید علوم کے پیا کردہ وسائل اور قوتوں کو اپنے اعلیٰ دینی و اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی قدرت اور آزاد و جدید اسلامی معاشرہ

”مے ماحول کے مطابق ان کو ڈھلنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔“

(ص ۱۰۰)

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

”پاکستان کا اپنے بنیادی مقاصد سے انحراف اور عصر حاضر کی دوسری نامذہبی اور تجدد پسند حکومتوں کی تقلید تدبیر جدید کا ایک عظیم سانحہ ہو گا اور ان کروڑوں افراد کے ساتھ بے وفائی جنہوں نے اس باسلامی معطل اور تجربہ گاہ کے قیام کے لیے شدید ترین تکالیف برداشت کیں اور عظیم قربانی پیش کی۔ اس سے بڑھ کر اس کا نقصان یہ ہو گا کہ یہ طرز عمل ہمیشہ کے لیے اس آئینہ اور آرزو کو مسرور کر دے گا اور اس تجربہ کی کامیابی کے امکان کو انگریز ختم نہیں تو نہایت بعید بنادے گا۔“ (ص ۱۰۳)

یہ چند باتیں میں نے اس لیے آپ کے سامنے پیش کیں تاکہ پاکستان کے حوالے سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے خیالات سے آپ متعارف ہو سکیں۔ ان کی تجربہ میں غیر معمولی تنوع ہے۔ انہوں نے عہد جدید بے شمار مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تصانیف سے لاتعداد لوگوں نے استفادہ کیا ہے اور یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ حضرت مولانا آج ہماری مادرِ علمی میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ آپ سے ابھی خطاب فرمائیں گے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں مولانا کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ جامعہ کراچی میں تشریف لائے اور سب کی طرف سے مولانا کو خوش آمدید کہتے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتا ہوں : ع

آمدان یارے کے حامی خواستیم

# ڈاکٹر سہیل بخاری: ایک تعارف

ڈاکٹر سہیل بخاری کی تصانیف پر نظر ڈالنے تو ان میں آپ کو ایک ایسا موضوع نظر آئے گا جو کم لکھنے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ ایک طرف ان کے ان تحقیق و تنقید مطلق ہے جس کے تحت جہاں "ناول نگار" کے موضوع پر ایک کتاب ملتی ہے وہیں "سب دس پر ایک نظر"، "بارش و بہار پر ایک نظر"، "غالب کے سات رنگ" اور "اقبال: مجدد عصر کے عنوانات کے تحت ان کی کتابیں سامنے آتی ہیں۔ اردو داستان کو بھی ہم اسی ذیل میں لاسکتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں بہت کم کام ہوا ہے۔ نئے نئے کرد و چادر کتابیں ہیں جن میں کلیم الدین احمد کی "فن داستان گوئی" اور گیان چند جین کی "اردو کی نثری داستانیں"، جس کا حال ہی میں ترجمہ شدہ ایڈیشن اپریل ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا ہے، یقیناً قابل ذکر ہیں۔ سید وقار عظیم کی کتاب "ہماری داستانیں" بھی اس ذیل میں شامل کر لیجیے۔ ان کے علاوہ چند مضامین کو چھوڑ کر داستانوں پر کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی زیر نظر تصنیف "اردو داستان" یقیناً اس موضوع پر ایک اضافہ ہے۔ داستانوں نے اردو کو زبان و بیان کے نئے کینڈے اور اظہار کے ایسے رنگ اسالیب دیے ہیں کہ اہل علم کو داستانوں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ پچاس کے عشرے میں حسن عسکری مرحوم نے "علم ہوشربا" کا ایک انتخاب شائع کیا تھا اور اس انتخاب سے اردو ادب کے پڑھنے والوں میں دلچسپی کا چراغ شروع ہوا تھا۔ بعض لکھنے والوں نے اس کے کرداروں اور اسالیب کو اپنی تخلیقی تحریروں میں استعمال بھی کیا تھا لیکن ان داستانوں کو پڑھنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوئی تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان

داستانوں کو دوبارہ پڑھا جائے اور ان سے وہ رنگ و نور اخذ کیا جائے جو ان ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی داستانوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر سبیل بخاری کی تصنیف سے اردو داستانوں کی طرف نہ صرف رغبت پیدا ہوتی ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ ان کے والے دور میں اردو داستانیں اور بالخصوص طلسم ہوشربا کا احیاء ہو گا اور ہمارے لکھنے والے اس بحرِ فکار میں غوطہ زنی کر کے اہل ادب کے سامنے سچے سچے نئی چیزیں کرلائیں گے۔ جب تہذیبیں اپنے سوتوں سے کٹ جاتی ہیں تو ان کے ادب کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارے ادب کا ہوا ہے۔ ہم مغرب کے چبائے ہوئے باسی لقموں کو آخر تک نگ چباتے رہیں گے۔ آپ مغرب سے سب کچھ سیکھے لیکن اپنی فضا، اپنے موسم میں سانس لیجیے۔ اسی سے آپ کی اور آپ کے ادب کی شناخت پیدا ہوگی۔ ڈاکٹر سبیل بخاری کی اس تصنیف سے ہمیں یہی راستہ ملتا ہے۔ یہ بات تو میں نے ضمناً کہہ دی۔ آپ چاہیں تو اسے جملہ معترضہ کہہ لیجیے۔ میں تو ڈاکٹر سبیل بخاری صاحب کی تصانیف کے تنوع کی بات کر رہا تھا۔ ان کا ایک اور اہم موضوع زبان و لسانیات ہے جس کے تحت ہم ان کی دو کتابوں ”اردو کا روپ“ اور ”اردو کی کہانی“ کو رکھ سکتے ہیں۔ یہاں میں ایک اور کتاب کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ ہے ”اردو کا اشتقاقی لغت“۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے اور اس پر بھی ہمیں دل کھولی کر ڈاکٹر سبیل بخاری کو داد دینی چاہیے۔ ایک اور کتاب ان کی ”تصور الوہیت“ کے بارے میں ہے جسے آپ مابعد الطبیعیات کے ذیل میں لاسکتے ہیں۔ لیکن اس کتاب کی طرف ہمارے صاحبانِ نظر کی نظر اس لیے نہیں گئی کہ ہم تو مابعد الطبیعیات کو سبھی کا ترک کرنے کی نیت کر چکے ہیں مگر ہمارے منِ عسکری برسوں اس کی طرف توجہ دلاتے رہے مگر ہم بحیثیت قوم اس کام کو جس سے ہم اپنے تہذیبی سوتوں کو تلاش کر سکیں، خیر یاد کہہ چکے ہیں۔ آخر ہم سائنس و ٹیکنالوجی کے مینار سے شیخ محی الدین ابن العربی کی رجعت پسندانہ خیالات کیوں سنیں گے۔ بہر حال ایک آدھ کتاب اور ہے جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔ شاید وہ کتاب جسے ڈاکٹر سبیل بخاری صاحب نے اس

خاکسار کے نام محزون کیا تھا۔

ان سب تصانیف پر نظر ڈالے تو سہیل بخاری صاحب ہمیں اس دور کے ایک بڑے اور اہم لکھنے والے نظر آئیں گے۔ ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے اور ان کا حق یقیناً ان کو پہنچانا چاہیے۔

(۲۲ ارجنٹائی ۱۹۸۶ء)



## بچوں کی شاعری : محشر بدایونی

حضرت محشر بدایونی شاعر بھی اچھے ہیں اور انسان بھی۔ انسان کی پہچان تو خیر ذرا دیر میں ہوتی ہے لیکن شاعر کی حیثیت سے آج سارے بزرگ عظیم میں ان کی شہرت ہے۔ کوئی اچھا مشاعرہ ان کے بغیر اچھا نہیں ہوتا۔ جہاں جلتے ہیں اپنے شعروں سے دلوں میں آتر جلتے ہیں۔ یہی اچھے شاعر کی پہچان ہے اور اسی لیے میں ان کی بڑی قدر کرتا ہوں لیکن اس قدر دانی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ جہاں بڑوں کے لیے شاعری کرتے ہیں وہاں بچوں کے لیے بھی ایسی شاعری کرتے ہیں کہ بہت کم شاعر ان کے رتبے کو پہنچتے ہیں۔ محشر بدایونی صاحب نے دوسرے شاعروں کی طرح بچوں کا حق نہیں مارا بلکہ دل لگا کر محبت کے ساتھ ایسی شاعری کی ہے کہ قوم کے بچوں کی کثیر تعداد ان کی پرستار ہے۔

۱۹۶۱ء میں ”بین باجے“ کے نام سے ان کی نظمیں کا ایک مجموعہ چھپا تھا جس کی نظمیں آج بھی بچوں کو یاد ہیں۔ یاد اس لیے ہیں کہ ان میں شاعرانہ مٹھاس بھی ہے اور سچے دلیا کی سی روانی بھی۔ ۱۹۶۲ء میں ”شاعرانہ“ کے نام سے ان کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں بیشتر سے لے کر مجاز تک اردو شاعروں کو بچوں سے متعارف کرایا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں ”سائنس نامہ“ کے نام سے ایک اور مجموعہ شائع ہوا جس میں جابر بن حیان سے لے کر ابن ہرقلہ نامی تک مسلم سائنس دانوں کو بچوں سے متعارف کرایا تھا۔ یہ دونوں مجموعے بچوں میں مقبول ہوئے لیکن ”بین باجے“ کی نظمیں بچوں کے ادب میں یقیناً اضافہ ہیں۔ اب برسوں بعد ان کا زیر نظر مجموعہ ”کلام“ ”جگ مگ تارے“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان نظموں میں بھی وہی تازگی، وہی سادگی اور وہی رچاؤ ہے جو ”بین باجے“ میں ملتی ہے۔

لیکن قحیل کی پرواز اور بچوں کی نفسیات نے شاعرانہ اثر کو اور بڑھا دیا ہے۔ یہ سب تفکیکیں ایسی ہیں کہ جس بچے کے ہاتھ لگ جائیں وہ انھیں کا ہو کر رہ جائے۔ بڑے بچے تو ماضی کے در پچھل کھل جائیں اور بچپن کی جنت سے آنے والی خوشبو سے سارا وجود نازہ دم ہو جائے۔ بچے بڑھیں تو ان میں نئی دنیاؤں کے سفر کا حوصلہ پیدا ہوا اور دنیا کی تربیت و نشو و نما ہو۔

بچوں کے لیے شاعری کرنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن ابھی شاعری کیجئے تو پتا پانی ہو جائے۔ یہ بات تو سب کہتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں لیکن کتنے شاعر ہیں جو اس بات کو اپنے عمل سے کچھ بڑھاتے ہیں۔ اسی لیے میں محشر بدایونی کا قدردان بھی ہوں اور متداع بھی۔ بچوں کی شاعری میں میں انھیں اسی روایت کا علم ہر در سمجھتا ہوں جس کی ابتدا اسمعیل میر غنی نے کی تھی۔ محشر بدایونی اسی روایت کے ممتاز شاعر ہیں۔ اب جب کہ میں محشر بدایونی کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو اس موقع پر ان سے ایک آدھ فرمائش بھی کرنا چلوں۔ اردو شاعری میں شادی بیاہ، سالگرہ، تہوار، آزادی وغیرہ کے گیت تو ہیں جو مل جل کر گائے جاتے ہیں لیکن ایسے گیت نہیں ہیں جو مختلف سماجی موقعوں پر کورس کی صورت میں گائے جاسکیں۔ یہ اس دور کے بچوں کی بنیادی ضرورت ہے مثلاً بچے بیچ دیکھ رہے ہیں، جذبات مسرت سے ان کے دل سمور دیے۔ اب ایسے موقع پر اگر کسی گیت کے لول، جس کی دھن مقرر ہو اور جسے بچوں نے اپنے اسکول میں دیکھا اور مل کر گایا ہو، جو نٹوں پر اگر کورس بن جائے تو اس سے ایک طرف نظم و ضبط پیدا ہوگا، جذبہ حب الوطنی بیدار ہوگا اور ساتھ ساتھ بچوں کے جذبات کا تزکیہ (دیکھتھارسس) بھی ہو جائے گا۔ غور کیا جائے تو جدید زندگی میں بے شمار ایسے موقعے ملتے ہیں جہاں بچوں کو مل جل کر گانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ محشر صاحب یہ کام سلیقے سے کر سکتے ہیں۔ یہی گیت بچے بڑے ہو کر ایسے موقعوں پر کورس کی صورت میں گائیں گے اور اس طرح یہ قومی گیت بن جائیں گے۔ اس قسم کے گیت ہماری قومی ضرورت ہیں۔ یہی پاکستانی قوم کی شناخت اور ہمارے

قومی مزاج کے ترجمان بنیں گے۔ محشر صاحب کے اس مجموعے میں اس قسم کے گیتوں کی ہلکی سی جھلک مجھے ”ہم بچے جنت والے ہیں“، ”آزادی کا دن“، ”جاگ رہا ہے پاکستان“ میں ملتی تھی ہے۔

حضرت محشر دہلوی کا یہ مجموعہ ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ بچے اسے پڑھیں اور اس سے لطف اندوز ہوں۔ مجھے امید ہے کہ محشر صاحب بچوں کی نظموں کی طرف اب اور توجہ دیں گے اور بچوں کی شاعری کے اس فلاح کو بھی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے پر کر دیں گے۔

(۸ اگست ۱۹۸۴ء)

# بچوں کی نظمیں : شان الحق حقی

شان الحق حقی صاحب کمال کے آدمی ہیں۔ ان کا قلم ہر طرف چلتا ہے۔ وہ ”غزل“ بھی کہتے ہیں اور ”نظم“ بھی اور دونوں اپنے رنگ کی ترجمہ کرتے ہیں تو ترجمے کو ہی ”اصل“ بنادیتے ہیں۔ وہی لہجہ، وہی بھانؤ جو اصل میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا حقی صاحب نے کھٹکڑیاں اور پیدیاں لکھیں اور ایسی لکھیں کہ حضرت امیر خسرو کی یاد تازہ ہوگئی۔ چھوٹے بڑے سب بوجھنے بیٹھ گئے اور گھنٹوں مزے لیتے رہے۔ نثر لکھنے پر آئے تو افسانے بھی لکھے اور خوب صورت مضامین بھی۔ لطف یہ کہ نثر بھی نظم کی طرح چٹخارے دار۔ جو پڑھے زبان و بیان کا مزالے۔ اس بار وہ بچوں کے لیے مزیدار نظموں کا دل فریب تحفے کر کے ہیں۔ ”سہانے ترانے“ میرے سامنے رکھا ہے۔ میں نے ایک ایک نظم پڑھی۔ پڑھ کر دل ہارغ ہارغ ہو گیا۔ کئی نظمیں بچوں کو بلا کر سنائیں۔ سب نے لطف اٹھایا اور بچوں نے بھی مزے لے لے کر سنیں۔ ان میں وہ سب کچھ ہے جو بچے پسند کرتے ہیں۔ مشاہدات بھی ہیں، دل چسپ کہانیاں بھی۔ کہاوتوں کو بھی نظم میں ڈھالا ہے۔ معلومات بھی ہیں، چٹھیں بھی ہیں اور اٹھکھیلیاں بھی۔ ٹوٹو میں میں بھی ہے اور لڑائی جھگڑا بھی، چٹچہ پکار بھی، شور شرابا بھی۔ ہنسی مذاق بھی ہے، دھینگا نشی بھی۔ ان نظموں کو پڑھ کر میلے کا سا سماں بندھ جاتا ہے۔ بہت عرصے بعد بچوں کی ایسی ہی نظمیں پڑھنے کو ملی ہیں۔ آپ بھی پڑھئے۔ لپٹے آئی آؤ کو بھی سٹائیے اور آپا، باجی کو بھی، بہتیا کو اور بھائی جان بھی۔ سب پسند کریں گے۔

قوم کے ادیب بڑھے بوڑھے اور راہبر و راہنما بھی کہتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے

ہیں لیکن جیسے وہ اپنے مستقبل کے بے پرواہ ہو گئے ہیں اسی طرح بچوں کے مستقبل سے بھی۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے لکھنے والے ہیں، سب ایک سے ایک طرسم خاں مگر کیا مجال کہ بچوں کا ذرا بھی خیال ہو۔ نہ ان کے لیے لکھتے ہیں نہ ان کے لیے سوچتے ہیں۔ کہے یہی جانتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ذرا ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ قبلہ! آپ کی بات سراسر آنکھوں پر لیکن آپ نے خود بچوں کے لیے کیا لکھا ہے؟ بچوں کو تو روز ایک کتاب چاہیے۔ اچھی لکھی ہوئی، اچھی چھپی ہوئی، تصویروں اور خاکوں سے جڑی ہوئی۔ جن سے ان کی تربیت ہو، جنہیں پڑھ کر وہ سوچیں، سمجھیں، ان کی معلومات میں اضافہ ہو، ان کا ذہن کھلے اور مستقبل کے لیے وہ تیار ہو جائیں، آپ ان کے لیے کیا کرتے ہیں؟ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہو گا۔ وہ تو بس خالی جمع خرچ کرتے ہیں۔ ہم تو جب چاہیں کہ ہمارے سب لکھنے والے اپنے اور اپنی قوم کے بچوں کے لیے اچھی اچھی کتابیں لکھیں۔ انہی کتابیں کہ لائبریریوں میں بھر جائیں اور بچے ان کو پڑھنے پر متل جائیں، وہ کیسا اچھا زمانہ ہو گا کہ قوم کے سب بچے گاؤں، دیہات کے بچے، قصبوں، شہروں کے بچے سب ان کتابوں کو پڑھ رہے ہوں گے اور واقعی قوم کا مستقبل سنوڑ رہا ہو گا۔ ہمیں امید ہے کہ شان الحق صاحب اس ایک مجموعے پر بس نہیں کریں گے بلکہ بچوں کے لیے نہ صرف ڈھیر ساری نظمیں لکھیں گے بلکہ نثر میں بھی نئی نئی کتابیں لکھیں گے۔ معلومات کی کتابیں، سائنس کی کتابیں، کہانیوں کی کتابیں، ٹہنات کی کتابیں، سفر کی کتابیں، حالات زندگی کی کتابیں، اخلاق و روایت کی کتابیں، غرض کہ ہر طرح کی کتابیں جنہیں پڑھ کر بچے حق صاحب کی لمبی عمر کی دعا مانگیں گے اور اچھے اللہ یاں بچوں کی دعائیں بہت سننے میں آئے۔

## نعت گوئی: احمد سہارنپوری

بچپن تھا اور میں گورنمنٹ ہائی اسکول سہارنپور میں پڑھتا تھا۔ اس زمانے میں شام کو کھیلنا بھی تعلیم کی طرح ضروری تھا۔ کھیل کے میدان میں باقاعدہ حاضری ہوتی تھی۔ جو نہ جاسکتا وہ درخواست دیتا ورنہ غیر حاضر ہونے پر جرمانہ ادا کرتا۔ شام کو گھر سے کھیل کے میدان جاتے کے لیے نکلتا تو محلہ شاہ مدار راستے میں پڑتا۔ محلے میں بائیں طرف ایک مکان تھا جس کے باہر کے دروازے پر وہ پڑا ہوا تھا۔ میرے ہم جماعت نے بتایا کہ یہاں ایک شاعر احمد صاحب رہتے ہیں۔ ایک دن میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ بازار حار ہا تھا کہ راستے میں ایک صاحب ملے۔ درمیانی ساقہ اٹھا ہوا جسم سا نولارنگ گولی گول، بھرا بھرا چہرہ اور اس پر بڑی بڑی مونچھیں۔ خیردانی پہنے ہوئے لیکن اس کے سارے بدن کھلے ہوئے جس میں سے باریک نعل کا کرتا اچھا لنگ رہا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ والد صاحب نے بتایا کہ احمد صاحب بہت اچھے شاعر ہیں اور بہترین نعتیں کہتے ہیں۔ والد صاحب اور احمد صاحب باتیں کرتے رہے اور میں انھیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اچھا! شاعر ایسے ہوتے ہیں۔ ادب کا چسکا مجھے بچپن سے تھا۔ اس زمانے میں بھی میں انچوں کے رسالے ”پھول کو“ ”خنیچہ“ کا خریدار تھا اور پیسہ لائبریری لاہور کی کتاب خانہ کی کتابوں سے منگواتا اور پڑھتا تھا۔ نئی کتاب مل جاتی تو گویا جنت کی گنجی ہاتھ آجاتی۔ پھر یہ ہوا کہ جب بھی حضرت احمد سہارنپوری کہتے جاتے راستے میں مل جاتے تو میں انھیں ادب سے سلام کرتا اور وہ بڑی محبت سے جواب دیتے۔

میں بلی انے کا طالب علم تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ حضرت احمد کا مجموعہ کلام

”ہلالہ شہید کے ہم سے شائع ہوا اور میں نے اسی زمانے میں پڑھا۔ آسان زبان لیکن اخلاص، محنت کی ایسی گری کہ شعر دل کو پکڑ لیتے تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گہری عقیدت مسلمان مگراؤں کی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ محفل میلاد کا عام رواج تھا اور سہارنپور میں حضرت احمد سہارنپوری کا کلام نعت خزان نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ ان کا ”سلام“ توانا مقبول تھا کہ ہر گھر میں میلاد کے موقع پر پڑھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو کا رواج بھی عام ہو گیا تھا۔ ایک دن ریڈیو سن رہا تھا کہ اعلان ہوا ”اب حضرت احمد سہارنپوری اپنا کلام پیش کریں گے“ میں ہمتی گوش ہو گیا۔ انھوں نے بڑے اچھے انداز میں اپنی غزل سنائی۔ ریڈیو سے ان کے شعر سن کر میں ان کا اور قائل ہو گیا۔ کچھ دن بعد ملے تو میں نے غزل کی تعریف کی۔ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے ”کیا آپ بھی کچھ کہتے ہیں؟“ بڑوں کے سامنے یہ کہنا کہ ”جی ہاں میں بھی کہتا ہوں“ اس زمانے میں بڑی بات بھی جاتی تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ نفرت تو کہتے تھے کہ آپ بھی شاعری سے شوق رکھتے ہیں۔ میں خاموش رہا۔

احمد صاحب غریب سہارنپوری کے شاگرد تھے اور نصرت قریشی، احمد صاحب کے شاگرد تھے، جو میرے عزیز دوست اشتیاق احمد قریشی کے قریبی عزیز تھے۔ چند سال ہوئے نصرت قریشی لاہور میں اللہ کو ہیارے ہو گئے۔ فن پر ابھی نظر تھی۔ آستانِ ادب شعر کہتے تھے۔ ۱۹۳۷ء تک حضرت احمد سہارنپوری کے گاہ گاہ ملاقات ہوتی رہی۔ پھر میں پاکستان آ گیا اور چند سال بعد معلوم ہوا کہ احمد صاحب وفات پا گئے ہیں۔ اتفاق کی بات دیکھیے کہ ۲۵-۲۶ سال بعد جناب ضبط سہارنپوری نے ایک مجموعہ کلام لاکر دیا اور مجھ سے کہا کہ اذرا و کرم اس پر مقدمہ لکھ دیجیے۔ یہ حضرت احمد سہارنپوری کا کلام ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس نعتیہ کلام کو یہاں سے بھی شائع کیا جائے۔ کلام دیکھا تو ماضی کے دریچے کھل گئے اور خوشبو بھری تازہ ہوا کے جھبوٹوں سے دل و جان حطر ہو گئے۔ پہنے بچپن کے مقبول و مشہور شاعر کا کلام اتنے عرصے بعد پڑھا تو معلوم ہوا کہ اچھا شعر ہمیشہ اچھا ہوتا ہے اور وقت کی گرد اس پر نہیں مٹی۔ وہی تازگی، وہی اخلاص کی جھلک، وہی محنت کی گری اور عقیدت کا جوش اس میں محسوس ہوا۔ احمد سہارنپوری کا کلام عام ریدزمرہ کی زبان میں لکھا گیا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ اس میں

اخلاص کی وہ گرمی ہے کہ یہ عوام و خواص دونوں کے دلوں میں گھر کر نیتا ہے۔ اس میں ایسا سونہ ہے جو دل عاشق میں ہوتا ہے اور اس سونہ میں وہ الہیاد کیفیت ہے جو سرشاری عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کی محبت کے گیت جس نے گائے، عقیدت کے پھول جس شاعر نے چڑھائے اس کا کلام ہمیشہ کے لیے تازہ ہو گیا۔ حضرت احمد سہارنپوری اردو کے ان نعت گو شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے عشق رسولؐ سے سرشار ہو کر ایسا نغمہ بھیل دیا جس کی لے آج بھی سرشار کیے جاتی ہے۔ ان کا کلام ہم آج بھی محفل میلاد میں سُنتے ہیں اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ حضرت احمد سہارنپوری کا کلام ہے۔ وہ احمد سہارنپوری کا جو عاشق رسولؐ تھے، جو کوئے محوئے راہرو تھے، جو ساقیِ یثرب کے مے خوار تھے، جو کالی کالی والے کی محبت میں سرشار تھے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں وہ آخر آج بھی محسوس ہوتا ہے جو عشق کی آگ سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ”ہلالِ یثرب کی اشاعت“ سے حضرت احمد سہارنپوری کا نعتیہ کلام نئی نسلوں تک پہنچے گا اور یہ کلام پاکستان میں لکھے جانے والے نعتیہ کلام کی روایت کا ”پیش رو“ کہلائے گا۔“

(سمراگت ۱۹۸۳ء)



## قومی شاعری : منظرِ ایوبی

منظرِ ایوبی ہمارے معروف شاعر ہیں۔ ”تکلم“ کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۱ء میں اوڈیشا شاعری کے نام سے دوسرا مجموعہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکا ہے اور اب قومی شاعری پر مشتمل تیسرا مجموعہ کلام ”چڑھتا چاند“ ابھرتا سورج کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ منظرِ ایوبی، بہنہ گو اور کشاف شاعر ہیں۔ انھیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ حد درجہ حساس ہیں اور دل دردمند بھی رکھتے ہیں۔ پاکستان ان کے لیے عشق بھی ہے اور حسرت بھی اور اسی وجہ سے ان کی شاعری میں شیرینی بھی ہے اور تلخی بھی۔ تلخی اس لیے کہ پاکستان ان کے خوابوں کی سرزمین ہے اور وہ اسے وہ بنا رہا ہے جس کا خواب ان کی نسل نے دیکھا تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں عدل و انصاف بھی ہو اور معاشی و معاشرتی مساوات بھی۔ یہی وہ سماجی شعور ہے جو منظرِ ایوبی کی شاعری میں اثر و تاثیر پیدا کرتا ہے۔ پاکستان کو اپنے خوابوں کی حقیقی سرزمین بنانے کا یہی جذبہ ہمیں ”چڑھتا چاند“ ابھرتا سورج کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس شاعری میں حب الوطنی کی سرشاری قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ان کے خواب شاعری کے روپ میں داخل گئے ہیں۔

منظرِ ایوبی نے اپنے اس مجموعہ کلام کو ملی نغمے، رزمیہ نغمے، محنت کشوں کے گیت اور قومی نظمیں وغیرہ کے ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ ان عنوانات سے آپ اس مجموعے کے تنوع کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں نغمے اور گیت کو ریس میں جھکے جانے کے لیے لکھے گئے ہیں تاکہ شاعری کے ذریعے قومی آرزوئیں، آرزوئیں، خوابوں اور حسیہ وطن کو قوم کی گردنِ خون میں شامل کیا جاسکے۔ قومی شاعری ہمارے متعدد شاعروں نے کی ہے۔

اس شاعری نے دلوں کو گر مایا بھی ہے اور نئے نئے خوابوں کو اجاگر بھی کیا ہے لیکن اس شاعری کا بہت کم حصہ ایسا ہے جس میں شاعرانہ جوہر بھی ہو اور معنویت بھی۔ سماجی شعور بھی ہو اور خوابوں کا نظارہ بھی۔ منظر الہی کی شاعری میں یہ سب خصوصیات بیک وقت موجود ہیں۔

منظر الہی اپنی آر کے شاعر نہیں ہیں۔ جن شاعروں کی پی آر مضبوط اور تعلقات عامہ استوار تھے انھوں نے ریڈیو، ٹیلی وژن کی مدد سے اپنے نظموں اور گیتوں کی دُھنیں بڑائیں اور انھیں مقبول عام بنانے کے لیے اس طرح کام کیا جس طرح صنعت کار اپنی اشیاء کی فروخت کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد صاحبانِ نظر ان نظموں، نظموں اور گیتوں کی طرف بھی توجہ دیں گے تاکہ شاعری کے ذریعے قومی خوابوں کی فصل بونے کا کام سہل ہو سکے۔ زندہ قومیں اپنے قابلِ ذکر شاعروں کو سپنا پتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ منظر الہی صاحب ہمارے ایسے شاعرِ فرد ہیں جن کو سپنا پنا ہمارا تہذیبی فرض ہے۔ مجھے امید ہے کہ منظر الہی صاحب قومی شاعری کے اس عمل کو جاری رکھیں گے اور مختلف سماجی و اجتماعی مواقع و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسے نئے اور گیت بھی لکھیں گے جنہیں مختلف اجتماعات، جلسوں، جلوسوں، اکھیلوں، مقابلوں، سفر، پاک، تک اور جشن وغیرہ کے موقع پر کورس کی شکل میں چھایا جاسکے تاکہ نئی نسل میں اتحاد و فکر اور یک جہتی کا عمل تیز ہو سکے اور یہ کورس گیت نظمیں ایسے مواقع پر ہمارے جذبات کی ترجمانی کر کے ہمارا تزکیہ (کیتھارسیس) کر سکیں۔ اس قسم کے گیتوں اور نظموں کی میں منظر الہی میں غیر معمولی صلاحیتیں پاتا ہوں یہ

(۶۱۵۸۵)

# اردو گیت : ڈاکٹر بسم اللہ نیاز

زمانے کو کس نے روکا ہے۔ ایسے گزرجاتا ہے جیسے آیا ہی نہیں تھا۔ نصرت کی آنکھ سے دیکھے توکل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ میں ایک طالب علم تھا اور دنیا نے اوپر میں کچھ کر گزرنے کے دلولے سے ہر دم سرشار رہتا تھا۔ سوتے جاگتے بس یہی دین تھی کہ مجھے ادیب بننا ہے۔ یہی منزل تھی اور یہی مقصود حیات۔ دن رات کتابیں پڑھنے یا علم و ادب کی باتیں کرنے میں گزر جاتے۔ ہر مہینے ادبی رسالوں کا اسی طرح انتظار ہوتا جیسے دیدار محبوب کا۔ رسالوں میں ماہنامہ ”نگار“ بھی آتا تھا۔ ”نگار“ میں بھیجی ہوئی ہر تحریر صحیفہ آسمانی معلوم ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اردو گیتوں پر ایک مضمون ”نگار“ لکھوں میں چھپا۔ لکھنے والی کا نام بسم اللہ نیگم تھا۔ نام میں نے اس سے پہلے کسی نہیں سنا تھا۔ مضمون پڑھا تو اچھا لگا اور اس میں لکھی ہوئی باتیں ایسی دل میں اتریں کہ وہ آج بھی میرے شعور کے دھندلوں میں جگنو کی طرح چمک رہی ہیں۔ محترمہ بسم اللہ نیگم صاحبہ سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ترقی پسند تحریک اردو ادب پر چھائی ہوئی تھی۔ دامن جونہدی، مظہر آبادی، آرزو بھٹو، حفیظ جالندھری اور میراجی کے گیت بہت مقبول تھے اور یہ قدیم صنفِ ادب نئے شعور و احساس کے ساتھ نئے شعرا میں مقبول تھی۔ قدیم صنفِ سخن نے جب عہدِ حاضر کی روح کو لفظوں میں عیسا تو یہ نئے گیت گردشِ خون میں شامل ہو کر معاشرے کے دل کی دھڑکن بن گئے۔ یہ دور اردو گیتوں کی مقبولیت کا ایک نیا دور تھا۔ اسی زمانے میں محترمہ بسم اللہ نیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ دھان پانسی، ساڈلی سلونی سی، انتہائی شائستہ خانوں۔ نرم لہجہ، دھیمی آواز لیکن ایسی صاف کہ کانوں میں رس گھول دے۔ باتیں کریں تو پھول بھریا

اور احترام کرنے کو جی چاہے طالیات کی محبوب استاد۔ میری بہنیں بھی ان کی شاگرد تھیں۔ کوئی ان کی شفقت کا ذکر کرتا۔ کوئی ان کی قابلیت کے گن گاتا۔ کوئی کہتا اللہ ایسا اچھا پرہیزگار ہے کہ علم و ادب کا دریا شاگردوں کے ذہن کے کوزے میں سما جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ برسوں سے گیتوں پر کام کر رہی ہیں اور دن رات اسی میں لگی رہتی ہیں۔ عمر عزیزہ کا بڑا حصہ بسم اللہ نیا صاحبہ نے اسی مقالے کی تیاری اور تصنیف پر لگا دیا۔ کراچی یونیورسٹی سے انھیں اس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی ملی اور اب برسوں بعد ان کا یہ کام کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گن کے ساتھ اتنی محنت کم لوگوں نے اپنی تصنیف پر کی ہوگی اور اسی وجہ سے یہ ایک ایسی تصنیف ہے کہ اس موضوع پر آئندہ جو بھی کام کرے گا پروفیسر ڈاکٹر بسم اللہ کی کتاب کو نظر انداز کر لے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ یہ کتاب گیت کے موضوع پر اردو ادب میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔

اس تصنیف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پروفیسر بسم اللہ صاحبہ نے اپنے موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔ ایک طرف انھوں نے گیتوں کو بر عظیم کی تہذیب و معاشرت سے ملا دیا ہے اور دوسری طرف ان کی ادبی تخلیقی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ اپنے موضوع کی تلاش میں انھوں نے سارے قدیم و جدید ادب کو کھنگالا ہے اور فذہ ذرہ جمع کر کے سلیقے سے اس مواد کو ایک خوب صورت مجملے کی صورت میں گوندھ دیا ہے۔ فاضل مصنف نے پورے مقالے کو جس طور پر مرتب کیا ہے اور جس طرح ابواب بندی کی ہے اس سے پوری کتاب منطقی ترتیب کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں سے کلام کرنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر بسم اللہ نے جہاں دھماکت و سیلانیت کا تجربہ کیا ہے وہاں گیت نگاروں کے گیتوں کا تنقیدی مطالعہ بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور ذہنی دیانت داری کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ میرا جی کی کوشش کو سنی ناکام سمجھتی ہیں۔ آپ ان کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اسے بے وزن نہیں کہہ سکتے۔

اس تصنیف کا اسلوب بھی سادہ اور دل نشین ہے۔ ڈاکٹر بسم اللہ نے علمی بحث کو عام بول چال کی معیاری زبان میں اختصار کے ساتھ اس طرح سمیٹا ہے کہ پڑھنے

والا پوری کتاب کو دلی چسپی کے ساتھ چڑھ سکتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف پر میں پروفیسر  
 ٹراکٹر بسماً اللہ نیاز صاحبہ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں اور ساتھ ساتھ ایک فرمائش بھی کرتا  
 ہوں کہ ایک اور جلد میں وہ ان تمام گیتوں کو بھی یکجا و مرتب کر دیں جو دوران تحقیق انھوں  
 نے جمع کیے ہیں۔ یہ ایک بڑی خدمت ہوگی ورنہ یہ قیمتی سرمایہ ضائع ہو جائے گا اور کوئی  
 دوسرا اس نکلن کے ساتھ انھیں پھر جمع نہیں کر سکے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تصنیف دنیا کے  
 ادب میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جائے گی اور صاحبانِ علم پروفیسر بسماً اللہ کو ان کے  
 اس کلام سے پر خراجِ نیاز پیش کریں گے۔

(۱۹۸۵ء)

## جدید مرثیہ : ڈاکٹر یاور عباس

مسفر لباً اور منزل دور ہو تو پہچنے مگر نہ دیکھنے کی فرصت کہاں اور کسے ہوتی ہے ! لیکن ایک دن، جب ڈاکٹر دلاور عباس اپنے بھتیجے ڈاکٹر رضا عباس کے ساتھ آئے تو میں نے محسوس کیا کہ عمر رفتہ آغاز دے رہی ہے۔ پہچنے مگر نہ دیکھا تو یادوں کے بے شمار چراغ تاحہ نظر ٹٹھا رہے تھے۔ ان چراغوں کی روشنی میں بعض چہرے صاف نظر آ رہے تھے اور بعض اتنے دھندلا گئے تھے کہ پہچانا بھی مشکل تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یادوں کے ہوسیدہ مکان کی دہلیز پر یہودی مالک مکان آلتی پالتی مادے بیٹھا ہے اور مکان کے اندر اور مکان کے باہر دور دور تک چراغ ہی چراغ ٹٹھا رہے ہیں اور میں تپتے ہوئے صحرا میں بارش کا منتظر ہوں۔

ریٹھ یو پاکستان کراچی کے سلسلے ”سجد منزل“ میں ڈاکٹر ناصر عباس مرحوم اپنے سرخ و سفید رنگ اور سفید بالوں کے ساتھ مریضوں کے ہجوم میں ”میز پر ٹھکے ہوئے“ کھڑے ہیں۔ ایک میز پر ان کے بیٹے ڈاکٹر یاور عباس بیٹھے ہیں اور مریضوں کو دیکھ رہے ہیں اور ایک کمرے میں ڈاکٹر دلاور عباس ناک پر رکھی ہوئی چوٹی سی میٹک کے بالائی حصے سے شمس زمیری کو دیکھ کر کوئی فقرہ جست کر کے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ عباس بولی طینتک میں گہما گہما ہے۔ آنے جانے والوں کا اتنا تاج بندھا ہے۔ مریض اور بیماریاں ہیں۔ دوست احباب بھی ہیں اور شاعر و ادیب بھی۔ دوپہر ہو، گرمی یا سردی ہو۔ چائے سے خاص خاص احباب کی تواضع ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر یاور عباس کے پاس مریضوں کا جھگٹا ہے۔ جب فرصت ہوتی ہے تو وہ اٹھ کر میز سے پاس آتے ہیں۔ خشک چہرے اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں اور محبت کی سناس سے کانٹوں میں رس گھول دیتے ہیں۔ کونا ساق، بھرا بھر جسم سیاہ رنگے ہوئے بال

بالوں میں تیل اور احتیاط سے بھی ہوتی مانگ، کھلتا ہوا گندی رنگ۔ چوڑا سینہ اور سینے میں انسانی محبت کے معمور و حرکتنا ہوا دل و شریف النفس اور نکسر المزاج، باتیں ایسی کردل گئے، اہجہ ایسا کہ اپنا نیت کی دشمنی سارے وجود میں پھیل جائے۔ بات بات میں شعر و شاعری بہت اچھے طبیب بہت اچھے غزل گو اور بہت اچھے مرثیہ نویس رہیں شاہد احمد دہلوی شمس زہری، کرار قوری، ارم نکھنوی، سلیم احمد، ڈاکٹر صفدر حسین، جوش ملیح آبادی، استاد قمر جلالوی، امید فاضلی، سید آل رضا، ذوالفقار کھاندی اور شہر کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے ملاقاتیں ہوئیں۔ جیسے آزادی سے پہلے کتب خانہ علم و ادب دلی میں ادیبوں کا مرکز تھا، اسی طرح "عتباس پبلیکیشنز" کراچی شہر میں ایک ایسا مرکز بن گیا تھا جہاں ذرا دیر بیٹھنے کو کوئی نہ کوئی شاعر یا ادیب وہاں فرود مل جاتا۔ ڈاکٹر یاور عباس شہر میں ہونے والے خاص خاص مشاعروں میں عام طور پر شرکت کرتے۔ غزل پڑھتے اور خوب دام پاتے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر یاور عباس نے ایام محرم میں اپنے گھر پر مجالسِ مرثیاتی کا اہتمام کیا اور کم و بیش ہر قابل ذکر شاعر نے ان مجالس کے لیے ہر سال نیا مرثیہ لکھا۔ ان مشاعروں میں جوش ملیح آبادی اور آل رضا بھی شامل تھے اور نسیم امروہوی اور امید فاضلی بھی۔ اور خود ڈاکٹر یاور عباس بھی مجھے یاد ہے کہ وہ ہر سال کم از کم ایک نیا مرثیہ ضرور لکھتے اور اہل علم و ادب کے سدا روشن چراغوں کی اسی محفل میں سناتے۔ محفل میں نکل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ یہ محفلیں یادگار محفلیں تھیں۔ اگر ان محفلیں کی داستان لکھی جائے تو شہر کراچی کی علم پروری روشن ہو جائے اور لوگوں کو پتا چلے کہ ڈاکٹر یاور عباس نے کس طور پر برسوں اس شہر میں شعر و ادب کا نور پھیلا دیا ہے۔

اب نہ ڈاکٹر یاور عباس ہیں اور نہ جوش ملیح آبادی، سید آل رضا اور ذوالفقار کھاندی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ استاد قمر جلالوی اور ارم نکھنوی بھی اس جہان سے گزر گئے، لیکن اس دور کی یاد اور ان محفلیں کی زندگی اب بھی میرے وجود کو تازہ دم کیے ہوئے ہے۔ جب تک ڈاکٹر یاور عباس زندہ تھے یہ محفلیں ہر سال سبقت تھیں اور اب میخانہ حیات ویران ہو گیا ہے لیکن یاور عباس مرحوم کا کلام اب بھی تازہ اور زندہ ہے جو ان کے لائق بیٹے ڈاکٹر رضا عباس کے ہاتھوں

شائع ہو کر سامنے نہ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ ہر سال ان کی برسی کے موقع پر ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ ضرور شائع کریں گے اور پھر ان کی غزلیات کا مجموعہ بھی اسی طرح سے شائع کریں گے۔ ایک سعادتمند بیٹا اپنے باپ کے نام کو روشن و زندہ رکھنے کے لیے یہی کر سکتا ہے اور یہی انھیں کرنا چاہیے۔ اس طرح صاحبانِ علم کو معلوم ہو سکے گا کہ ڈاکٹر یادر عباس غزل گو کی حیثیت سے کتنے بلند پایہ شاعر تھے اور جدید مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ان کا کتنا اہم و بلند مقام ہے؟

ڈاکٹر یادر عباس کے مرثیوں میں موضوع سخن تو یقیناً واقعات کر بلا ہیں لیکن انھوں نے ان واقعات کو دورِ حاضر کی روح سے اس طور پر پیوست کر دیا ہے کہ ان کے مرثیوں میں ہماری روح کی آواز و باطن کا کرب شامل ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرثیے ہیں متاثر کرتے ہیں اور ہماری رُوح میں اتر جاتے ہیں۔ ان مرثیوں کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یادر عباس مرحوم کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی اور یہ قدرت بیان ہمارے دور میں کتنے شاعروں کو حاصل ہے؟ ڈاکٹر یادر عباس کے مرثیوں کی زبان کو اثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی ہے۔ افکاروں کی ترتیب میں ایسا سلیقہ موجود ہے جو زبان پر قدرت اور مسلسل مشقِ دریا من کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اسی سلیقے سے وہ لہجہ پیدا ہوا ہے جس میں مٹھاس بھی ہے اور اثر افزائی بھی؟ دل گدازی بھی ہے اور جادو بیانی بھی۔ یہ مرثیے ان کی روح کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اور ٹھنڈے اور چڑھنے والوں کی روح میں اتر جاتے ہیں۔ ان مرثیوں کی اشاعت تاریخی مرثیہ میں یقیناً ایک اضافہ ہے اور میرا خیال ہے کہ صاحبانِ علم و ادب ان مرثیوں کو پسند کریں گے اور مرحوم کی شاعرانہ صلاحیتوں کی دل کھول کر داد دیں گے۔ خدا مرحوم کی اکثر یادِ عباس کی مغفرت فرمائے اور فردوسِ بریں میں درجِ است بلند عطا فرمائے۔ آمین۔

(۶۷ مئی ۱۹۸۱ء)



# سلیم احمد کے بارے میں

یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کی شام کو جب سلیم احمد کے جسم خاکی کو زیر زمین آرام کرنے کے لیے قبر میں اتارا جا رہا تھا تو مغامیس نے محسوس کیا کہ ماضی کے دیسچے کھل گئے ہیں اور گزیرے دنوں کے منظر ایک ایک کر کے تیزی کے ساتھ نظروں کے سامنے آ رہے ہیں۔

میں نے اور سلیم احمد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز میرٹھ نامی بستی میں کم و بیش ایک ساتھ کیا تھا۔ میرٹھ جس کی طویل تاریخ ماضی کے دھند لکوں میں گم ہے۔ وہ میرٹھ جہاں راون کی سسرال تھی۔ وہ میرٹھ جسے اندر پرستہ کی تعمیر کے محلے میں پانڈوں کے سب سے بڑے بھائی پدھترنے ماہی نامی سمندر کو، جاگیر کے طور پر دیا تھا اور جہاں اس نے اپنا عمل تعمیر کیا تھا۔ اس محل کے آثار آج تک اندر کوٹ نامی محلے میں پائے جاتے ہیں۔ جاتوں کی روایت کے مطابق یہاں جہاں اٹھ گوت آباد تھی اور یہی جہاں اٹھ بگڑ کر میرٹھ ہو گیا۔

آج بھی اس پورے علاقے میں جہٹ کثرت سے آباد ہیں۔ یہ وہی میرٹھ ہے جو اس زمانے میں غزنویوں کی سلطنت میں شامل تھا جب لاہور ان کا دار الحکومت تھا۔ فتح دہلی کے بعد قطب الدین ایبک نے غیاث الدین بلبن کو میرٹھ کا حاکم مقرر کیا تھا جس کی ایک مسجد کے آثار گڑھ مکیشیش میں آج بھی موجود ہیں۔ اسی میرٹھ میں میری اور سلیم احمد کی ملاقات ہوئی ہم دونوں ایف۔ اے کے طالب علم تھے اور ادب کی دنیا میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ دن رات یہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہی موضوع سخن تھا اور یہی مقصد زندگی تھا۔ ہم دونوں نئی کتابیں پڑھتے، تبادلہ خیال کرتے اور گفتگوں انھیں مسائل میں گم رہتے۔ سلیم احمد اس وقت میرٹھ کے نوجوان شعراء میں سب سے ممتاز تھے۔ ہنر

تخلص کرتے تھے اور اقبال کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ”دائرۂ ادبیہ“ کے ایک جلسے میں، جو ہر صفت فیض امام کالج میں ہوا تھا، سلیم احمد نے ایک نظم سنائی تھی جس کا ٹیپ کا مصرع ”انقلاب، الے انقلاب، الے انقلاب“ تھا۔ یہ نظم اتنی پسند کی گئی تھی کہ ساری محفل ٹیپٹم واہ واہ سبحان اللہ بن کر رہ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ دائرۂ ادبیہ کے ایک اور جلسے میں سلیم احمد نے جب ایک غزل سنائی تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور اس شعر پر تو وہ بے ساختہ داد ملی کہ کچھ بھی وہ آواز میں میرے وجود کا حصہ ہیں :-

زمین والوں کی مشکلوں کو سمجھ سکیں گے نہ عرش والے  
کہ آسمان سے زمیں کے اوپر نگہ پڑتی ہے طائرانہ

اس زمانے میں سلیم احمد اور میں بے قرار روحوں کی طرح، سارے میرٹھ شہر کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ میرٹھ کالج کے ہوسٹل سے بھتیجا وحید الدین کی لال کوٹلی تک، وہاں سے بیگم پل، خیرنگر، کنبوہ دروازہ، رشید چائے والے کی دوکان، کہیں کوٹلی جنت نشان کی طرف، کہیں ذاب اسماعیل خان کی کوٹلی کی طرف، کہیں رزمی صدیقی کے ہاں پیدا فیاض علی جہاں بلی بھنوں والے ماسٹر روپی سے ملاقات ہوتی اور کہیں بھینسا لی گراؤنڈ اور نادر علی بلدیہ تک، جہاں حکیم فرخ آبادی کا مطلب تھا اور جہاں سلیم احمد کا گھر بھی تھا۔ کہیں سی پٹ بازار یا ویلی بازار سے ہوتے، گزری سے گزرتے قادی محمد یونس کے گھر۔ اس تمام عرصے میں کسی نہ کسی ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی اور یوں معلوم ہوتا کہ ہم جلد ہی کائنات کے راز پائے سر بستہ دریافت کر لیں گے۔ اسی اثنا میں کام کے منصوبے بنتے۔ نئی تحریروں پر بہت ہوتی۔

گرمیوں کے موسم میں ہم جہاں سے گزرتے وہیں جیلی، موتیا اور پیلے کی خوشبوؤں سے گلی کو چھچکے ہوتے۔ چاندنی راتوں میں رات کی رانی کی جھبک قدم قدم پر تازہ دم کرتی۔ یہ خوشبوئیں آج بھی مشام جان کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ ادب اور شعر و شاعری اس شہر کی روح ہیں اسی طرح شامل تھے جس طرح زبردستی آج ہماری روح میں شامل ہے۔

اسی ادب پرور ماحول اور اسی تخلیقی فضا کا اثر تھا کہ فرزندِ ان میرٹھ نے اردو ادب میں وہ کارنامے نمایاں انجام دیے کہ آج ان کے ہم تدریج ادب کا حصہ ہیں۔ اسماعیل میرٹھی، اکبر وارثی، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ظلیق احمد نظامی، پروفیسر کرار حسین، انتظار حسین، سلیم احمد، فہیمہ احمد، عالم تاب تشنہ، احمد سہدانی، امید قاضی، قیصر زیدی، ڈاکٹر صفدر حسین، حفیظ میرٹھی، منتخب جارجی، یوم میرٹھی، حامد اللہ افسر، سائر نظامی، ندرت میرٹھی، وہ چند نام ہیں جن کے کاموں سے ہم سب واقف ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ اپنی زندگی کے اسی زمانے میں سلیم احمد اور میں روز ایک افسانہ لکھتے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی عصمت چغتائی، منشو کے رنگ میں اور کبھی ناصر علی دہلوی کے رنگ میں ادب لطیف تخلیق کرتے۔ روزانہ شام کو بے مقصد سڑکوں پر گھومتے ہوتے سی پٹر کے میچے یا کپنی باغ کے سرسبز و شاداب لان پر بیٹھ کر اپنے اپنے افسانے پڑھتے، ان پر تبادلہ خیال کرتے اور اگلے افسانے کی تیاری میں لگ جاتے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہم نے سینکڑوں افسانے لکھے اور بے شمار کہیں پڑھیں۔ اس کاوش سے لکھنے کی مشق ہو گئی اور ادب کا ذوق سنور گیا۔

سلیم احمد کی وفات نے ماضی کے نہاں خانے میں جو در کچھ کھولا ہے اس سے یادوں کی برسات اُتر آئی ہے۔ بہت سے دھواں دھواں چہرے صاف نظر آ رہے ہیں۔ گرم شدہ واقعات کے سرے دوبارہ ہاتھ میں لگے ہیں۔ اسی زمانے میں تحریک پاکستان نے زور پکڑا۔ سلیم احمد نے خاکساروں کا ہیلو سنبھال لیا اور میں لیاقت علی خان کے ایکشن میں مصروف ہو کر قرب و جزائر کے گاؤں دیہات کے دوروں پر نکل گیا۔ اس دور میں تصدیق پاکستان نے ادب کی جگہ لی تھی۔ میں نے ایک ہفت لکھا جس میں دو قومی نظریے کی وضاحت کے ساتھ پاکستان کی معاشی خوش حالی کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا اور ہم میرٹھ سے پچھڑ کر جب دوبارہ ملے تو کراچی میں تھے۔ وہ کراچی جو پاکستان کی شہرِ رنگ ہے۔ جہاں ہم نے اپنی تعلیم پوری کی اور زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا اور وہ بنے جو آج ہم نظر کرتے ہیں۔

سلیم احمد اب ہم میں نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنا سفر صبح سب سے پہلے طے کر لیا۔ میرٹھ میں بھی وہ مقبول اور ہر دل عزیز بن گئے اور کراچی میں بھی وہ سارے شہر کے محبوب تھے۔ زندگی ہی میں برادر مظهر پر سب صاحب نے کہا تھا کہ وہ ان کا مجموعہ کلام شائع کریں گے لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ کام جس کا آغاز مظهر پر سب صاحب نے سلیم احمد کی زندگی میں کیا تھا، ان کی وفات کے بعد پورا ہو گا۔ اکافی، تنظیم احباب میرٹھ کی طرف سے شائع کی جا رہی ہے لیکن داسے درمے قدمے اس کی اشاعت کا سہرا مظهر پر سب صاحب کے سر ہے۔ تنظیم احباب میرٹھ دراصل میرٹھ کالج اور فیض عام کالج کے ان سابق طلبہ کی ویسی ہی ایک انجمن ہے جیسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ڈیڑھ انچ ایسوسی ایشن ہے۔ یہ ایک ثقافتی انجمن ہے جو علم ادب اور تعلیم و تہذیب کی اس شمع کو روشن رکھنا چاہتی ہے جو ہمیشہ سے فرزند ان میرٹھ کا طرہ امتیاز رہا ہے تاکہ یہ روشنی اسی طرح پاکستان کے در و بام کو بھی موثر کرتی رہے جس طرح کبھی میرٹھ کے در و بام کو روشن کرتی تھی۔

سلیم احمد کا تخلیقی سفر جو میرٹھ میں شروع ہوا تھا کراچی میں اس وقت انجام کو پہنچا جب ان کی تخلیقی قوت اپنے شباب پر تھی۔ سلیم احمد نے شاعری میں، ڈرامے میں، فکر و تنقید میں، صحافت میں وہ کارنامے انجام دیے جن کا اثر عہد حاضر پر گہرا پڑا ہے اور جن کا رشتہ کئے والے زمانے سے بھی گہرا ہے۔ اکافی، سلیم احمد کی شاعری کا ایک اہم مجموعہ ہے جس میں ان کی غزل کا منفرد دلچسپ اور آہنگ و اسلوب متعین ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لہجہ ہے جس نے غزل کی روایت میں اضافہ کیا ہے اور جو تاریخ غزل میں سلیم احمد کی پہچان ہے۔

(۱۹۸۵ء)

# صبا اکبر آبادی کی غزل

صبا صاحب اردو کے ان چند اہم شاعروں میں سے ایک ہیں جنہیں دنیائے ادب میں وہ مقام اب تک نہیں مل سکا جس کے وہ 'اپنی قادر الکلامی اور مشاعرانہ جوہر کے باعث بہرہ و جزہ مستحق ہیں۔ طرغوزین کے اس حصے میں، جب عام طور پر تخلیقی سوتے خشک ہونے لگتے ہیں اور شاعری و رزق بن کر رہ جاتی ہے، صبا صاحب کا دہرائے ذہنیت اسی تخلیقی توانائی کے ساتھ کتب بھی بھرا کر رہا ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ گذشتہ ۲۵ سال سے اپنے بہترین تخلیقی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان کے پاس کہنے کے لیے بھی ہے اور کہنے کا سلیقہ و مشور بھی ہے۔ وہ اس عظیم روایت زبان اور اس مخصوص نثری لہجے کے وارث ہیں جس نے تیسرا حالِ حقان اور غالب جیسے شاعروں کی صورت گیری کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لہجے میں زور، ان کے اظہار میں توانائی اور بیان میں وہ تنومندی ہے کہ ان کی شاعری ہمارے باطن کے نہیں غاؤں میں اتر جاتی ہے۔ میں اس بات کو آج پھر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر صبا صاحب اکبر آبادی نہ ہوتے تو ایسی شاعری ہرگز نہیں کر سکتے تھے جیسی انھوں نے کی ہے۔ اور اس بات کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اکبر آبادی جو تاج محل کا مسکن ہے اور جسے عرف عام میں 'اگرہ کہتے ہیں، عظیم کی دو قدیم زباؤں کے دریائے اثر کے سنگم پر واقع ہے۔ وہ دریا جو دہلی میں بہتا ہے وہی دریا اگر کے میں بھی بہتا ہے۔ اس کے راستے میں ایک مقام پر سنگ سرخ کا بنا ہوا دہلی کا قلعہ معلیٰ ایستادہ ہے اور تقریباً دو سو میل کی مسافت کے بعد ایک اور مقام پر سنگ مرمر کا تاج محل سینہ کائنات بن کر اہل نظر کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ اکبر آباد کا سراج سنگ مرمر اور سنگ سفید کے امتزاج سے

ہنا ہے۔ یہ علاقہ ایک طرف گروہوں والے کرشن کشیا کی موسیقانہ لے کا وارث ہے اور دوسری طرف برج بھاشا کی شیرینی کا بھی حاصل ہے۔ ساتھ ساتھ کھڑی ہلی کی ترقی یافتہ صورت یعنی اردو زبان کا ایک اہم مرکز بھی ہے اور اسی لیے اس کی تہذیبی ولسانی اہمیت ہمیشہ باقی رہی ہے اور اسی لیے اہل اکبر آباد ہمیشہ احساسِ اتحاد سے سرشار رہے ہیں۔ دو زبانوں کا تہذیبی سنگم ہونے کی وجہ سے اہل اکبر آباد کی زبان بھی دوسرے علاقوں کی زبان سے زیادہ دلکش اور موثر رہی ہے۔ اگر محمد تقی میر اکبر آبادی نہ ہوتے تو وہ ایک طرف اپنی شاعری کی زبان کو وہ مزاج نہیں دے سکتے تھے جو انھوں نے دیباچہ دوسری طرف وہ لہجہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا جو تیسرے کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی زبان کے لہجے میں برج بھاشا اور اودھی کا وہ لہجہ اور وہ موسیقیت اور وہ تاثیر اسی طرح از خود ملی ہوئی ہے جس طرح پانی میں آکسیجن موجود ہوتی ہے۔ یہی اثر آپ غالب کی شاعری کے آہنگ میں محسوس کر سکتے ہیں اور یہی اثر نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے لہجے اور آہنگ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی اثر مجھے صبا اکبر آبادی کے ہاں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی شاعری کا آہنگ و لہجہ اردو شاعری کی عظیم روایت کا حصہ ہے۔ ان لسانی و تہذیبی اثرات کے شعور سے بغیر آپ صبا اکبر آبادی کی شاعری کی انفرادیت کے لطیف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ان کی زبان سادہ ہے لیکن اس سادگی میں جو مہر کاری ہے اور اس سادگی پر کاری سے جو لہجہ بنا ہے وہ اکبر آباد کے لسانی و تہذیبی مزاج ہی کی دین ہے۔ یہ بات جو میں نے کہی ہے دراصل ذرا سی وضاحت چاہتی ہے اور اس وضاحت کے لیے میں آپ کو صبا صاحب کے دو چار شعر سنانا چاہتا ہوں :

ماہیت پر کسی کی غور نہ کر

جو نظر آئے بس وہی ہے میاں

موت وہ ڈھیٹ بھکاری ہے کہ جان لیجے کو  
لکھ چاہیں کہ نہیں کئے مگر آتی ہے

کیا مدت بھر دو گھڑی ہے  
یہ قبر کی رات سے بڑی ہے

جینے جی تک شغلِ پیہم تھا یہی  
مرنے مرتے نام تیرا ہی لیا

اُس بارگاہِ ناز کا اعجاز دیکھنا  
میں چُپ رہا تو دستِ دعا ہلنے لگا

سلنے کہاں ہیں ایسے محبتِ رسیدہ لوگ  
کرتے رہو ہماری زیارت کبھی کبھی

ابھی تو قافلہٗ خاک و خوں بھی گزرے گا  
ابھی تو صرف چمن سے بہار گزاری ہے

کسی بندے کی خدائی ہو تو اُس سے پوچھیں  
کتنے دن گتے میں بندے کو خدا ہونے تک

دل آئینہٴ فحلی، محبوب آئینہ  
کھو یا ہے عکسِ سلسلہٴ انکس میں

بھیڑ تنہائیوں کا میلہ ہے  
آدمی۔ آدمی اکیلا ہے

بظاہر اس سادہ لہجے میں فطرتاً ہی نیازی کی ایک نرم سی کیفیت کے ساتھ ایک ایسی تیزی بھی چھپی ہوئی موجود ہے جو دل میں اتر جاتی ہے۔ نرمی اور تیزی کے اسی امتزاج سے وہ لہجہ بنا ہے جو صبا صاحب سے مخصوص ہے۔ یہی لہجہ ان کی شناخت ہے۔

صبا صاحب نے اردو غزل کی تاریخ میں جو کچھ کہا ہے وہ اردو غزل کی روایت سے پوری طرح وابستہ کر لیا ہے۔ انھوں نے بعض شاعروں کی طرح روایت سے دامن بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ روایت میں عصر حاضر کے مزاج کو شامل کر کے اسے بدلا بھی ہے اور وسیع بھی کیا ہے۔ اس میں نئی حسیّت کو سمویا بھی ہے اور نئے تجربات و مشاہدات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اسی سے صبا صاحب کی غزل ایک باشعور شاعر کے احساس زیست کا زندہ اظہار ہے اور اسی لیے ان کے شعر ہمارے دلوں کی ترجمانی کر کے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں ماضی بھی محفوظ ہے اور حال بھی لیکن حال ماضی بن کر نہیں بلکہ ماضی حال بن کر محفوظ ہوا ہے۔

اردو غزل کی روایت میں لاتعداد شاعروں نے شعر کہے ہیں لیکن کتنے شاعر ہیں جنھوں نے اس روایت کو آگے بھی بڑھایا ہے اور میرا خیال ہے کہ صبا اکبر آبادی دو بہ حاضر کے غزل گو یوں میں اسی لیے ممتاز ہیں اور اسی لیے وہ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں:

لے ناقدان عجیب و ہنر احتیاط سے

میری ستارہ عجیب کی جنہن ہنر نہ ہو

(۱۳، فروری ۱۹۸۵ء)



## فارسی رُباعیات غالب کا اردو ترجمہ

اب تو ہواؤں کا رخ بدل گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب فارسی زبان ہمارا اڑھنا بچھونا تھی۔ بچوں کی تعلیم کا آغاز جبک ایڈجل وینٹ اپ دی بل کے بھائے محمّد خان ہرستان سے ہوتا تھا لوگ شوق سے فارسی پڑھتے تھے۔ فارسی اشعار اور فارسی ضرب الامثال چشمہ شیریں کی طرح زبان سے رواں تھیں۔ بزرگ عظیم پاک و ہند کی مسلم تاریخ اور کم و بیش ساری علمی و ادبی میراث اسی زبان میں محفوظ تھی اور کچھ بھی محفوظ ہے لیکن فارسی زبان کے عدم رواج نے اس میراث کو ہمارے لیے بے معنی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کچھ اپنی تاریخ کی صحیح ترجمانی سے قاصر ہیں۔ جو انگریزوں نے لکھ دیا ہمارے لیے مستند ہو گیا اور کچھ انھیں حوالوں سے ہم اپنی تاریخ کو پہچانتے ہیں اور اسے بے مایہ و حقیر جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں اپنی چیزیں کم تر اور اپنی میراث بے وقعت نظر آتی ہے۔ غور کیجیے کہ اٹھارویں صدی عیسوی تک ہمارا جو کچھ ادبی، علمی، تہذیبی و تاریخی سرمایہ تھا وہ زیادہ تر فارسی زبان میں تھا اور کچھ ہم فارسی زبان سے کم و بیش ناواقف ہیں۔ ماضی سے ہمارا رشتہ کم زور ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی صورت حال رہی تو مجھے یقین ہے کہ ہم اسی طرح تیسرے بلکہ چوتھے درجے کی قوم بن کر راہ حیات کو طے کرتے رہیں گے۔ بہر حال جب میری قوم نے یہ طے کر لیا ہے کہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی میراث کو ترک کر کے بیرونی تہذیب کو اپنانے لگی تو پھر میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ بقول اکبرؒ

نیک و بد حضور کو سمجھائے جلتے ہیں

حضرت صاحب اکبر آبادی کو بھی میری طرح یہی خلش تھی اور اسی لیے انھوں نے

غالب کی فارسی رباعیوں کا اردو میں ترجمہ کیا تاکہ ہندو چٹے کاٹھن کھول دیں اور اہل ذوق کی تشنگی دور کرنے کا سامان مہیا کر دیں۔ غالب ہمارا عظیم شاعر ہے۔ ایک ایسا شاعر جو مسلم تہذیب کی علامت بن گیا ہے۔ وہ آج بھی ہمارا ایسا شاعر ہے جو مختلف موڑوں پر زندگی کے مختلف تجربات کے دودھوں پر ہمارے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر کے ہمیں تازہ دم کر دیتا ہے۔ غالب کا اردو کلام بلاشبہ لافانی ہے لیکن اس کا فارسی کلام بھی اردو ہی کی طرح لافانی اور بے مثل ہے۔ اس کا اپنا لہجہ اور اس کا اپنا رس ہے لیکن ہم فارسی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر اس سے لطف اٹھانے کی اہلیت ہی گنوا بیٹھے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے علمی، ادبی، تہذیبی و تاریخی سرمائے کو اردو میں منتقل کریں تاکہ بن قلعے کا دروازہ کھل جائے اور ہم اپنے ماضی کی میراث سے اپنا حقیقی تہذیبی رشتہ قائم کر سکیں۔ حضرت صبا اکبر آبادی نے کئی سال پہلے عمر خیام کی رباعیات کا اردو ترجمہ کیا تھا اور ایسا کیا تھا کہ ترجمے میں کمر و دھن کی کلی کھل اٹھی تھی اور اب غالب کی ۱۰۳ رباعیات کا اردو ترجمہ کر کے ایک اہم اور قیمتی کام کیا ہے۔ غالب نے فارسی میں ۱۲۷ رباعیات لکھیں جن میں سے ۱۰۴ کا ترجمہ اردو زبان میں اس طور پر ہوا ہے کہ اگر غالب اپنی رباعیوں کا اردو میں ترجمہ کرتے تو میرا خیال ہے کہ وہ ایسا ہی ترجمہ کرتے جیسا حضرت صبا نے کیا ہے۔ ترجموں کو چھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف غالب کے لہجے، غالب کی شاعری کے رس، غالب کی فکری لطافتوں کے راز و ان میں بلکہ انہیں اردو زبان، اس کے اسلوب اس کے مختلف لہجوں اور اظہار و بیان پر پوری قدرت بھی حاصل ہے۔ یہ کلام ہمارے دور میں حضرت صبا اکبر آبادی ہی کر سکتے تھے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ کام انہوں نے ہی کیا ہے۔ جیسا صاحب نے غالب کی فارسی رباعیات اور اپنے ترجموں کو ساتھ ساتھ شائع کیا ہے اور اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ ان ترجموں میں وہ تخلیقی شان موجود ہے جو غالب کی فارسی رباعیوں میں نظر آتی ہے یہ کام کہ کے انہوں نے فارسی گو غالب کو ہماری تہذیب کے آئینوں میں لاکھڑا کیا ہے اور اس موقع

پر اگر میں حضرت صبا سے یہ فرمائش بھی کر بیٹھوں تو بے جا نہ ہو گا کہ حضرت صبا! فارسی کا چلن ہمارے دور میں بہت کم ہو گیا ہے۔ کتنے ولے زماؤں میں یہ چلن اور کم ہو جائے گا۔ اس لیے اگر وہ غالب کی فارسی غزلوں کا اردو میں ترجمہ کر دیں تو نہ صرف اردو زبان پر احسان ہو گا بلکہ ہماری تہذیب کے چمن میں بہار آجائے گی۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن سارے ملک میں اس کام کو قہبا صاحب ہی کر سکتے ہیں۔

غالب نے خود کہا تھا:

فارسی میں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ  
بگداز از مجموعہٴ اردو کہ بے رنگ من است

آپ خود سوچیے کہ جب غالب کا اردو کلام جسے اس نے ”بے رنگ من است“ کہا ہے اتنا بول رہا ہے تو وہ فارسی کلام جسے غالب نے ”نقشہائے رنگ رنگ“ کہا ہے ہمارے تہذیبی زندگی میں کیسے کیسے نئے رنگ نہ گھولے گا؟۔ حضرت غالب بھی جناب صبا سے اس رباعی میں شاید یہی کہہ رہے ہیں:

مائل بہ کرم عالمِ رحب دار ہے      شاید مرا غم خانہ بھی آہاد رہے  
مجھ سے تو وہی مطرب خوش نحو اچھا      حمد و سراں کے گیت پہ دل شاد رہے

(ہم کلام ص ۱۱۱)

اب دو چار رباعیاں اور سن لیجیے اور اندازہ کیجیے کہ حضرت صبا نے کیا خوب صورت ترجمہ کیا ہے:

شب کیا ہے سیریلے دل اہلِ نال      بڑھ جاتا ہے اور حسن کا زلف و خط و نال  
معراجِ رسول بھی ہوئی تھی شب میں      اس سے بہتر نہیں تھا کوئی نہنگامِصال

اک روز شراب چھوڑنا ہے غالب      پھر ساقی کے ہاتھ جوڑنا ہے غالب  
کیا فائدہ یہ ہوئی تو بہ کر کے      نئے دونوں طرف جوڑنا ہے غالب

افلاس کے عالم میں ہوئی تلخ حیات  
لے کاش نماز اور روزہ ہوتے  
طاقت بھی نہیں ہوتی بہ امید نجات  
مشروط بہ مال جیسے حج اور زکوٰۃ

زاہدِ حقیقت میں کیوں قلائعیں نہ بھریں  
ان کا ہے وہی حال زروئے تشبیہ  
اب تک نہ کیے تھے جہز کے کہیں نہ کریں،  
جو پائے ہرے کھیت کو جس طرح چریں

غالب تیرا سخن میں مہسر تو نہیں  
مے چاہتا ہے مفت نفیس اور بے حد  
پھر بھی تو عہدِ ہوش سے باہر تو نہیں  
یہ پیرِ مغان ساقی کوثر تو نہیں

شادی جو کرے گا ہو گا دانا کیسے  
گھر ساری خدائی میں ہے گھر والی نہیں  
افکار سے پھر جان بچانا کیسے  
پھر میرا خدا نہ ہو تو انا کیسے

(۹ ارماد ۱۹۸۷ء)



# ضیا جالندھری کی شاعری

ضیا جالندھری چالیس پینتالیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی پہلا مجموعہ ”کلام“ سہ شام کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جب انھیں شاعری کرتے ہوئے چودہ پندرہ سال ہو چکے تھے۔ دوسرا مجموعہ کلام تمبرہ سال بعد انارک کے نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اور اس کے سترہ سال بعد ان کا تیسرا مجموعہ کلام ”خواب سراپ کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس تمام عرصے میں انھیں نے ہر قسم کی ملازمت کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے مگر شاعری کا ہمراہ زندگی کی دھوپ چھاؤں میں سائے کی طرح ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ ضیا جالندھری مجھے عزیز ہیں۔ عزیز اس لیے ہیں کہ ان میں شرافت اور وضع داری کی وہ خوشبو پائی جاتی ہے جو مجھے اچھی لگتی ہے۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ میرے دو عزیز دوستوں کے عزیز دوست رہے ہیں۔ ایک میرے اچھوتی سلیم احمد اور دوسرے میرے بزرگ دوست جنھیں میں محبت سے بڑا بھائی کہتا تھا، ابو الفضل صدیقی۔ اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں اور میں ان دونوں کو ضیا جالندھری میں دیکھ کر خاموشی سے یاد کر لیتا ہوں۔ ضیا جالندھری کو عزیز رکھنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ میرا سچی کے عاشق ہیں۔ میرا سچی نے جن لوگوں کی ادبی طور پر نگہداشت کی ان میں قیوم نظر، یوسف ظفر، الطاف کوثر اور مختار صدیقی کے علاوہ ضیا جالندھری بھی شامل تھے۔ ضیا جالندھری میرا سچی کی باتیں تفصیل اور جزئیات کے ساتھ اس طرح سناتے ہیں کہ اس دور کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ باتیں ایسے کرتے ہیں کہ آدمی مستار ہے۔ ان میں رس بھی ہوتا ہے اور نطقِ زیست بھی۔ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعر نثر لکھنے سے بھاگتا ہے۔ ضیا جالندھری نے زندگی میں جو کچھ دیکھا جن لوگوں سے

سلے اور جو باتیں اور ملاقاتوں کی کہانیاں ان کے حانظے میں محفوظ ہیں اگر نکلہ نہیں سکتے تو بول کر دیکھا کرادیں تو گذشتہ چالیس سال کا ادبی دور محفوظ ہو جائے گا۔

”خواب سراپ“ جب میں نے پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ ”سرشام“ اور ”مارسا“ کے خالق ضیا حاندھری تخلیقی سطح پر آج بھی اسی طرح تازہ دم ہیں جیسے پہلے تھے۔ اب ان کی شاعری میں وہ گہرائی اور ان کے اظہار میں وہ توانائی آگئی ہے جو پڑھنے والے کی روح میں اثر کر اُسے شاد کلام کر دیتی ہے۔ اس مجموعے میں مجھے ایک بنیادی تبدیلی تو یہ محسوس ہوئی کہ اب وہ زندگی کے باطن میں اثر کر اس کے تجربوں کو بیان کر رہے ہیں اور اس بیان میں زندگی کا گہرا شعور فلسفہ و فکر کے روپ میں ابھرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خاندن اور باطن کے تجربوں کی اسیمزیشن سے انھوں نے ایک نئی شاعرانہ بصیرت حاصل کر لی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے پورے سیاسی و معاشرتی شعور کے باوجود ان کا لہجہ بہت کشادہ ہے۔ اس مجموعہ کلام کی شاعری سے امکانات کے نئے درواہ کھلتے ہیں۔

شاعری کے تیسرے مجموعے میں ’جو چالیس سال شاعری کرنے کے بعد شائع ہوا ہوا ہے‘ انھوں نے شاعری کے نئے امکان کو دریافت کر لیا ہے۔ یہ مجموعہ ضیا حاندھری کی شاعری کے نئے مستقبل کی نوید دے رہا ہے۔

اپنی شاعری کے آغاز ہی سے وہ فطرت کے گونا گوں عوامل کو علامت کے طور پر استعمال کرتے اور انسانی جذبات کے ابلاغ کے لیے نئے نئے پیکر تراشتے رہے ہیں، اسی لیے ان کی شاعری توجہ چاہتی ہے۔ وہ توجہ جس سے شاعری کا طلسم اور اس کی تہیں کھلتی ہیں اور شاعری سے وہ حقیقی نطفہ میسر آتا ہے جو باذوق قاری کا اصل سرمایہ ہے۔ ”غوب“ سرب تک پہنچنے پہنچنے جب وہ باطن میں اثر کر انسانی زندگی اور حیات و کائنات کو دیکھتے ہیں تو اعتبار پر اعتبار نہیں آتا۔ ابدی سچائی میں بہار اور خزاں ساتھ نظر آتی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ بے اعتباری ہی اعتبار کی منزل ہے۔ برہنہ تہی دست شاخیں سیاہ ہو کر نئی کلیوں کی شمیں روشن کر کے بہاروں کا پیغام دیتی ہیں یہ ایک ابدی سچائی ہے مگر سچائی بولا شمار کے باوجود :

بار بار ہم نے دیکھا  
 بہاروں کے آنے سے پہلے  
 بہاریں اُھاڑی گئیں  
 اب کے پھر آرہی ہے بہار  
 پھر بشارت سے ڈرتا ہے دل  
 غنچے! کھول آکھ جس جس کے کھول  
 کھل پہ آہستہ آہستہ کھل  
 (بشارت)

یہ وہ نظر ہے جو خضیا جالندھری کے ہاں ایک نئے لمحے کو جنم دیتی ہے۔ یہی شرف نگاہیں اُن کی نظموں — معزول — بڑا شہزادہ ہابیل میں نظر آتی ہے۔ اب وہ تجربے کو ساری زندگی کی اہدی سچائیوں پر پھیلا کر دیکھتے ہیں۔ ہابیل میں اس تجربے کی صورت یہ بنتی ہے :

اور قابیل سے ارشاد کیا تھا اُو نے  
 خونِ ہابیل کی ان ذروں سے بُو آتی ہے  
 پھیل کر اب وہی بُد سارے جہاں پر ہے محیط  
 کیا یہ بُد تابہ اپد تیرا مقدر ہوگی  
 کیا ترے اذن سے قابیل کی خرقا قائم ہے  
 کیا یہ خورتا بہاد میرا مقدر ہوگی  
 (ہابیل)

یہ لمحہ موجود کر اہدی سچائیوں تک پھیلائے گا وہ تخلیقی عمل ہے جو صوفیا کا شیوہ رہا ہے :

واکر دیے ہیں شوق نے سند نقابِ حُسن  
 غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

”معزول“ اور ”بڑا شہزادہ“ میں بھی لمحہ موجود کے اسی تجربے کو حیات و کائنات پر پھیلا کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی صورت ہمیں اُن کی طویل نظم ”بگولے“ میں ملتی ہے۔

اس انداز کی طویل نظموں کو خضیا جالندھری ہی نے اُردو میں متعارف کرایا ہے۔

ان کے پہلے مجموعوں میں پانچ طویل نظمیں شائع ہو چکی ہیں پہلی نظم ”زمستان کی شام“ جب

۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تو کچھ نقادوں نے کہا کہ یہ ایک نہیں بلکہ پانچ نظمیں ہیں جن کو یکجا کر کے ایک عنوان دے دیا گیا ہے مگر ذرا توجہ سے پڑھنے سے اس کے اندرونی رشتے واضح ہو جاتے ہیں۔ ان طویل نظموں میں حسیا جانندھری فطرت کی علامتوں کے ذریعے یا تو ایک ہی حقیقت پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں جس سے اس حقیقت کی کئی تہیں سامنے آتی ہیں یا پھر وہ تضاد کے اندر آخر کار اصلیت کی تلاش کرتے ہیں۔ یہ نظمیں عمل، رومل اور امتزاج کی منزلوں سے گذرتی ہیں اور یقیناً اردو شاعری میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔

اس مجموعے میں طویل نظم ”ہگو نے بھی اس کی مثال ہے۔ اس نظم میں ضیا جانندھری نے چار بنیادی عناصر — آگ، پانی، ہوا اور مٹی کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہاں آگ سورج کے روپ میں آتی ہے۔ یہ نظم ۱۹۶۹ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خاں کا مارشل لا ختم ہوا تھا اور کچھ خاں کے مارشل لا کا آغاز ہوا تھا۔ مارشل لا کے بعد مارشل لا قوم کے لیے ایک مایوس کن مرحلہ تھا۔ یہی مایوسی اس نظم کا موضوع ہے۔ سورج یہاں آمر کی علامت بن گیا ہے جو اپنے جبر سے دشت و صحرا ہی کو نہیں شہر و دیہی کو بھی تباہ کر رہا ہے۔ اس کے مسلسل ظلم سے تنگ آکر مٹی یعنی اپنے والے لوگ اور جبر کے شکار عوام بغاوت کر دیتے ہیں اور اس بغاوت کو بوجھلہا کی علامت کے تقویت ملتی ہے۔ ہر چند یہ بغاوت کامیاب ہو جاتی ہے لیکن پانی (محنت، شعور، انظہار و خیال کی آزادی) نہ ہونے کی وجہ سے پھر کامی کا منہ نہ دیکھتی ہے اور خاک جو آخر خاک تھی، دوبارہ جبر کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر شاعر پھر ”پانی“ (شعور اور انظہار کی آزادی) کے خواب دیکھنے لگتا ہے، جسے وہ محنت کے ہی زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ اس نظم کے ایک طرح سے میرا ذاتی تعلق بھی ہے۔ یہ نظم دوسرے مارشل لا کے زمانے میں پہلی بار سہ ماہی ”نیا دور“ میں شائع ہوئی تھی۔ بات اگرچہ علامتوں کے ذریعے کہی گئی تھی مگر علامات بہت واضح تھیں۔ میرے نزدیک اس نظم کو شائع کرنے کا تجاویز تھا کہ یہ علامات کسی ایک وقت یا ایک عہد کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ یہ تو ہمیشہ سے



ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا کہ انسان اُمیدیں باندھتے ہیں کوشش اور جدوجہد کرتے ہیں اور پھر ناکامیوں کا منہ دیکھتے ہیں۔ تاریخ کا یہ عمل خود ضیا جانندھری کی شاعری کا خاص موضوع ہے :

دل کہ ہے اسرار کا محرم یہ کہتا ہے  
کہ بے آوازنی حرف و بیان  
موجِ محبت ہی مراب

میرے خواب  
بادلوں میں بھیگتی رساتوں کے خواب

میرے خواب  
پیارے پر کب آنکھوں  
مدد بھری راتوں، ملاقاتوں کے خواب

میرے خواب  
خواب کے قزاقوں کے ہونٹوں پر  
نڈر باتوں کے خواب (جگولے)

جگولے کے علاوہ جن نظموں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ ”سرد موسموں کا سورج“،  
”بشدت“ اور ”بڑا شہر“ ہیں اور یقیناً منفرد شاعری کی مثال ہیں۔ میں نے یہاں ضیا جانندھری  
کی غزلوں کی بات نہیں کی ہے۔ وہ پھر ہیں۔

# قمر جمیل کے بارے میں

قمر احمد فاروقی جنھیں دنیائے ادب قمر جمیل کے نام سے جانتی ہے ایک بڑے خاندان کے چہشم و چراغ ہیں جو دنیوی امتیازات کے ساتھ ساتھ تصوف کا بھی اہم گھرانہ رہا ہے۔ دائرہ شاہ اجمل کے نام سے ہم سب ہی واقف ہیں۔ قمر جمیل اسی خاندان کے فرد ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا خاص تعلق ایک طرف حضرت آسی غازی پوری سے ہے اور دوسری طرف ان کا تعلق مسلم سیاست کے اہم رکن مولانا شاہد غازی سے ہے۔ قمر جمیل نے الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم پائی جہاں ان کا شمار یونیورسٹی کے ذہین اور باصلاحیت طلبہ میں ہوتا تھا۔ قمر جمیل نے پاکستان اگر سنٹرل سپر سروسز کا امتحان دیا۔ اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن پھر کیا ہوا اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کرنی اور دوران ملازمت ایک طویل غیر حاضری کے بعد پھر اس سے وابستہ ہو گئے اور آج تک ریڈیو پاکستان ہی سے وابستہ ہیں۔

قمر جمیل اپنے طالب علم ساتھیوں میں اس اعتبار سے بھی منفرد تھے کہ وہ ابتداء ہی سے شاعری کا جوہر رکھتے تھے۔ حساس اور ایک بے چین و مضطرب شخصیت کے مالک۔ ان کے مزاج میں ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ تلون رہا ہے۔ وہ کبھی ایک جگہ نہیں رُکے اور ذہنی ارتقاء کے ساتھ ان کی شاعری کے موسم بھی بدلتے رہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں میں یکساں تخلیقی صلاحیت کے مالک ہیں۔ نثر بھی لکھتے ہیں اور تنقید بھی۔ تنقید میں بھی ان کا اسلوب ان کی شاعرانہ شخصیت کے زیر اثر رہتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت اور ذہنی فضا کئی پہلو رکھتی ہے۔ اس فضا میں متضاد

عناصر کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک حساس شاعر اور روحانی حسیات کے مالک ہیں۔ وہ صوتی نہیں ہیں لیکن صوفیوں کی واردات قلب کے آشنا ہیں۔ یہ سب عناصر ان کی شاعری اور نثر میں واضح طور پر نظر آتے ہیں لیکن ان کی ذات میں پوری طرح جذب ہو کر ایک اکائی نہیں بن سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت متضادم و متضاد عناصر کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔

یہ سب باتیں میں نے اس لیے بیان کی ہیں تاکہ اس بات کا پتا چل سکے کہ قمر جیل نے مختلف ادوار میں مختلف اسالیب کیوں اختیار کیے؟ ان کا ابتدائی کلام ایک بیانیہ انداز بلکہ خطیبانہ لہجہ رکھتا ہے۔ اس میں ایک جوش، ایک اندرونی اضطراب اور دوسروں سے براہ راست مخاطب ہونے کی تحریک ملتی ہے۔ وہ انسانی تاریخ کے بعض اہم لمحوں، قبائلی زندگی کے پُر جوش اور توانا جذلوں، قدیم تہذیبوں کے خوب صورت رنگوں کو اپنے اس انداز و لہجہ میں سمو کر ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ان کا دوسرا رنگ ان نظموں میں نظر آتا ہے جہاں وہ قدرت سے ہم کلامی اور اس سے اپنی ذات کو وابستہ کرنے کا ایک خاص اہتمام کرتے ہیں۔ یہاں فطرت سے ان کا تعلق گہرا اور بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کا تیسرا رنگ ان نظموں میں نظر آتا ہے جہاں وہ نرم لہجہ اور گداڑ کیفیات کو نئی شاعری کے بعض تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس نوع کی نظموں میں گہری تاثیر اور جذبے کی صداقت موجود ہے۔

قمر جیل نے بعض شعری تجربے بھی کیے ہیں مثلاً تین تین مصرعوں کی نظم کا تجربہ یا نثری نظموں کا تجربہ۔ تین تین مصرعوں کی نظم کے وہ اولین معمار اور اردو میں نثری نظم کی تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ”چہا خراب“ اور ”دریائے نیل کے سیلاب“ سے لے کر نثری نظم تک قمر جیل کا شعری سفر ایک خاص مطالعہ چاہتا ہے جو اس وقت ممکن نہیں ہے۔ میں تو یہاں قمر جیل کی شاعری و شخصیت کے چند مختلف پہلوؤں کو سلنے لاکر ان کی حقیقی تخلیقی صلاحیتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ جب آپ ”چہا خراب“ کا مطالعہ کریں تو اس سے پوری طرح نطفہ اندوز ہو سکیں۔ یہ ہمارے دور کے ایک اہم شاعر

کا ایک اہم اور قابل ذکر مجموعہ کلام ہے۔

قرمیل کی نظموں میں قدیم خواب، اساطیر، تاریخ اور انسانی ارتقاء کی جھلکیوں کے ساتھ موجودہ عہد کی بے چین فکر اور مضطرب حیات انسانی ایک عجیب تناظر کو سامنے لاتی ہیں۔ گزشتہ دس سال کی شاعری میں قمر جمیل نے موجودہ عہد اور موجودہ انسان کے مسائل کو جس خوبصورتی اور فن کارانہ چابک دستی سے گرفت میں لیا ہے وہ اُن کی سچی شاعرانہ صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ اسی لیے وہ ایک اہم جدید شاعر ہیں۔

قمر جمیل نے نظموں کے ساتھ غزلوں پر بھی پوری توجہ دی ہے۔ ابتداء میں ان کی غزلوں میں فطرت نگاری اور انسانی فکر کے چند ایسے پہلوؤں کی آمیزش ملتی ہے جو ان کی غزلوں کو ہماری روایتی غزل یا غزل کے خاص اسلوب سے مختلف بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نادر کاظمی کے بعد سب سے زیادہ مسلسل غزل لکھی ہے۔ قمر جمیل نے ادھر جو غزلیں لکھی ہیں ان میں بعض غزلیں بڑی بوٹا اور غزل کے خاص اور نئے عناصر پر مشتمل ہیں۔ بیشتر غزلوں میں انہوں نے اپنے ذہنی دستکری تجربات کو اس طرح شامل کر دیا ہے کہ بہان کو نثری نظم کی مانند، ایک طرح کی نثری غزلیں کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کا دکھانا مشکل ہے

آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے

اس کے قدم سے پھول کھلے ہیں میں نے تنہا ہے چاروں طرف

ویسے اس ویران سرا میں پھول کھلانا مشکل ہے

غزل نے ہر دور میں اپنی تخلیقی وسعت اور امکانات کا ثبوت دیا ہے مگر اس کے لیے شاعری کا جو ہر ضروری ہے۔ قمر جمیل نے بعض غزلوں میں جدید حیثیت اور جن تجربات کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے ان سے ایک نیا امکان اور ایک نیا راستہ کھل رہا ہے۔ ان غزلوں میں نیا سین اتنا اہم نہیں ہے جتنا بعض تجربات اور جدید حیثیت کے غزل کے خاص مزاج کا حشر بتانے کی کوشش قابل توجہ ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ چند ہی غزلیں ایک ایسا نیا راستہ دکھا رہی ہیں جس سے کئے والی غزل اپنی توانائی حاصل کرتی ہے۔ ”چار خواب“ کی ایسا غزل

جدید شاعروں کو یقیناً دعوت فکری دیتی ہیں :

شہر میں سب کی غیبتیں مجلسوں میں نواہری  
پھر بھی مرے لہو میں ہے ایک عجب قلندر کی  
چاند میں جیسے فاختہ شارب پہ جیسے چشمِ نم  
غم ہے عجیب کھوکھلا رات عجیب مسخری  
رات بہشت میں مجھے اپنا خدا بھی مل گیا  
میں نے اسی کو سوئپ دی اپنی کلا و کستری  
اس کی نگلی سے کئے ہیں لوگ یہ سوچتے ہوئے  
آنکھ میں ہفت آسمان ہاتھ میں اک کبوتری

چلے گئے بات کرنے وہ سیاست جہاں پر  
کہ سمندروں میں جیسے کوئی پھینکتا ہو پتھر

ترے دل کے سائباں میں گراں عجب چاک  
کوئی سنگِ گزیدہ جیسے گرے اپنے گھر میں آکر

اپنے گھر کے آگن میں جب بہار آتی ہے  
لڑکیاں نکلتی ہیں سائباں سے آگے

آگے میری کھڑکی میں لامکاں ٹٹہرتا ہے  
عشقِ رقص کرتا ہے ہر گمان سے آگے

قر مجیل نے "خوابِ نما" سے لے کر "پہارِ خواب" تک جو شعری سفر کیا ہے وہ

اپنے تمام تضادات کے باوجود امناء متون اور ہمد رنگ ہے کہ ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قمر جیل میں اس عہد کے بنیادی تصادم تضاد اور تقاضوں کو طرح طرح کے اسالیب میں بیان کر کے جوہر موجود ہے۔ "چہار خواب" دراصل ان کے شعری سفر کا ایک انتخاب ہے جس میں انہوں نے ہمد رنگ کے بہترین کلام کو شامل کر لیا ہے لیکن "چہار خواب" میں ان کی موجودہ نظمیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں جن میں قمر جیل نے اس عہد کے خوابوں کو مقید کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے اور اسی وجہ سے "چہار خواب" ہماری جدید شاعری کا ایک اہم مجموعہ ہے۔ جہاں تک قمر جیل کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے وہ اس عہد کے اُن گفنے چنے شاعروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ایک طویل تخلیقی سفر کیا ہے اور اس سفر میں انہوں نے متون اسالیب اور اصناف کو وسیلہ اظہار بنایا ہے اور ان کا ہر وسیلہ اظہار اپنا اعتبار رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے جدید تجربات کو جس طرح شاعری میں سمویا ہے اور اس سے جو تنوع پیدا ہوا ہے وہ کسی ایک نئے شاعر کے ہاں مشکل سے نظر آتا ہے۔ ان کا نازہ کلام دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فطری شاعر ابھی تھکا نہیں ہے اور میں ان کے مزید شعری کارناموں کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ ایک تخلیقی شاعر آخری لمحہ تک تخلیقی شاعر رہتا ہے اور اس کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ میں اپنی بات کو قمر جیل کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

ابھی تو مٹی پہ چل رہے ہو

ستارہ بن کر نکل نہ جاتا

(ہمد رنگ، اگست ۱۹۶۶ء)

## صدا انصاری کی غزل

کتابوں کی تعارفی تقریب کا مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کم فرہنگی کے شکار اہل بلاغ عامہ کے اس دور پر شور میں، جب ہر شخص صرف اپنی روزی کمانے میں مگن ہے اور شہویر زمانہ نفاذ خانے میں روایتی طوطی کی صدا سننے کو آمادہ نہیں ہے، تعارفی تقریب کی وجہ سے کچھ اچھے لوگ، بغیر نفیس جلسے میں شریک ہو کر کتاب کے بارے میں کلماتِ خیر سن سکتے ہیں اور بہت سے دوسرے اخباروں میں تقریب کی خیر طرح کر یا ریڈیو سے اس کی روداد سن کر مصنف و کتاب کے نام سے متعارف ہو جاتے ہیں اور یہ کتاب اگر کہیں اتفاق سے انہیں نظر آجائے تو اس تقریب کی بخوبی پسری یاد انہیں اس کتاب کو خریدنے کی ترغیب دیتی ہے حالانکہ میرا خیال ہے کہ ایسا شاید کم کم ہوتا ہے۔ ایسی تقریروں کا ایک فائدہ اور بھی ہے۔ ہمارے زمانے میں جب لوگ عام طور پر صرف اپنے معیار زندگی کو خوب سے خوب تر کرنے میں مصروف ہیں اور نہ کسی کے پاس وقت ہے اور نہ خلد گ کہ اپنی اور اپنے ذور کی روح کا مطالعہ کرے جو صرف ادب و شعر میں ظاہر ہوتی ہے تو ایسی صورت میں تعارفی تقریب سے لکھنے والے کی اتنی حوصلہ افزائی ضرور ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں کلماتِ خیر سن کر تازہ دم ہو جائے اور ادب کے کام کو کاربے کاران سمجھ کر خیر باد نہ کہے۔ اس طرح ادب کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ ایسی تقریروں کا یہ وہ مثبت پہلو ہے کہ میں ذاتی طور پر ان تقریروں کا باجی ہوں۔

صدا انصاری صاحب، جن کے نئے اور تیسرے مجموعہ کلام ”توسین“ کی تقریب رونمائی کے سلسلے میں آج ہم جمع ہوئے ہیں، ادب و شعر کے سچے عاشق ہیں۔ سائنس کی اعلیٰ

تعلیم پانے کے باوجود ادب کی دنیا میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ آئے ہیں۔ شاعری ان کا میڈیم ہے اور صنف غزل ان کا ذریعہ اظہار ہے۔ سائنس کی تعلیم اور ذہنی تربیت کی وجہ سے ان کا ذہن جن خطوط پر سوچتا ہے، وہ اس ذہن سے بہت مختلف ہے جو کج غزل کی شاعری میں اپنا خون جگر صرت کر رہا ہے۔ قصید انصاری کا کلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ غزل کی روایتی علالت اور مزیات کو ایک نئی وسعت دے رہے ہیں اور خدا، کائنات اور انسان کو اس نظر سے دیکھ رہے ہیں جہاں لامتناہیوں میں مسلسل بڑھتی پھلتی کائنات ہر دم بدل رہی ہے۔ آج جب سائنس انسان کا ذہن، اس کی سوچ اور اس کا رخ بدل رہی ہے اور ہم نسب پیچھے چلنے اور اوپلا کرنے کے باوجود رفتہ رفتہ اس کے آغوشِ ٹکس میں آ رہے ہیں، قصید انصاری کی شاعری ہمیں اس تبدیلی کا شعور عطا کر کے ہمارے ذہن کے بند درکوں کو کھول رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے ان کا یہ مجموعہ کلام پڑھا تو مجھے تازہ ہوا کے جھوکے نے تازہ دم کر دیا۔ قصید انصاری نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور غزل جیسی ظالم روایتی صنف کے ذریعے سائنسی فکر کو جذب و احساس بنا کر شاعری کا روپ دے دیا۔ تبدیلی کائنات کا بنیادی عمل ہے اور اسی لیے زندگی پل پل بدل رہی ہے۔

بدل رہی ہیں شب و روز صورتیں کیا کیا

دوام کو بھی نہ حاصل کبھی دوام ہوا

وہ لوگ جنہوں نے قصید انصاری کا دوسرا مجموعہ کلام ”اج“ ”بدن“ کے نام سے ۱۹۸۱ء شائع ہوا تھا، پڑھا ہے جلتے ہیں کہ اس مجموعے میں انہوں نے اسی سمت میں اپنا سفر تخلیق اختیار کیا تھا۔ یہی سفر ان کے تیسرے مجموعہ کلام ”قوسین“ میں جاری ہے۔ فکر کی اسی مخصوص سمت کی وجہ سے قصید انصاری کی غزل، آج کی غزل سے، خیالات، احساسات اور لہجہ و آہنگ کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن مروجہ سچائیوں اور خیالات سے ہار ہار ٹکرا رہا ہے۔ اسی آویزش سے ان کی شاعری کی چنگاری روشنی دیتی ہے۔ وہ شعور کو وجدان پر فوقیت دیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ عقل کے فتور کو بھی دیکھتے ہیں۔ اسی عمل سے زندگی آگے بڑھتی ہے اور سو یا ہوا منجمد ذہن



بیدار ہو سکتا ہے۔ یہی بیداری بنی آدم کا شرف اور اس کا جوہرِ ذات ہے۔

جوازِ مجھ سے سلا ہے تری بلندی کو

ترے کمال میں میرے تصور کتنے ہیں

جیسا کہ قصیدہ انصاری نے اس کتاب کے "انتساب" میں بتایا ہے کہ شرف بنی آدم

اس مجموعہ کلام کا بنیادی موضوع ہے لیکن مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے اور میرا خیال ہے

کہ آپ بھی قصیدہ انصاری صاحب کے بتائے ہوئے راستے پر آنکھ میچ کر نہ چلیں بلکہ یہ دیکھیں

کہ وہ کیا روپ ہے جو ان کی غزل میں سامنے آیا ہے۔ شرف بنی آدم کا موضوع اس مجموعے کی

غزلوں میں آیا ہے اور خوب آیا ہے لیکن ان کی غزلوں میں اس موضوع سے علاوہ بھی وہ تنوع

اور رنگارنگی ہے جو ہمارے دامن دل کو حضرت زلیخا کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔ شرف

بنی آدم کی طرف اپنے قاری کی ساری توجہ مبذول کر کے انھوں نے "فوسین" کے ساتھ

خود انصاف نہیں کیا ہے۔ نظم ایک موضوع تک محدود ہو سکتی ہے۔ مسلسل غزلیں بھی ایک موضوع تک

فضا یا رنگ کو نہ بھرا جاسکتا ہے لیکن کوئی سا مجموعہ غزلیات کو محض ایک موضوع کا پابند کرنا بھی چاہیے تو

نہیں کر سکتا یہی تو غزل کی ادا ہے۔ میں اپنی بات وضاحت کے لیے آپ کے سامنے ادھر ادھر سے چند شواہد پیش کرتا ہوں۔

بس گینا جسم میں آخر درو دیوار کا حبس

لوگ گھبرا کے بہت شام کو گھر سے نکلے

شاید کہ خوشگوار ہوں قربت کی تلخی یا ان فاصلوں کو آؤ ذرا اور کم کریں

ایسے گھروں میں کون بے گنا جہاں صمد

دیوار و در کے ساتھ لب و گوش بھی ہوتے

ہے مرے گھر تک مرے گھر کی اذان میری مسجد ہے مری محراب تک

طہم لوٹ گیا آرزو کے موسم کا۔ کوئی خیال نہ آیا ترے خیال کے بعد

لچک جاتی ہے شاخ بے ثمر بھی ہے قامت منحصر حسنِ ادا پر

گو نچ ہے کس کے بدن کی مری دیواروں میں  
گھر مرے کون ہے گلیوں کی ہوا کیا جانے

کون کاٹے گا مرے پاؤں کی زنجیروں کا  
کس کے ہمراہ مرا زادِ سفر جانے گا

شاہتوں سے عیاں فکر و فن نہیں ہوتے  
ہیں سانپ ایسے بہت جن کے کچھ نہیں ہوتے

قدم کی چاپ میں رہتی ہیں رہ گزاریں بھی  
سوا دہ عمر میں عہدِ شباب شامل ہے

اپنے بدن کا بوجھ اٹھانا پڑے گا خود  
اس شہر میں تو اب کوئی مزدور بھی نہیں

قدم قدم پہ لڑے ہیں نئی شکستوں سے  
وہ لوگ جن کو فقط ایک مات کافی تھی

اگر چراغ پر اسے اتر گئے ہوتے  
حرم کے طاق ستاروں سے بھر گئے ہوتے

دستِ دعا اٹکے ہیں کبھی آسمان کی سمت  
نکلے تھے جو زمیں سے وہ انبار کیا ہوئے

کس کا بدن اٹھائے امانتِ دھڑکی  
بندہ خدا کا ملکِ خدا سے نکل گیا

جس کے لیے رگوں میں اُتار گیا ابو  
وہ روشنی بدن کی سیاہی کے ساتھ ہے

فریبِ سنگ میں اصنام ہیں یہ کہ پھرے  
نئے بدن کی کبھی جستجو نہیں حالی

بکھ جاتے ہیں سوانحِ ہی اندھیروں کے سفر میں

مغرب سے کبھی دن کو نکلنے نہیں دیکھا

یہ اشعار کپ نے سُنے اور یہ وہ اشعار ہیں جو "قوسین" میں شامل ہیں۔ ان میں وہ تنوع ہے جو غزل کی دین ہے، جن میں ایک جدید ذہن زندگی کو اپنے رُخ الہیے زاویے سے دیکھ رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شرفِ بنی آدم کے موضوع پر جیسا کہ میں نے ابھی کہا، اس مجموعہ میں بہت سے اشعار موجود ہیں لیکن سارا مجموعہ صرف اسی ایک موضوع تک محدود نہیں ہے بلکہ اس مجموعے میں ایک ایسی رنگارنگی ہے کہ میں اس مجموعے کو پڑھ کر صد انصافی کا قائل ہو گیا۔ قوسین یقیناً اس دور کا ایک منفرد مجموعہ ہے۔

رسوا سر بازارِ غزل کر گیا مجھ کو

تھا خوف بہت جس کو سری پردہ وری کا

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ صد انصاری صاحب نے بہت غزلیں کہیں اور انشاء اللہ اور کہیں گے لیکن اگر وہ ساتھ ساتھ "نظم" کی طرف ہی توجہ دیں تو پھر دیکھیں کہ پردہِ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے!! میرے کہنے سے وہ ذرا یہ بھی کر دیکھیں۔

## پرتور وہیلہ اور اُن کی شاعری

یہ آج سے ۲۱-۲۲ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک گہر و جہان مجھ سے ملنے آیا۔ دراز قد،  
 نیشیل آنکھیں، ورق سے ہونٹ، دہلی مسکراہٹ لیے، کھڑی ناک، خاندان کا پتہ دیتی ہوئی،  
 گورا پنڈرائگ، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، چہرے پر بھولین، جیسے صبح ہو رہی ہو۔  
 سر پر قرقل ٹوپی، کتھی رنگ کا کوٹ، خوش پوش بھی اور خوش گفتار بھی۔ کھنڈر ابھی  
 اور سنجیدہ بھی۔ قہقہے لگاتا تو رات جاگ جاتی۔ خاموش ہوتا تو دن سونے لگتا۔ تعارف  
 کرایا تو مختار علی خان نام بتایا اور کھٹکے تو پتہ چلا کہ شاعر ہیں، پرتو تو مخلص کرتے ہیں اور  
 لفظ روہیلہ خاندان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حافظ رحمت خان کی اولاد ہیں۔ وہی  
 حافظ رحمت خان جنہوں نے اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل  
 میں ہندوستان کے ایک حصے کو داد و شجاعت دے کر فتح کیا اور روہیلہ کھنڈ نام رکھ کر  
 اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ پاکستان وجود میں آیا تو حافظ  
 رحمت خان کے خاندان کا یہ حصہ اپنے وطن لوٹ آیا۔ مختار علی خان یہیں آباد ہو گئے اور  
 شادی بیاہ کر کے یہیں کے ہو رہے۔ یہی صوبائی کے ممتاز خاندان کی چشم و چراغ۔ آغوشِ دا  
 کر کے مختار علی خان کو ایسا اپنا یا کر من و تو ایک ہو گئے۔ ایک جان دو قالب۔ یہی وہ  
 حقیقی یک جہتی تھی پاکستان کو جس کی ضرورت تھی اور جس کا عملی اظہار مختار علی خان نے  
 کیا۔ پاکستان محبت کے امنی رشتے کی تلاش کے لیے وجود میں آیا تھا اور محبت کا ہی رشتہ  
 آج بھی ہماری ضرورت ہے۔

مختار علی خان پرتور وہیلہ نے اس علاقے کی روح کو قومی روح میں جذب کرنے

کے لیے پشتو لٹے کو اردو میں منتقل کر کے قومی کلچر کے دریا کو پاٹ دار بنانے کا وہ عمل کیا جو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ پاکستان مختار مل خان کا خواب تھا جس کی تعبیر آج بھی ان کی حسرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وطن پرستی اور حب وطن ان کی شاعری کا محبوب موضوع ہے اور ان کی شاعری کے خمیر میں اس طرح شامل ہے جس طرح روح جسم میں شامل ہو کر زندگی کا پیغام دیتی ہے ہر تور و ہیلہ کے اب تک ”نئے“ کے علاوہ تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ غزلوں کا ”پرتو شب“ کے نام سے دوسرا مجموعہ دو جوں کا ”رین اجیارا“ کے نام سے اور تیسرا مجموعہ نظموں، غزلوں کا ”لڑائے شب“ کے نام سے۔ ان سب مجموعوں میں آپ کو ایک ارتقاء کا احساس ہوگا اور آپ محسوس کریں گے کہ پرتو و ہیلہ کے ہاں اب تک خود کو دہرانے کا عمل شروع نہیں ہوا ہے بلکہ وہ تخلیقی سطح پر مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اتفاق سے ان کے پہلے دو مجموعوں پر پیش لفظ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ جب ”پرتو شب“ شائع ہوا تو میں نے اس کے پیش لفظ میں لکھا تھا اور یہ بات ۱۹۷۲ء کی ہے کہ اگر پرتو و ہیلہ اپنے اس مجموعے کو آج سے دس سال پہلے شائع کرا دیتے تو اہل ذوق کو معلوم ہوتا کہ یہ شاعر اپنے رنگ و سخن کے اعتبار سے اپنے دور کے شاعروں سے کتنا آگے تھا۔ ۱۹۶۶ء کی غزل کا یہ شعر دیکھیے۔

کبھی جو ماضی کے پیر میں، میں نے یاد کی الٹنی پہ ڈالے  
تو تلخی ریشی تہوں میں غزلوں کی خوشبو بسی ملی ہے

یا یہ شعر سنئیے ۱

رات بھر دوست یہ احساس رہا کوئی مرنے لکھا ہو جیسے

یہ وہ رنگ و سخن ہے جو روایت سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پرتو و ہیلہ نے نئے رنگ اور نئی خوشبو سے اردو شاعری کے صحن کو معور کر دیا ہے۔ ”پرتو شب“ میں مجھے ایک بات یہ بھی شدت سے محسوس ہوتی تھی کہ پرتو کی غزل میں میت تو غزل کی ہے لیکن مزاج اور لفظیات پر وہ ہے کارنگ غالب ہے اور میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر وہ دوہے کی طرت توجہ کریں تو نیا جہنم آباد کرنے کا

پورا امکان موجود ہے۔ پرتونے ”دو ہے“ کی طرف پوری توجہ کی اور ان کا دوسرا مجموعہ کلام ”رین اُجیارا“ صرف دو ہوں پر مشتمل تھا۔ اہل ذوق جانتے ہیں کہ پرتونے دو ہے کہہ کر اردو شاعری کی جدید تاریخ میں اپنا مقام بنالیا ہے اور بہت آگے نکل گئے ہیں۔ وہ ہوں میں انہوں نے اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے تہذیبی پیکروں اور تمثالوں کو عام زندگی سے لے کر شاعری کے ہار میں عجیب کیفیت کے ساتھ گوندھ دیا ہے۔ یہ وہ تخلیقی و تہذیبی عمل ہے کہ اس سطح پر کوئی ان کو نہیں پہنچتا۔ ان کی شاعری کو دیکھ کر جوش ملیح آبادی نے کہا تھا کہ

”ان کی آواز دھیمی اریلی اور شعبنی ہے جس کے سایہ میں مور ناز

رہے ہیں۔ بولوں میں ہندی کا لہجہ اور پنگھٹ کی گراہیوں کی ناجاتی پہلی

بھیریاں ہیں۔“

ایک دوا اس موقع پر آپ بھی سن لیجیے :

ساگر سے جب کوئی اچھا گن بوند الگ ہو جائے

سورج تاپے، بھاپ بے، پھر برے تپ بل پائے

یہیں زندگی کا تخلیقی و تہذیبی عمل ہے۔ یہی توحید ہے۔ یہی یک جہتی ہے۔ یہی فضل

سے ہٹ کر فضل کا راستہ ہے۔ یعنی دو پہنے سے ایک پہنے کی طرف۔ جس نے سمجھا ایک ہو گیا۔

جس نے نہ سمجھا مٹ گیا۔

”نوائے شب“ اسی شاعر کا مجموعہ کلام ہے جو ایک لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا

ہے۔ جس نے تضاد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک نئے رنگ سخن کی داغ بیل ڈالی ہے۔

یہاں قومی مسائل کو وہ جس تخلیقی شان کے ساتھ سامنے لاتا ہے وہ نئی شاعری کے لیے

ایک کھلا راستہ ہے۔ ”میر و یہاں ان کی دو نظموں“ ”واری سنگی“ اور ”پہن گشتن“ کا حوالہ دوں گا جن

میں معاشرتی مسائل چپ وطن کے ساتھ مل کر ایک نئے استخراج کی طرف اشارہ کر رہے

ہیں۔ نظم ”واری سنگی“ میں آپ کو بھی سنا چاہتا ہوں تاکہ نئی شاعری کا نیا رنگ جس میں مانی

اور حال مل کر مستقبل کے سامنے نئے سوالوں کو جنم دے رہے ہیں آپ کے سامنے آجائے :

## دوستگی

یہ بس ایک میدان تھا جس میں سرشام ہم خوش نصیبوں کا ٹوٹا ہوا  
قافلہ آکے اُترا

کوئی جسم ایسا نہ تھا جس پر زخموں نے تحریر چھوڑی نہ ہو  
مگر پھر بھی ہر شخص خوش تھا کہ کھویا ہوا راستہ مل گیا ہے  
۔۔۔ ہمیں پر ہمارے قبیلے کے سردار نے یہ کہا تھا

یہ میدان تمہارا ہے

تم اس کے حق دار ہو

اس میں خیمے لگاؤ

کھلا آسمان اب تمہارا ہے

چسکتی ہوئی دھوپ کا اب تمہارے سوا کوئی مالک نہیں

تو وہ جی ٹاٹا قافلہ اپنے گھاؤ بچھا کرنے عزم سے بجل اٹھا تھا

مگر آج خیموں کے چاروں طرف کوہ آسا نصیبوں نے جب

دھوپ بھی روک دی ہے

ہواؤں کو بھی کوئی رس نہ نہیں ہے

تو میرا جواں ہوتا بیٹا عجیب طنز سے پوچھتا ہے

بتاؤ تو بابا

تمہارے قبیلے کے سردار نے کیا کہا تھا

پرتو رومی کی شاعری ماضی کے ٹٹماتے چراغ، احساس کے صحرا، شکست، خواب،

ماہی مسائل کے شعور اور حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی شاعری ہے جس نے ان کی

شاعری میں غم کی لے کو اس طور پر ختم دیا ہے کہ وہ ان کی شاعری میں بھلی کی رو کی طرح بہہ رہی ہے لیکن غم کی یہ لے ڈھادیے والی لے نہیں ہے بلکہ قلب میں نرمی اور گدافتگی پیدا کر کے شعر کو پُر اثر بنا دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا تخلیقی سفر اسی طرح جاری رہے گا اور وہ جدید شاعری پر اپنا گہرا نقش چھوڑیں گے جس کے سارے امکانات ان کی شاعری کے ان تینوں مجموعوں میں موجود ہیں اور یہ بات جیسا کہ آپ جانتے ہیں سب شاعروں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی :

دل کی اندھی دھڑکنوں کو کب ملے گی روشنی  
میرے نابینا خیالوں پر جلا کب کئے گی

(۳ مارچ ۱۹۸۸ء)



# راشد مفتی کی شاعری

سب سے پہلے تو میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جن معدودے چند شاعروں کی تخلیقیت سے مجھے گہری دلچسپی ہے ان میں راشد مفتی کا نام شامل ہے۔ آج کے سترہواں شمارہ سال پہلے سکھر کے ایک نوجوان شاعر کا کلام 'نیا دور' میں اشاعت کے لیے آیا۔ صاف ستھرا مسودہ خوش خط لکھا ہوا۔ سلیقے سے لکھا ہوا۔ میں نے کھولا اور پڑھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ راشد مفتی کا وہ کلام حجاب تک نیا دور میں شائع ہوا اس میں سے پانچ سات غزلیں ان کے اس پہلے مجموعہ کلام میں بھی شامل ہیں؛ واسوخت کی پہلی غزل بھی وہی ہے جو تیرہ ہجودہ سال پہلے نیا دور میں شائع ہوئی تھی اور جس میں راشد مفتی نے خود کو اردو غزل کی روایت سے وابستہ کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کا اظہار کیا تھا۔ شاعری راشد مفتی کے لیے وہ باطنی مجبوری ہے جس کا اظہار ضروری ہے۔ یہ احساس و شعور کا وہ قرض ہے جس کا ادا کرنا فرض ہے۔ اندھیل اور بہروں کے اس معاشرے میں آج کا دانشور آج کا شاعر اس لیے تنہا رہ گیا ہے کہ اس کی بات کوئی تو جیسے نہیں سنتا۔ اسی معاشرتی صورت حال کے پیش نظر راشد مفتی نے اپنے اس مجموعے کی پہلی غزل میں اپنی شاعری، اپنے لائحے عمل اور اپنے رویوں کا اعلان کر دیا ہے :

جو قرض مجھ پہ ہے وہ بوجھ آتا رہا ہوں  
کوئی نئے نہ نئے میں پکارتا جہاؤں  
نہ جہانے میرے تعاقب میں کون کون آئے  
میں اپنے نقش کتب پا اکھارتا جہاؤں

راشد مفتی کا زیر نظر مجموعہ کلام ”واسوخت“ قرض آمار نے اور وقت کی ریت پر اپنے نقش کعبہ پا  
 اُبھارنے کا تخلیقی عمل ہے۔ یہاں میں ایک سوال کپ کے سامنے اور اٹھانا چاہتا ہوں کہ آخر  
 راشد مفتی نے اپنے مجموعہ کلام کا نام ”واسوخت“ کیوں رکھا ہے۔ واسوخت تو ایک صفتِ سخن  
 ہے جس میں مشاعرے محبوب کی بے وفائیوں کے تنگ انگرے جلی ٹپٹی سنانا ہے اور اُسے چھوڑ  
 کر کسی اور سے دل لگانے کا اظہار کرتا ہے۔ اس اعتبار سے راشد مفتی نے ”واسوخت“ کی صفت  
 کو تو قیثاً استعمال نہیں کیا لیکن واسوخت کے مزاج کو اپنی غزل میں جذب کر کے اسے ایک  
 نیا رنگ دیا ہے۔ یہاں ان کا ایک محبوب معاشرتی شعور اور اجتماعی احساس ہے۔ یہی تخلیقی عمل  
 ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ سلیم احمد مرحوم نے اپنی غزل میں اُبھارا تھا۔ سلیم احمد کی غزل کے مزاج  
 پر ”بھو بھارنگ“ غالب تھا۔ یہ غزل کا ایک نیا لہجہ تھا جس کے امکانات سب سے پہلے  
 انشاء اللہ خان انشا کی غزل میں اُبھرے تھے اور جو آج تک اپنے امکانات کی بھکیں کے  
 لیے کسی بڑے شاعر کا مستطرب ہے۔ بہر حال راشد مفتی کی غزل کا لہجہ اسی لیے نیا ہے کہ انھوں نے  
 واسوخت کے مزاج کو غزل میں جذب کر کے اسے ایک نئی صورت دی ہے جس میں معاشرتی  
 مزاج اور روحِ عصر نے ایک نیا رنگ گھولا ہے۔ راشد مفتی کی شاعری اجتماعی مسائل  
 اور معاشرتی صورتِ حال سے وابستہ ہے اور اس کے ردِ عمل سے ان کا وہ لہجہ جنم لیتا  
 ہے جس میں شائستہ انداز میں جلی کٹی سنانے کا غم و غصہ والا لہجہ شامل ہے :

بھیلے ہیں اپنی جان پہ ہم نے وہ حادثے  
 دل مانتا نہیں کہ قیامت بھی آئے گی

خود کو کہتے ہیں جو فرزندِ زمیں

۲۹ - تمہ ڈالیں گے وہ کب مٹی میں

غزل کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غزل اپنے اسلوب و ہیئت کے لحاظ سے تو  
 بالکل نئی نہیں ہو سکتی اور نہ اس میں انفرادیت مکمل انقلابی انداز یا مسلسل روایت شکنی

سے پیدا کی جاسکتی ہے بلکہ اس میں ایک ایسا سلیقہ درکار ہے جس سے روح عصر کی ترجمانی کے ذریعے اسے اپنے عہد کا آئینہ بتایا جاسکتا ہے۔ راشد مفتی کی شاعری میں یہ سلیقہ ملتا ہے اسی لیے ان کی غزل میں انفرادیت کے خدو خال نمایاں ہیں۔ یہ چند شعر سنئیے :

اب تو سارے مجھے زمین سے ہیں  
آگے شاکی تھے آسمان سے لوگ

نکل کے جاذب کا جب کسی طرف کو میں  
تو پردہ کے چیر گیا دشمنوں کی صف کو میں

یہی کہ قید ہوئے اپنی اپنی خلوت میں  
نہیں کہو کہ ہمیں کیا ملا محبت میں

راشد مفتی کی شاعری میں بعض اہم واقعات سے اشارے بھی ملتے ہیں جن میں جذبے کی خدمت نمایاں ہے لیکن انھوں نے اپنی شاعری میں روزمرہ زندگی، علمی تجربات اور معاشرتی صورت حال کو بیان کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری انفرادی سچائی اور واقعیت کا روپ دھالتی ہے مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

مگر میں کون سا سکھ ہے راشد  
دل گرفتہ جو میں دفتر میں رہوں

درو دیوار پہ تحریر نظر آتی ہے  
اطلاعات جو اخبار نہیں دے سکتا

جب بھی مقتل میں پیکارا جاؤں

گھر کی دلہیز پہ مارا جاؤں

ہر شاعر اپنے معامروں کے اثرات قبول بھی کرتا ہے اور ان کو متاثر بھی کرتا ہے۔  
راشد مفتی کی شاعری میں اس عہد کے قابل ذکر شعراء کے اثرات گھلے ملے نظر آتے ہیں جن  
میں فیض، ناصر کاظمی، سلیم احمد اور میر نیازی کا ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن ان سب میں سلیم احمد کا  
اثر سب سے زیادہ ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر میں نے ابھی آپ کے سامنے  
کیا تھا کہ سلیم احمد نے بھی اپنی غزل کا نیا لہجہ ایجاد اور واسوخت کے مزاج کو غزل میں جذب  
کمر کے بنایا تھا اور یہی عمل راشد مفتی نے بھی کیا ہے۔ عجمی تجربات اور معاشرتی حوالے دونوں  
کی شاعری کا مزاج ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ اثر سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک شاعر دوسرے  
شاعر کی نقالی کر رہا ہے۔ اثر سے میری مراد یہ ہے کہ راشد مفتی نے سلیم احمد کے لہجے سے  
اپنا مخصوص لہجہ بنانے میں اثر قبول کیا ہے۔ ابھی سلیم احمد کی آواز فضا میں گونج رہی ہے۔  
اس آواز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آپ راشد مفتی کے یہ چند شعر سنئے:

بخشش میں ملی تھیں چند کھیاں

تاوان میں باغ دے رہا ہوں

اسی انہو سے نسبت رکھوں

اسی پارے ہوئے لشکر میں رہوں

اب تو دیوارِ گمرانی ہوگی

میرے قامت سے یہ در چھوٹا ہے

چاہتے ہیں جو مجھ سے قربانی

کبھی خود بھی کریں کوئی ایثار

بجلا ہوا کہ بہت دن یہ سلسلہ نہ رہا  
میں خود کو بھول چلا کھاتری محبت میں

یہ کوئی مقالہ نہیں جس میں تفصیل کے ساتھ میں راشد مفتی کی شاعری کا تجزیہ  
کروں۔ اس وقت تو اتنا ہی کافی ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ راشد مفتی اس دور کے قابل ذکر  
اور ممتاز شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے غزل میں اپنے مخصوص لہجے کو نمایاں کر کے اپنی  
حیثیت منوال ہے۔ اب ان کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہو گیا ہے اور اس کی اشاعت سے  
ان کی شہرت اور ان کے تخلیقی سفر کا ایک نیا باب شروع ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ اب دو اپنے  
دوسرے مجموعہ کلام کی بھی جلد بنیاد ڈالیں گے تاکہ وقت کی ریت پر اپنے نقش کف پا  
ابھارنے کا عمل جاری رہ سکے۔ آج کے نقار خانے میں طوطی کی صدا کوئی سننے نہ سنے  
لیکن اسے بلند رکھنا سب سے اہم کام ہے۔ راشد مفتی نے یہ اعلان اپنے مجموعے و اسوخت  
کے پہلے شعر میں ہی کر دیا ہے ع

کوئی مٹنے نہ سنے میں پکارتا جاؤں

۔ یہی اس دور کا المیہ ہے اور یہی مڑاں حق کا رویہ جو ناچا ہے۔

# صادق نسیم کی غزل

میں صادق نسیم صاحب کو ذاتی طور پر نہیں جانتا لیکن ان کی شاعری کے واسطے سے انھیں پہچانتا ہوں۔ شاعری اگر شخصیت کا اظہار ہے تو آپ شاعر کو ذاتی طور پر جاننے بغیر بھی بخوبی جان سکتے ہیں، اس کے باطن کی گہرائیوں میں جھانک سکتے ہیں اس کے مزاج کی تہ لے سکتے ہیں اور جب وہ آپ سے ملے تو یوں معلوم ہو کہ آپ تو اس شخص سے پوری طرح واقف ہیں۔ لیکن یہ عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب شاعر نے محض روایتی شاعری نہ کی ہو بلکہ زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں چلتے ہوئے جھکڑ کے تجربوں کو اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہو۔ صادق نسیم کی شاعری میں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کئی شاعری ہے اور اس میں حقیقی تجربوں نے زندگی کا رنگ و نور بھرا ہے۔ ان کے اشعار اسی لیے ہمارے دامن دل کو کھینچے ہیں۔

”ریگبو رواں“ کسی نو عمر پائے شاعر کا کلام نہیں۔ یہ ایک ایسے پختہ ذہن شاعر کا کلام ہے جو برسوں سے شعر کہہ رہا ہے، جس نے شعروادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، جسے زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اور حوالے تجربوں کو موزوں ترین لفظوں میں ڈھالنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ صادق نسیم غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی روایت بڑی ظالم چیز ہے۔ کوئی غزل گو شاعر اس سے دامن بچا کر نہیں گذر سکتا لیکن اگر وہ روایت کے چنگل میں پھنس گیا تو پھر انھیں باتوں کو دہرانے لگے گا جو اس سے بہتر طریقے پر پرانی نسل کے شعرا کہہ چکے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے لاتعداد شعراء ہیں جو مسلسل غزل کہہ رہے ہیں لیکن ان کی غزل سن کر پا پڑھ کر نہ صرف طبیعت مکتدہ ہو جاتی ہے بلکہ

غزل کے باسی پن سے کفن و کا فونکی ہو آتی ہے۔ ہر خلاف اس کے وہ غزل گو جو روایت کا شعور حاصل کر کے اُسے اپنے چاروں طرف کھلی ہوئی زندگی کے تجربات سے ہم کنار کر دیتے ہیں ان کی غزل کی جاذبیت سننے والوں کو پُر کیف کر دیتی ہے۔ صادق نسیم اسی قسم کے غزل گو ہیں۔ ریگ رواں کا مطالعہ کرتے ہوئے اسی لیے دو باتیں ہمیں خاص طور پر متاثر کرتی ہیں : ایک یہ کہ صادق نسیم کو غزل کی روایت کا گہرا شعور ہے اور وہ اس روایت میں بدلتی زندگی کے نئے طرز احساس کو شامل کر کے اُردو غزل کی روایت کا حقد بنانے کی قدرت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ اُن کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں شریک ہیں۔ اُردو غزل کی یہی وہ روایت ہے جسے غالب نے دوام بخشنا تھا۔ صادق نسیم کے ہاں دل کی بستی پوری گھاگھی کے ساتھ آباد ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ باہر کی دنیا سے بھی اس کا رشتہ قائم ہے۔ اسی لیے اُن کی غزل میں ایک انبساط، ایک سرخوشی اور کیف و نشاط کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں غم گھٹن بن کر نہیں چاہتا بلکہ نشتر بن کر ایک نیا حوصلہ دیتا ہے۔ یہاں غم درد تو ہے ہی لیکن ساتھ ساتھ دوا بھی ہے۔ تیرگی اُن کے ہاں مشعلیں جلاتی ہے اور درد میان کے فاصلے مٹا دیتا ہے۔ غم عشق اور غم زمانہ دونوں بیک وقت زندگی کا حصہ بن کر سامنے آتے ہیں اور ہمیشہ مجموعی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کی تنہائی میں اہل محفل شامل ہیں لیکن محفل میں تنہائی کا احساس بھی موجود ہے۔ زندگی کا یہی حقیقی تضاد ایک نئے آہنگ کے ساتھ ان کی شاعری میں ابھر رہا ہے اور اسی لیے اُن کی شاعری میں سکوت کی بجائے کلام، جمود کی بجائے حرکت اور قیام کے بجائے سفر کا احساس ابھرتا ہے۔ سفر صادق نسیم کی شاعری میں زندگی کا استعارہ ہے اور بار بار اُردو غزل کے خواجہ میر درد کی طرح اُن کی شاعری میں آ رہا ہے۔ ریگ رواں ابھی اسی سفر کا اشارہ ہے :

نہ جانے کیسے سفر کی ہے آرزو دل میں  
میں اپنے گھر میں ہوں صادق مسافروں کی طرح

تمام دن کی مسافت گھڑا رکھ ہر شب  
لگے جو آنکھ تو خوابوں میں بھی سفر دیکھوں

گرداب ہوں گردش مری تقدیر ہے صادق  
میں گھر میں بھی پوتا ہوں تو رہتا ہوں سفر میں

ہر قدم پر یہی ہوا محسوس \_\_\_\_\_ زندگی بھر سفر کیا جیسے

موج در موج سفر ہے پنا \_\_\_\_\_ اور تاحہ نظر دریا ہے

اسی سفر نے صادق نسیم کی شاعری میں توجہ کا کیفیت اور رنگارنگی پیدا کر کے ان کی شاعری کو یکہ نسبت کی اداسی اور ٹھکن سے بچا لیا ہے۔ اس احساس سفر نے ان کے تجزیوں کو وسعت دی ہے، ان کے احساس کو پھیلا دیا ہے، ان کے جذبات میں نئے نئے رنگ بھرے ہیں، ان کے شعور کو وہ حوصلہ دیا ہے جہاں ہر چھوٹی بڑی بات بامعنی نظر آنے لگتی ہے۔ ان کی غزل کی تازگی کا یہی راز ہے۔

صادق نسیم کے ان ایک ہفتہ اور بھی قابل توجہ ہے۔ وہ اپنے جذبہ و احساس کو خراجِ نظر سے ملا کر اس طور پر بیان کر دیتے ہیں کہ یہ منظر اس مخصوص احساس یا جذبے کا حصہ ہیں کہ اثر کا جادو جگمگا دیتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل ان کے اظہار کا اہم وسیلہ ہے:

ہر روز ڈھونڈتا ہوں تیری یاد کا اُفتخ  
میں آفتابِ شام کی صورت تھکا ہوا

وہ تو ہے تیرے سایہ مڑگاں میں خیمہ زن  
گو یا جہلو میں شام کے منظر سحر کا ہے

یہ خواب خواب سا منظر یہ کھولی کھولی نفا  
کہ جیسے کوئی فسانہ سُنا رہی ہو بُرا

رقصاں ہے غنچہ غنچہ رنگِ شاخ شاخ میں  
مینا میں جیسے موجِ صہبا دکھائی دے



صادق نسیم اپنے احساس و جذبہ کو خارجی منظر کے حوالے سے اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ یہ احساس و جذبہ پڑھنے یا سننے والے تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی وہ فنی غلبہ ہے جسے ٹی۔ ایس ایلیٹ "معروضی تلاذمات" کا نام دیتا ہے۔ ابلاغ صادق نسیم کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک باشعور شاعر ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔ ان کے معروض کی سجاوٹ، لفظوں کا انتخاب اور جملوں، بات کو پورے طور پر بیان کرنے کی کوشش نے ان کی شاعری میں وہ قوت پیدا کر دی ہے کہ وہ پُر اثر ہو گئی ہے۔ ان کے لہجے میں گھلاوٹ ہے اور خوش آہنگی بھی۔ ان کے اظہار میں رس ہے اور توانائی بھی اور ساتھ ساتھ وہ ایسا صاف ستھرا، واضح لہجہ ہے جسے ہم صادق نسیم کی شاعری سے واقف ہو کر آسانی سے پہچان سکتے ہیں اور یہی بات ہے کہ ہم اس دور کے بہت کم غزل گوؤں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، اسی لیے میں صادق نسیم کو جدید اردو غزل کا ممتاز شاعر اور "ریگ رداں" کو ایک قابلِ قدر مجموعہ سمجھتا ہوں۔

جیسے میرے اسلاف تھے ویسا تو نہیں میں

مجھ سا بھی نگر کوئی یہاں کون رہا ہے

صادق نسیم کی غزل میں اور بھی کئی باتیں قابلِ ذکر ہیں جنہیں ان کے اشعار کے حوالے سے واضح کیا جاسکتا ہے مثلاً ان کی غزل کے مزاج اور لہجے میں فرق گورکھپوری کی آواز بول رہی ہے جسے اپنا ناہما شاعر کے بس کا لوگ نہیں ہے۔ پھر انھوں نے روایتی علامتوں کے ذریعے نئے مضامین باندھے ہیں اور اپنے دور کے کرب کو بھی سمویا ہے۔

کیسے رہ سکتی ہی جنت کی فضائیں شفا

خاک آدا نے کوہیں لوگ وہاں بھی ہوں گے

جس شخص کو بھی دیکھیے طالبِ نثر کا ہے

ایسا ہی کوئی ہے کہ جسے غم شہر کا ہے

تھا تیر ہی کا دور غنیمت کہ اُن دنوں  
دستار ہی کا ڈر تھا مگر اب تو سر کا ہے

یادہ گھرے احساس کو سامنے کے لفظوں میں یوں آسان سے بیان کر دیتے ہیں:

دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

دیکھتے دیکھتے ہر اک چہرہ تیرے چہرے میں بدل جاتا ہے

جب بھی تری قوت کے کچھ امکاں نظر آئے

ہم خوش ہوئے اتنے کہ پریشاں نظر آئے

یہ اور کئی ایسی باتوں کا اور بھی ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن میں تو اُن کی شاعری کو آپ سے

صرف متعارف کر رہا ہوں اسی لیے میں نے یہاں صرف چند بنیادی باتوں کی طرف

اشارہ کر دیا ہے اور اسی لیے میں نے اُن کے اچھے اشعار کا انتخاب بھی یہاں جان بوجھ کر

نہیں کیا ہے۔

(۵ ارجنودھی ۱۹۷۹ء)

# افسردہ پوری کی غزل

میں نے افسردہ پوری کو پہلی بار ڈھاکہ میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہوگی۔ یہی وضع قطع تھی جو آج ہے۔ فرق اتنا تھا کہ پہلے وہ بہت چاق و چمند تھے اب قدرے کم ہیں۔ ادب کے رمیا اس وقت بھی تھے اور آج اس سے بھی زیادہ ہیں۔ پہلے ہوئے مخالف میں چراغ جلاتے تھے اور اب ہوئے موافق میں دل جلاتے ہیں۔ چلنے اور جھلنے کا مشغلہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ یہی شاید ادیب اشاعر اور دانشور کا مقدر ہے۔ اُن سے علیے تو ان کے غلوں کی خوشبو اور فکر و فن کی چاندنی دل کو موہ لیتی ہے۔ بے نیازی میں سلیقہ اور نیاز مندی میں رکھ رکھاؤ ایسا کہ جو سنے گرویدہ ہو جائے۔ ادب اور اختیار میں شاید اشد واسطے کاہر ہے۔ صاحب اختیار کہی نہیں تھے لیکن صاحب ادب پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ یہی ان کی شناخت اور یہی ان کا امتیاز ہے۔ میں نے ان کے مضامین بھی پڑھے ہیں اور شاعری بھی۔ اپنے مضامین میں انھوں نے مشرقی پاکستان کی تہذیبی روح کو اُردو کلموں میں منتقل کیا۔ قاضی نذر الاسلام کی ۲۵ اسلامی نظموں کے منظوم تراجم کیے۔ اُردو ادب کو ہنگالی ادب سے اور ہنگالی ادب کو اُردو ادب سے روشناس کرایا۔ یہ عمل بغیر سیاست کے انصاف کے ساتھ اگر معاشرتی و معاشی سطح پر جاری رہتا تو آج بھی دونوں ایک ہوتے۔ نا انصافیاں شب و صبح کو شام فصل میں بدل رہی ہیں۔ یہ سبق ہم نے اُس وقت سیکھا تھا اور بد آج اُسے سیکھ رہے ہیں۔ تاریخ ہمارا علم رہا ہے۔ دُنیا زمانے نے ہم سے سیکھا تھا لیکن ہم گزشتہ کئی سو سال سے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے۔ روشنی ہو جائے تو اللہ کی دین ہے۔ اندھیرا چھا جائے تو رخصت ہو جاتی ہے۔

نہ کچھ کرتے ہیں۔ نہ کرنے دیتے ہیں۔ یہی ہمارا حال ہے۔ ماضی کبھی شاندار تھا۔ مستقبل اللہ بہتر کرے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں پوتوں پھلیں اور سدا آباد رہیں۔

جناب افسر ماہ پوری شاعر بھی ہیں اور نقاد و افسانہ نگار بھی۔ ادب ان کا مقصد حیات ہے۔ ساری عمر ہی میں لگے رہے اور ساری عمر اسی میں لگادی۔ ہماری نسل کا یہ دستور تھا کہ ساری عمر تخلیق ادب کے کام میں لگی رہتی تھی۔ شہرت برسوں کے ریاضے کے بعد آہستہ آہستہ پھلتی تھی۔ شہرت کام سے تھی۔ کام پہلے مشہور ہوتا تھا اور نام کی باری اس کے بعد آتی تھی۔ آج صورت حال ذرا دوسری ہے۔ کام کچھ اور نام آگے۔ اسی لیے کام کوئی نہیں کرتا نام کو شب و روز مانجھتے رہتے ہیں۔ چلت پھرت، رشتے ناتے، دی، ریڈیو، اخبار، جلسے یہی تخلیق ادب کا راستہ ہیں اور یہی منزل۔ کسی سے ملیے اخباراتی دی کی بات کرے گا۔ کتاب کی بات اب کوئی نہیں کرتا۔ کون سی نئی کتاب آئی۔ کون سی آنے والی ہے۔ اب شاید یہ ہمارا مسئلہ ہی نہیں رہا۔ ماشا باحارہ گیا ہے۔ یہ ماشاء اللہ خوب بچ رہا ہے۔

جناب افسر ماہ پوری نے آج سے چالیس ہیالیس سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور اب ۱۹۸۶ء کے اواخر میں ان کی پہلی کتاب یعنی شاعری کا پہلا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ یہ کام اگر پہلے ہو جاتا تو اچھا ہوتا لیکن دیر آید درست آید کے مصداق آج بھی غنیمت ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ”خباہ ماہ“ پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ مجھ سادینے والی گرمی میں تازہ ہوا کے جھونکے نے تازہ دم کر دیا ہے۔ سلیقے سے جڑے ہوئے الفاظ اور ان میں احساس و جذبات کی خوشبو بہت سے شعروں میں اتر گئے۔ چند شعر آپ بھی سن لیجیے :

ہمیں کبھی تو نظر آئے گا ترا چہرہ  
اسی خیال سے پتھر کو صاف کرتے ہیں

اسیرانِ قفس کو کیا خبر ہوگی بہاراں کی  
نسیم صبح اب گلشن میں ہی مشکل سے آتی ہے

ہم تو دنیا بھی کر کے خطاوار ہی رہے  
تم خود بتاؤ کوئی طریقہ نجات کا

پھیلی ہوئی ہے بزم میں ایسی بھی داستاں  
ہم نے ابھی کہی نہیں، تم نے ابھی سنی نہیں

ان اشعار میں روحِ عصر بھی ہے۔ وہ روحِ عصر جس میں آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے اور وہ سلیقہٴ اظہار بھی جس میں لہجے کا دھیمپنا سادگی بن کر دل میں اتر جاتا ہے۔ نہ وہ شدتِ غلو کہ جذبات کے پر نالے پہنچ گئیں اور نہ وہ اختلاطِ جذبات کہ اظہار الجحہ کر رہ جائے اور شاعر کی بات قاری تک نہ پہنچے مان کے اشعار میں جذبہٴ آمیزہ کی طرح شفاف اور احساسِ چاندنی کی طرح دل فریب ہے۔ اسی تخلیقی عمل سے ان کا لہجہ بنتا ہے جو شعر کو پُر اثر بنا دیتا ہے :

یار آتے ہیں کبھی وہ تو پتا چلتا ہے

بیت جاتے ہیں گھڑی بھر میں زمانے کتنے

دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبت کے دیئے

کتنے انساں نے بجھائے ہیں، ہولنے کتنے

میں افسرِ ماہِ پوری کی شاعری کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ تو وہ ہیں جو آپ پہلے ہی سن چکے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ”غبارِ ماہ“ میں آپ پڑھ چکے ہیں اس لیے ان کو دہرانے کا جُرم میں نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ ایک بات یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس مجموعہٴ کلام کو خود بھی پڑھیے آپ کی داستانِ حیات اس میں رُخ کی گئی ہے۔ وہ داستانِ حیات

جو آپ کی طرف سے لیکن ہم سب کا مشترک ورثہ ہے اور اس کے داستان گو حضرت  
افسر ماہ پوری ہیں :

دیکھ کے مجھ کو یہ اندازہ لگا لو افسر  
رج کتنا ہے زمانے میں خوشی ہے کتنی

(۴ جون ۱۹۸۷ء)

# جمیل عظیم آبادی کی غزل

کتاب کی تعارفی تقریب کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ حاضرین کے دل میں نئی کتاب پڑھنے کا جذبہ بیدار کیا جائے اور مصنف کی آئنی حوصلہ افزائی مزور کی جانے کہ وہ اس دور پر پڑے آشوب میں نکلنے پڑھنے کے کام کو جاری رکھ سکے، ایک ایسے معاشرے میں، جو زور پرستی کی وہابی بیماری میں خمد سے مبتلا ہے اور ذہنی و تخلیقی سطح پر ایک حق و حق صحرا بن کر رہ گیا ہے پوری آواز سے اذان دینا کارِ ثواب بھی ہے اور تقاضائے وقت بھی۔ کتاب کی تعارفی تقریب دراصل اندھوں اور بہروں کی بستی میں زور زور سے بولنے کی ایک ایسی کوشش ہے تاکہ بات ان تک بھی پہنچ جائے جو دیکھنے سے گریز اور سننے سے احتراز کر رہے ہیں۔ اسی لیے جمیل عظیم آبادی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وقت کی تیز آنڈھیوں میں تخلیق کا دیار روشن رکھا اور شاعری سے نہ صرف اپنا تزکیہ نفس کیا بلکہ معاشرے کے جذبات و احساسات کی بھی ترجمانی کی، جمیل عظیم آبادی کا کلام پڑھتے ہوئے اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرے دل کی بات اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے ان کے شعر دل پر اثر کرتے ہیں۔ وہ ایک دل درد مند رکھتے ہیں۔ انھیں اپنی ذات سے پیار ہے لیکن اس سے زیادہ ان لوگوں سے پیار ہے جو ان کے ارد گرد چل پھر رہے ہیں۔ جن کی زندگی مسائل کا شکار ہوتے ہوئے بھی ایک جہت رکھتی ہے۔ وہ پیارے لوگ جو آفت زدگی میں بھی اپنے عقائد اور اپنے وطن کا پرچم بلند رکھتے ہیں۔ جن کی زبانیں بند ہیں لیکن جو آنکھ سے وہ سب کچھ کہہ رہے ہیں جو زبان سے کہا جاتا ہے یہی وہ لوگ ہیں، جو جمیل عظیم آبادی کے منقلب ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنی بات ایسے صاف سُفھے ساواہ

اور واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ ان کی بات آسانی سے ابلاغ کرتی ہے۔ یہی ان کا فن ہے اور اسی میں ان کی شاعری کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

جمیل عظیم آبادی کی شاعری کا تعلق براہ راست زندگی سے قائم ہے۔ وہ اسی زندگی سے جسے وہ بسر کر رہے ہیں، تجربوں کے جگنو شاعری کے رومال میں پٹتے ہیں اور پھر ان سے خفا کو روشن کر دیتے ہیں۔ زندہ تجربوں کے یہی جگنو ان کی شاعری کو شبنم عطا کرتے ہیں۔ انھیں کو روشن کرتے ہیں اور لہجے کو بھوار کی سی نرمی عطا کرتے ہیں۔ جمیل عظیم آبادی سچائی کے شاعر ہیں۔ وہ سچائی جس کی قسم تو سب کھلتے ہیں لیکن بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اسی لیے ہمیں ایک جہت ملتی ہے۔ وہ جہت جو منزل کا راستہ دکھاتی ہے۔ جذبہ و احساس کو نکھارتی ہے اور انسان کو کُنڈن بنانے میں مدد کرتی ہے۔ جمیل عظیم آبادی کی شاعری میں ہمیں وہ معاشرتی شعور بھی ملتا ہے جس سے شاعری بامعنی ہو جاتی ہے اور تخلیق بے مقصدیت سے نکلا کر جذبول کی تظہیر اور تہذیب کا کام انجام دیتی ہے۔

دوہری ہجرت کا آشوب جمیل عظیم آبادی کی شاعری کی روح میں رنگ کی مانند گھٹا ہوا ہے۔ یہ تجربہ ان کا انفرادی تجربہ ہی ہے اور اجتماعی تجربہ بھی۔ ایسا تجربہ جس کا گہرا اثر ان کی شاعری میں موجود ہے۔

غریب شہریوں، یارب کہیں امان تو دے  
جو دی ہے دھوپ تو پھر سر پہ ساتھان تو دے

راس آئی نہ فصل بہاراں ہمیں  
تم وہاں کھو گئے، میں یہاں کھو گیا

سب کچھ لٹا کے راہ و فامیں ہیں مطمئن  
ہم اہلو دل کا جذبہ ایثار دیکھنا



ہنستا ہوا یہ شہر سرشام سو گیا  
سیلِ بلا کے ہوں نہ یہ آثار دیکھنا

صحرائے خار و خس کو بھی ایک زندگی ملی  
جب رنگ و بو کے قافلے گلزار سے چلے

دوہری ہجرت کا یہ تجربہ جیلِ عظیم آبادی کی مشاعری کا بنیادی تجربہ ہے اور اسی  
لیے "دل کی کتاب" پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی ہے۔

(۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

## غنی دہلوی کی غزل

آج ہم جس کتاب کی تقریبِ رونمائی میں جمع ہوئے ہیں، وہ ایک ایسے شاعر کا مجموعہٴ کلام ہے جس نے اپنی ساری عمر ادب و شعر کی خدمت میں بسر کی ہے۔ جناب غنی دہلوی ہم میں سے اکثر سے عمر میں بڑے ہیں۔ بعض تو ان سے اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کی شعر گوئی کی عمر بھی ان سے بڑی ہے۔ جناب غنی دہلوی نے شاعری کو ایک ایسی سنجیدہ تخلیقی سرگرمی کے طور پر اپنایا ہے کہ اپنی ساری عمر اس کے فروغ کے لیے وقف کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قادر الکلام پرگو شاعر ہیں۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیں بھی کہی ہیں اور رباعیاں بھی انگیت بھی کہے ہیں اور وہ بے بھی نیکن ان کا کلام ابھی تک شائع ہو کر لوگوں تک نہیں پہنچا۔ یہ ان کا پہلا مجموعہٴ کلام ہے جو ”شاخساز کے نام سے شائع ہوا ہے اور اس میں بھی وہ ساری غزلیں شامل نہیں ہیں جو وہ کہہ چکے ہیں۔ وہ دولت مند آدمی نہیں ہیں اور ہمارے معاشرے کو زبردستی کی دوڑ میں اتنی فرصت نہیں کہ وہ اپنے شاعروں کا خیال کرے، ان کی حوصلہ افزائی کرے، ان کی سرپرستی کرے اور ان کے کلام کو منظرِ عام پر لائے تاکہ معاشرہ اپنی دھڑکنوں کی صدا سن سکے۔ ہمارے معاشرے میں جو گفتگو ہے، مسموم فضا سے جو درجہ گیا ہے، سکونی اور بے مینی کی کیفیت میں جو وہ مبتلا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ معاشرے نے شعرے نطف لینے اور اپنے دل کی کیفیات و جذبات کو شعر کی زبان میں سننے کا عمل بند کر دیا ہے۔ اب سے دس سال پہلے تک گھر گھر مشاعرے ہوتے تھے، شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور جو کچھ معاشرے میں ہوتا تھا اس کے تاثرات کو شعر کی زبان میں سن کر ہم اپنی بے لطفی کے کینی در بے مینی کے جذبات کو غسل دے لیتے تھے اور پھول کی طرح ہلکے ہو کر اپنا اثر کر لیتے

تھے۔ یہ میرا تجربہ ہے اور آپ بھی یہ تجربہ کر کے دیکھئے کہ جو کچھ آپ کے چاروں طرف ہوتا ہے یا پورا ہے شاعر اس کیفیت کو اپنے شعر میں اس طور پر سمجھ دیتا ہے کہ اس میں تاثیر کارنگ جاگ اٹھتا ہے۔ آج بھی کسی مشاعرے میں جائیے تو لوگ ان اشعار پر داد دیں گے جن میں معاشرے میں چلنے والی ہواؤں کا جاہر و جاگ رہا ہے۔ آپ ماسٹین کی داد سے کسلی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج معاشرہ کیا سوچ رہا ہے، اس کے دل میں کن چیزوں نے گھر کر رکھا ہے اور اب آنے والے زمانوں میں ہوا کیا رخ اختیار کرے گی۔

وہ معاشرے برف کی طرح ٹھنڈے اور منجمد ہونے لگتے ہیں، جو شعر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، جن کی زندگی پر شاعری اثر انداز ہونا بند ہو جاتی ہے۔ آپ شعر سنئے، شعر پڑھیے، محفل شعر و سخن منعقد کیجیے شاعروں کو اہمیت دیجیے، ان کی سرپرستی کیجیے تو آپ خود اس تبدیلی کو محسوس کریں گے جو نتیجے کے طور پر ظہور میں آئے گی۔ یہ سفاکی، یہ سہمیت، یہ درندگی جو اس وقت ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے جذبات میں بھرے ہوئے ہیں اور تزکیہ جذبات کا عمل، جو شعر کے ذریعے یا دوسرے فنون لطیفہ کے ذریعے ہوتا ہے، بند ہو گیا ہے۔

ہماری صحت مند زندگی کے لیے شعر ویسا ہی ضروری ہے جیسے صاف ہوا جسم انسانی کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ حضرت غنی دہلوی نے ایسے ہی شعر کہہ کر ہمارے جذبات کی تطہیر اور تزکیہ کا بندوبست کیا ہے۔ آپ ان کچے شعر سنئے یا پڑھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ ہمارے دل کی بات اپنی صاف ستھری، کوثر و نسیم سے زحل زبان میں اس طور پر کہہ رہے ہیں کہ ان کے شعر ہماری زبان پر چڑھ کر ہمارے جذبات اور ہماری دلی کیفیات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ آپ اس مجموعہ کلام کو کہیں سے پڑھ لیجیے غنی دہلوی آپ کے دل سے دل کی بات کرتے سنائی دیں گے۔ یہ کہہ کر جب میں ان کا مجموعہ کلام کھولتا ہوں تو یہ شعر سامنے آتے ہیں۔ دیکھیں یہ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں:

رفتہ رفتہ لٹ گیا شمع فروزاں کا سہاگ

صرف پروازوں کے دم تک تھی بہارِ انجمن

دیکھیے یہ ہاتھ کس کا ہے گلوں کے شوق میں

رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے جانبِ شارعِ چین

لے غنی اب تم کرو صحرائیں کی تلاش

ایسے لوگوں سے ملو جن کا نہ ہو کوئی دہن

ان اشعار میں رموز و کنایات وہی ہیں جو اردو غزل میں عام طور پر استعمال ہوتے۔

رہے ہیں۔ لیکن غنی دہلوی کے ہاں یہ کنائے ہمارے دور کا اشارہ ہیں کہ ہمارے دلوں کی ترجمانی کر رہے ہیں پختہ کلام، موزوں لفظوں کے موتی شاعری کی مانگ میں سلیقے جڑے ہوئے۔ یہ غنی دہلوی کا کلام ہے۔

غنی دہلوی نے ہجرت کا دکھ اٹھایا ہے ۱۹۳۷ء میں اپنے سارے خاندان کے افراد کے ہمراہ قتل کے سانحے سے دوچار ہوئے۔ میں۔ اگر وہ شاعری نہ کرتے تو یقیناً پاگل ہوجاتے یا کلہو پھاڑ کر مر جاتے۔ انھوں نے یہ پہاڑ جیساظم اور اس کے حمزوں کی سفاکی کو شاعری کے وسیلے ہی سے برداشت کیا ہے۔ ان کی شاعری میں تجربے کے بے شمار پہلو سامنے آکر ان کے دل کی اور ہمارے جذبات کی تصویر بن گئے ہیں:

اس شہر جنوں میں کس کس کو مفہوم خود بچھاؤ گے

ہر شخص یہاں دلوانا ہے زنجیر کسے پہناؤ گے

وہ ایک شعر اور سننے چلیے :

جو ترے غم کے کل تک تھے دشت و جبل

وہ مرے گھر کے دیوار و در ہو گئے

مخصوص یہ ہوتا ہے رو شام و سحر میں

میں ٹھہر گیا ہوں مری منزل ہے سفر میں

وہ ایک سانس جسے میں نے زندگی سمجھا

وہ ایک سانس بھی سینہ نگار گزری ہے

حرم ہو، شہر نگاراں ہو، میکہ کہ چین

کہاں کہاں سے تری رہ گزار گزری ہے

غزل کا بچہ، غزل کا چھب کرتے بدل گیا ہے لیکن غزل کا قدیم لہجہ آج بھی لطافت دیتا ہے "دور ہوا" سے "ہوں میں" آتا ہے، غرضی دہلوی اس لہجے کے محافظ اسی انداز کے دائی اور اسی چھب کے شہدائی ہیں۔ مجھے "دور ہے" وہ جلد از جلد اپنے بقیہ کلام کو بھی اشاعت سے ہم کنار کر دیں گے "دور" میں "دور" میں "دور" میں معلوم نہیں سیلاب بنا پھر کہاں جائے اڑے کس طرح جائے۔

## صابر ظفر کی غزل

کتابوں کی رونمائی ویسے تو اب ایک عام سی بات ہو گئی ہے لیکن اچھی کتاب جب بھی رونما ہوتی ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ قوم کی ذہنی و فکری دنیا میں ایک اہم واقعہ کی نوید ہوتی ہے۔ اس نوید میں کوئی سنسنی تو ہرگز نہیں ہوتی لیکن اچھی کتاب اپنے سے پہلے کبھی جاننے والی کتابوں کی موجودہ ترتیب کو بدل کر خود اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ دھواں اور پھول صابر ظفر کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں چار پانچ شعری ۸۸ غزلیں اور ۱۶ متفرق اشعار شامل ہیں لیکن شاعری کے اعتبار سے یہ ایک ایسا مجموعہ ہے کہ بہت جلد دورِ حاضر میں موجود مجموعہ نئے کلام میں اپنا مقام پیدا کر لے گا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ اس دور میں جب شعری مجموعے کثرت سے شائع ہو رہے ہیں، بہت کم مجموعے ایسے ہیں جو شاعری، اشعار، لہجہ اور احساس کی لطافت و تازگی کے اعتبار سے صابر ظفر کے اس مجموعے کو پہنچے ہیں۔ اس مجموعے کو پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ کچھ دیوی تو صابر ظفر پر مہربان نہیں ہے لیکن سرسوتی صابر ظفر پر یقیناً مہربان ہے اور اس وقت سے مہربان ہے جب ۱۹۶۷ء میں صابر ظفر نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا مجھے یاد ہے کہ نیا دور کی ڈاک میں جب بھی کسی معروف لکھنے والے کی کوئی تحریر آتی تو میں اسے الگ کر لیتا اور جلدی سے پڑھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کر لیتا لیکن غیر معروف اور نئے لکھنے والوں کی چیزیں ایک فائل میں رکھ دیتا کہ پہلی فرصت میں انہیں توجہ سے پڑھوں گا۔ پھر یہ پہلی فرصت اتنی دیر سے میسر آتی کہ اکثر نئے لکھنے والوں کی تحریریں ہامی ہو جاتیں۔ ایک دن میں ایسے ہی لکھنے والوں کا کلام دیکھ کر اتنا کہ سینکڑوں غزلوں کے انبار میں ایک غزل سامنے آئی۔ شاعر کا نام صابر

ظفر والی "فقار" یہ نام میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا اور پھر صابر کے ساتھ ظفر والی کی ترکیب کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے مدبرانہ دیانت کے پیش نظر پوری غزل پڑھی اور غزل پڑھ کر روح تازہ ہو گئی۔ مطلع تھا:

حد سے کوئی شخص اگر بڑھا ہے  
ماحول نے قید کر لیا ہے

میں نے غزل پڑھی اور اسے نیا دور کے لیے منتخب کر لیا جو نیا دور کے شمارہ ۵۵/۵۶ میں شائع ہو گئی۔ اس کے بعد صابر ظفر والی نے اور غزلیں بھی بھیجیں جو نیا دور میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی ہیں لیکن میں نے ان کے نام میں ان کی اجازت کے بغیر اور اپنی پسند کے عین مطابق بہ ترمیم و تفسیح کر دی کہ ان کے نام سے والی کا لفظ نکال دیا اور صرت صابر ظفر شاعر کا نام رکھ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام خود شاعر کو بھی پسند آیا اور اس نے اسے صرت قبول کر لیا بلکہ صابر مخلص کے بجائے ظفر مخلص اختیار کر لیا۔ اس طرح صابر ظفر والی صابر ظفر بن گئے اور "دھواں اور بھول" میں اب ہر قطع میں انہوں نے ظفر مخلص ہی استعمال کیا ہے۔

صابر کو میں اُسی وقت سے جانتا ہوں۔ میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہوں جس کی انگ داستان ہے جو میں اس وقت لکھوں گا جب صابر ظفر اردو زبان کا ممتاز ترین شاعر بن چکے گا۔ اس نے اب تک جو سفر کیا ہے وہ صرت خدا و شاعرانہ جوہر کی سواری پر کیا ہے۔ اس کے پاس مذہب و ملت ہے۔ نہ گھر در ہے کہ کسی کو بلائے۔ نہ سماجی مرتبہ ہے۔ نہ تعلقات عامہ کی گاڑی ہے۔ بس نے دے کر شاعری ہی اس کی زندگی ہے۔ یہی اس کی پُرکھی ہے۔ لیکن اس دور میں جب پیسہ خدا بن گیا ہے، شاعر یا شاعری کو کون پوچھتا ہے؟ پھر صابر ظفر کلوکار شاعر بھی نہیں ہے کہ مشاعروں سے پیٹ کو روٹی فراہم کر سکے۔ اس صورت حال میں جب وہ ۳۶ سال کا ہو گیا ہے۔ دس بچوں کا باپ ہے۔ ۳ فٹ ہو گئے ہیں اور ۶ ماشاء اللہ بقیہ حیات ہیں۔ اس پر کیا گندمی ہوگی اور وہ کس طرح اپنے شب و روز بسر کرتا ہوگا آج تک اس سفاک معاشرے نے کبھی نہیں سوچا اور

اس سفاک معاشرے میں حسن اتفاق سے آپ بھی شامل ہیں اور میں بھی۔

برہنگی کا یہ درماں ہے تیرگی میں نہیں

چسپاں ہو تو جلائیں ، لباس ہو تو نہیں

اپنے ہونہار سپوتوں کو یہ معاشرہ بھی دیتا ہے اور شاید یہی دے سکتا ہے۔ صابر ظفر  
کے یہ چار شعر صنیعے اور دیکھجے کہ ان میں ذات اور زمانے کا کرب کتنی تازگی اور کتنی شدت  
کے ساتھ ہم سے کس مغز دلچے میں مخاطب ہے۔

جا بیٹے اب تو اے خدا، اور ہی مہرباں مجھے

غیر تو خیر غیر ہیں بھول گئی بے ماں مجھے

بے فہری یہاں خمر بے ہنری یہاں ہنر

تو نے بے این شعور میں بھیج دیا کہاں مجھے

اس نے مرے نصیب میں لکھ دیا خشک زکارب

بخش کے شہر اشک میں قطعہ جاں مجھے

دھبہ میں اس کا روپ تریا دہنیں رہا مگر

ابر کی ٹکڑیاں خلف رنگتی تھیں چھتیاں مجھے

اس موقع پر میں، جو صابر ظفر کی شاعری کو پسند کرتا ہوں، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں

کہ آپ بھی اس شاعر کے کلام کو ذرا توجہ سے پڑھیے اور دیکھجے کہ وہ کس سلیقے سے شاعری کر رہا

ہے اور کس سادہ سی زبان میں کیسے مغز دلچے کو جنم دے رہا ہے۔ میں کج کی محفل میں اس کی

شاعرانہ خصوصیات اور اس کی انفرادیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کی شاعری کی

طرت آپ سب کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

آتش کو کبر نکلتی ہی نہ تھی دل سے ظفر

جو بد منبر کو جلا یا تو یہ کافر نکلی

گزارتا ہوں جو شبِ عشق بے معاش کے ساتھ

تو صبح اشک مرے ناشتے پہ گرتے ہیں



## ”بے جواز“ کے حوالے سے

ہر تقریب میں صدر جلسہ کے ساتھ شکل یہ اپڑتی ہے کہ کتاب اور صاحب کتب کے بارے میں جو کچھ کہا جاسکتا تھا وہ کہا جا چکا ہوتا ہے اور صدر جلسہ کو رسم صدارت کی لائق رکھنے کے لیے اس بات سے بے نیاز ہو کر لوگ کتنی توجہ سے سُن رہے ہیں یا نہیں سُن رہے ہیں، حکمران صدر بہر طور ادا کرنے پڑتے ہیں۔ میں بھی فی الحال رسم ہو شراب کی اسی منزل میں ہوں۔ اس لمحہ موجود میں آپ اور میں یعنی ہم دونوں مجبور ہیں۔ یہاں میں ”جبر کے ساتھ“ استحصاٰل کاللفظ عدا اس لیے مستغاث نہیں کر رہا ہوں کہ صدیوں سے ہمیں کے عادی ہو چکے ہیں کہ اس کے بغیر نہ عوام بے چارے پر سکون زندگی گزار سکتے ہیں اور نہ خواص چین کی نیند سو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظام حیات خوش اسلوبی سے چل رہا ہے بارش ہو جاتی ہے تو فصلیں تیار ہو جاتی ہیں اور بارش نہیں ہوتی تو فصلیں سوکھ جاتی ہیں اور خدا بھلا کرے ترقی یافتہ ممالک کا کہ ہم حسب ضرورت الملج در آمدہ کر لیتے ہیں اور زندگی اسی طرح کہ جیسی تھی، آرام سے گذر جاتی ہے۔ اس عمل سے شاعر اور اس کے مقرر کی تردید بھی ہو جاتی ہے جس نے کہا تھا : ۛ

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں

آرام خواص کے حصے میں آتا ہے اور جہانِ خراب عوام کے حصے میں اور عوام میں ہمارے ملک کے دانشور، ادیب، مفکر اور شاعر سب ہی شامل ہیں اور اسی مثال توازن کی وجہ سے ہمارا معاشرہ اور اس کے آسیب، شاید یعنی کے طور پر گواہی دیں گے کہ کھڑاؤں سے پاک کتنے آرام کے سفر حیات طے کر رہا ہے۔ اس آرام میں نہ سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے

اور نہ مسئلے مسائل پر غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذرا پرستی جیسا کہ ہمارے ہاں حل ہو رہے ہیں سارے مسائل خود حل کر دیتی ہے۔ یہی منزل ہے اور یہی مقصد حیات ہے شعر و شاعری، ادب و فلسفہ، تفکر و تدبیر، علوم و فنون کا رہے کاراں ہیں جس کے معنی وہ اخراجا ہیں جن سے نہ کار خریدی جاسکتی ہے اور نہ پیٹ پالا جاسکتا ہے۔ ہمارے معاشرے نے یہ بات برسوں ہوئے طے کر دی تھی اور ایسے طے کر دی تھی گویا اب یہ ہمارا مقدر ہے۔ ایسے میں جب ادب و شعر کی یا فلسفہ و فکر کی کوئی کتاب چھپ کر منظر عام پر آتی ہے تو ہمیں اس ادیب یا شاعر، فلسفی یا مفکر کو صدقہ دل سے داد و بیاد دینا ہوں جس نے اس دور و نا پیر ماں میں یہ کار بے کاراں کیا ہے اور ادب و فن کو سرخرو کیا ہے۔ اسی وجہ سے آج میں اس بھری محفل میں حضرت حامد سروسش کو ولی مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس ذرا پرست معاشرے میں ذرا پرستی پر ثقت کیج کر شاعری کی دیوی کو تازہ پھولوں کے گجرے پہنائے ہیں اور وہ دعائیں بھی کی ہیں۔ ایک یہ :

لڑے سکوت قصہ مہر و وفا چلے  
دم گھٹ رہا ہے دوستوں ٹھنڈی ہوا چلے

اور دوسری یہ :

کب سے ہیں جاننا زبہ اس انتظار میں  
مقبول ہوں دعائیں تو سمجھ رہے او اکرم

۔ یہی وہ دعائیں اور آرزوئیں ہیں جن کے خواب شاعر و دیکھتا ہے تاکہ دھوپ کی ٹھنک دینے والی گرمی سے نہایت ملے۔ اسی لیے دھوپ اور سایہ وہ دو بنیادی اشارے ہیں جن کے خوالے سے حامد سروسش نے اپنے کرب، اپنے دکھوں اور نا انصافیوں کی داستان سنائی ہے۔ آگ اور پیڑ کی علامتیں بھی یہی تخلیقی عمل کرتی ہیں۔ آگ دھوپ ہے اور سایہ پیڑ ہے۔ سایہ اردو شاعری کی روایت کا حصہ ہے لیکن اس روایت میں حامد سروسش نے یہ تبدیلی کی کہ اسے دیوار کے سائے سے ہٹا کر پیڑ کے سائے میں لاکھڑا کیا۔ اب وہ میری طرح :

ظہر ہو گا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر

یا شہرت بخاری کی طرح :

ظہر سورج کا اثر سایہ دلدار کرے ہے

نہیں کہتے بلکہ خواجہ حیدر علی آتش کے شجر سایہ دار کی روایت کو ملا کر ایک کر دیتے ہیں  
اور اسے یہ صورت عطا کرتے ہیں :

چھٹتی تھی دھوپ پتوں سے خچن چمن کے جسم میں

سایہ ملا تو وہ بھی سُنگستا ہوا ملا

دھوپ ہو تم کہی ، کبھی چھاؤں

کہتے ہے گانے ، کس قدر اپنے

جودن کی تیز دھوپ سے نکال کر نکل گئے

جب غفلتِ شب کے سائے میں پہنچے تو راگ تھے

دھوپ اور چھاؤں ، سایہ اور دھوپ ، پیڑ اور سورج کے گناہوں کو حامد سروس نے  
بار بار استعمال کیا ہے لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہر بار اس طور پر استعمال کیا ہے کہ ان  
اشاروں میں تنوع اور زندگی کے تجربات و مشاہدات کا پھیلاؤ باقی رہتا ہے اور ساتھ  
ساتھ جنیلی اور چمپا کے پھولوں کی تازگی ، اپنی خوشبوؤں کے ساتھ ، ان کے کلام میں محسوس  
ہوتی ہے ۔ یہی تنوع اور تازگی ان کی شاعری کی جان ہے ۔ میں اس بات کا یہاں خاص  
طور پر اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ حامد سروس کے ہاٹن میں ایک سچا اور بڑا شاعر چھپا ہوا موجود  
ہے جس کا پہلا اظہار انھوں نے ”بے جواز“ میں کیا ہے اور جس کا مزید کھرپور اظہار وہ یقیناً  
اپنے دوسرے مجموعے میں کریں گے۔ گذشتہ پانچ سال میں متعدد مجموعے ملے کلام شائع  
ہو چکے ہیں اور حامد سروس کا مجموعہ ”بے جواز“ ان مجموعوں میں ایک قابلِ توجہ مجموعہ ہے اور  
یہی اس مجموعے کی اشاعت کا ٹھوس جواز ہے جس نقاد نے یہ کہا تھا یقیناً صحیح نہیں کہا تھا کہ تیز

غالب اور فیض کے بعد کسی شاعر اور کسی شاعری کے مجموعے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ معلوم نہیں وہ صاحب نقد کون تھے ورنہ بات صرف اتنی سی ہے کہ جب ہزاروں شاعر کسی دور میں شاعری کو زندگی کا اڈھنا بھجھنا بنا کر شعر کہتے ہیں تو پھر رنگس کے اس کھیت میں برسوں میں جا کر ایک شاعر پیدا ہوتا ہے جسے آپ دیدہ ور کہتے ہیں۔ وہ دیدہ ور کون ہوگا اس کا فیصلہ ذرا دیر سے ہوتا ہے۔ جب آپ سب نوجوان شعر کہیں گے اور کہتے رہیں گے اور اپنے معاشرے کی روح کو اپنے تجربات کی سمجھائی میں پکا کر شعر کے روپ میں کندن بنائیں گے تو پھر ایک شاعر ان کے درمیان سے ایسا پیدا ہو گا جسے کبھی آپ حلقہ کہیں گے، کبھی سعدی کہیں گے اور کبھی تمیر، غالب یا اقبال کہیں گے۔ ہمیں اس وقت شکایت اپنے اس سفاک معاشرے سے ہے جو سمجھنے والوں کا نہ احترام کرتا ہے نہ انہیں عزت دیتا ہے اور نہ ان کے تخلیقی کاموں کو اہمیت دیتا ہے۔ جب معاشرے تخلیقی عمل کو اہمیت دینے لگتے ہیں تو وہ نہ صرف خود زندہ ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے شاعر، اس کے ادیب، اس کے مفکر اسے دنیا میں سرخرو اور قابل ذکر بنا دیتے ہیں!

وہ پیر کاٹھ کے، لکڑی کو بیچ کر خوش تھا  
پھر اس کے بعد کڑی دوپہر میں جلتا تھا

(۸ جنوری ۱۹۸۸ء)

# بات سے بات : نصر اللہ خاں

جب مجھے یہ بتایا گیا کہ حضرت قبلہ محترم نصر اللہ خاں صاحب کی سالگرہ جسے عام میں سنائی جا رہی ہے اور اس جلسے سالگرہ کی صدارت اس حقیر فقیر نے تقصیر کو کرنی ہے تو مجھے خیال آیا کہ میں نصر اللہ خاں صاحب کی تسبیح ذکر کا دانہ دانہ شمار کروں لیکن پھر خیال آیا کہ ماضی کو شمار کرنا تو اب لا حاصل ہے اس لیے گزشتہ انچہ گزشتہ پر عمل کرنا چاہیے۔ ہاں اتفاقاً دلائل و اشغالی یہ ہے کہ مستقبل کا حساب رکھنا ضرور چاہیے کہ یہی حاصل کائنات ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ کپ نصر اللہ خاں صاحب کی کون سی سالگرہ منار ہے میں لیکن میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ آپ بغیر کسی حساب کتاب کے ہر سال اسی طرح ان کی سالگرہ مناتے رہیں۔ حساب دودستاں درود کے آپ بھی قائل ہیں اور میں تو سدا سے اسی پر عمل پیرا ہوں۔ اس میں خود غرضی کا پہلو یہ ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نصر اللہ خاں اسی طرح برسوں ہاتوں کے پھول بکھیرتے رہیں اور ان کے پڑھنے والے اپنی زندگی کی انویسٹمنٹ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہمیشہ مسرتوں سے بدلتے رہیں۔

میں نصر اللہ خاں صاحب کو اُن وقت سے جانتا ہوں جب وہ واقعی بوڑھے تھے۔ ہیٹ میں آنت، منہ میں دانت، حسن اتفاق سے جو دو چار دانت رہ گئے تھے وہ بھی غل افسانہ گفتار کے جھکڑے جھکڑے برابر ہو گئے تھے لیکن ایک بات جو اس وقت تھی، وہ آج بھی بھرا اللہ جنوں کی ٹوٹ باقی ہے۔ اس وقت بھی وہ بہت دل چسپ باتیں کرتے تھے اور بہت کرتے تھے اور آج بھی ان کا صدقہ جاریہ کا یہ دریا اسی طرح موجزن ہے۔ جب وہ بات چیت شروع کرتے تو بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے گھنٹوں گزر جاتے اور پھر جب شام کے

سائے طویل ہونے لگتے تو پتا چلتا کہ خدا کے فضل و کرم سے ہزار وقت گزر گیا ہے۔ ان ہی باتوں سے ان کی زندگی عبارت تھی اور یہی باتیں ان کا مقصد حیات تھیں۔ نیز ترک کامزن منزل مادہ و نیست۔ ایسا مظلوم ہوتا تھا کہ انھیں دُنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یہ محض باتیں کرنے کے لیے دُنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور قیامت کا ذکر چھپ کر میری اور آپ کی جواتی تک بات کو پہنچا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ تقریباً دو گھنٹے پر وفسر حسنِ عسکری کو موضوع گفتگو بنا کر محلِ افشائیاں کرتے رہے تھے اور طرح طرح کے واقعات اور دلائل سے یہ جتا رہے تھے کہ اے ایم قریشی نے حسنِ عسکری کو پوشر لکھنے پر مقرر کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں اپنے مخصوص انداز میں وہ کچھ اس طور پر میرے ذہن میں اُنڈیل رہے تھے کہ میں حالتِ نشہ میں اگر ان پر ایمان بھی لے آیا تھا۔ نصر اللہ خان صاحب اسی خوب صورتی سے جھوٹ بولنے کے سچ معلوم ہوتا۔ ایسے واقعات تخلیق کرتے جن کا جو دفترش تا عرض کہیں نہ ہوتا اور ایسے لطیفے تھڑتے کہ بس وحی سے ایک ہی درجہ کم معلوم ہوتے۔ ایک دن شاہد احمد دہلوی مرحوم سے ان کا ذکر آیا تو مجھے سمجھانے بچانے کے سے انداز میں کہنے لگے: ”میاں ابھی فوجوان ہو۔ ان کے چکر میں پہنچنے تو کہیں کے ذرہ ہو گئے۔“ میں سوچ میں پڑ گیا۔ یا اللہ! نصر اللہ خان تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ کیسی پُر از معلومات باتیں کرتے ہیں۔ کیسے کیسے واقعات بیان کرتے ہیں۔ ادب کی عظیم شخصیتوں کے بارے میں کیسے کیسے لطیفے سُنتے ہیں۔ کیا یہ سب باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں؟ اس وقت میں طالب علم تھا اور ادیبوں سے ملنے اور ادب کی دُنیا میں داخل ہونے کے جوش اور دلولے سے دل و دماغ متور تھا۔ ایک دن نصر اللہ خان صاحب پھر مل گئے اور ایک رسالے کے مدیرِ اعلیٰ کے بارے میں چند ایسے واقعات سُنائے کہ میں ششدر رہ گیا۔ ان مدیرِ اعلیٰ صاحب کی شخصیت کا یہ ایک ایسا رخ تھا جس سے میں اب تک بالکل ناواقف تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب ان مدیرِ اعلیٰ سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے دریافت کیا تو ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور غصے سے کم و بیش لال پیلے ہو گئے۔ فوراً کہنے

گئے کہ نصر اللہ خان ہوں گے۔ یہ شرارت وہی کر سکتے ہیں۔ جب نصر اللہ خان صاحب سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے دریافت کیا تو کمال بے نیازی اور انتہائی معصومیت کے ساتھ فرماتے گئے: ”بھائی! یہ تو پر سوں کی باتیں تھیں۔ رات گئی۔ بات گئی۔ آج کی تازہ باتیں الگ ہیں۔“ میں کچھ دیر حیرت سے ان کا منہ ٹکراتا اور اس طرح سے میں یہ بسم اللہ کہے بغیر شروع ہو گئے اور ایسے شروع ہوئے کہ بارش میں وہ بھی بھیگتے رہے اور میں بھی لیکن باتوں کا سلسلہ اسی شد و مد کے ساتھ جاری رہا، تاہم یہ باتیں وہی تھیں اور اسی فن کی مناسبت سے انھوں نے اپنی دو شیرو کتاب کا نام بھی ”بات سے بات“ رکھا ہے۔

روزنامہ ”حریت“ کی اشاعت کے وقت جب مجھے معلوم ہوا کہ نصر اللہ خان صاحب اب اس میں فکاہیہ کالم لکھا کریں گے تو مجھے اس لیے بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ اب ان کی زبانی جمع خرچ والی باتیں صرف ہوا میں تحلیل نہیں ہوں گی اور ان کی ذہانت کا دکھتا ہوا کوندہ باتوں کی تیز ہوا سے صوف راگھ نہیں بنے گا بلکہ اب ان کی نعل انشائی گفتار محفوظ بھی ہو جائے گی۔ باتیں کرنا، باتیں لکھنا اور بات سے بات لکھنا یہی نصر اللہ خان صاحب کا فن ہے اور اس فن میں اردو صحافت میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ ابن انشاء نے ایک راہ نکالی تھی اور گھلائی اردو کو جدید اسلوب میں ڈھال کر اپنا ایک انداز تحریر بنایا تھا۔ ابن انشاء کی تحریروں کی خوبی یہ تھی کہ آپ اُسے شروع کریں گے تو ختم کیے بغیر نہیں گئے اور آخر میں جب ختم کریں گے تو صرف مزے کا احساس باقی رہ جائے گا۔ نصر اللہ خان کی تحریروں کی خوبی یہ ہے کہ آپ اسے شروع کریں گے تو ختم کیے بغیر نہیں رہیں گے لیکن آخر میں مزے کا احساس کے علاوہ چند فقرے اور باتوں کے چند خٹے پہلو بھی آپ کے ذہن میں محفوظ رہ جائیں گے۔ اس سلسلے پر نصر اللہ خان ابن انشاء سے آگے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں اردو زبان کی روایت بولتی ہے، ان کے اظہار میں بات چیت کا عام لہجہ پورے زور کے ساتھ ہم کلامی ہوتا ہے۔ وہ ہم بڑی سے بڑی بات کو ان کے مخصوص شگفتہ و مزاحیہ انداز میں ختم کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں زور زور سے چپک چپک کر باتیں کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں خاموشی نہیں بلکہ خود اور قہر لگنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ لڑنے والے

کو سونے نہیں دیتے بلکہ اپنی ہنسی سے اپنی اونچی آواز سے، اپنے برستے فقروں سے اسے جگنائے رکھتے ہیں۔ پھر لطف بات یہ ہے کہ ان کے ہاں ذاتیات بالکل نہیں ہوتی بلکہ کسی کی ذات اگر ان کے قلم کی زد میں آتی ہے تو ذات کو بات میں پسٹ کر اس طور پر چھپا لیتے ہیں کہ بات بھی کہہ جاتے ہیں اور زیر قلم ذات بھی زخمی نہیں ہوتی۔ ان کے کالم خالص مزاح کی خوب صورت مثال ہیں۔

پھر ایک بات اور وہ روز کالم لکھتے ہیں لیکن کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا قلم تنک گیا ہے یا وہ بالجمبر کھڑے ہیں۔ پہلے دن سے لے کر آج تک ان کے قلم سے دیے ہی پھول جھوٹے ہیں ان کے کالموں میں معیار کی ایسی یکسانیت ہے کہ بہت کم کالم نویسوں کے ہاں ملتی ہے۔ نبی وجہ ہے کہ نصر اللہ خان صاحب اپنے مخصوص انداز کی کالم نویسی میں آج ملک کے سب سے بڑے کالم نویس ہیں۔ وہ جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ نصر اللہ خان صاحب باتوں کے بادشاہ ہیں اور بات سے بات ایسے نکالتے ہیں جیسے ہم آپ مکھن سے ہال نکالتے ہیں یا دودھ میں سے مکئی نکالتے ہیں تو اس کی مثال میں ان کے متعدد کالم پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ کلمہ کہ میں یونہی کتاب کھوتا ہوں اور میری نظر ”کراچی اور موسم“ کے عنوان پر جاتی ہے۔ دیکھیے اب بات شروع ہوتی ہے۔

”موسمات کے ماہرین سے اب تک یہ نہ ہوا کہ جو موسم یہ چاہتے وہ ملک میں رائج کراوتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یو لیس کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ بڑھیں لائٹی چلتی اور نہ کہیں آنسو گیس اور گولیوں کی ضرورت پڑتی۔ ایسے موقعوں پر محکمہ موسمیات بس یہ اعلان کر دیتا کہ جیسے جلوسوں اور ہڑتالیں نہیں ہوں گی۔ اگر کوئی سیاسی پارٹی ایسا کرے گی تو ہم اگلے برس آدمیں گے، تو چلا دیں گے یا سٹریمل فی گھنٹہ کی رفتار سے آندھی چھوڑ دیں گے۔ ایسی صورت میں اخباروں میں کچھ اس طرح کی خبریں شائع ہوا کریں گی۔



آج حزب اختلاف اور سرکاری پارٹی میں فشر پارک میں بڑی زور کی جھڑپ ہوئی۔ سرکاری پارٹی کے کچھ عناصر نے حزب اختلاف کے اہلاس پر اولے برسائے تو جماعت اسلامی نے سخت گرمی دکھائی۔ جمعیت علمائے پاکستان نے ٹو جیلا دی۔ پیپلز گارڈ سیلاب لے آئے۔ سردار شوکت حیات خان کی پارٹی نے جھکڑ چھوڑا۔ پولیس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے بذریعہ آلاتِ تنبیہ عوام پر قابو پالیا۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو تماشاخی سیلاب سے تباہ ہوئے ہیں یا جنہیں سیاسی ٹوٹگی ہے یا جو سردار شوکت حیات کے جھکڑ کی نذر ہو گئے ہیں ان سب کو حوصا، انسانی کے ضمن میں (رشاشی) انعامات یعنی کنسولیشن پرائز دیئے جائیں گے۔

یہ شوخی، یہ پھل، یہ مزاح، یہ بے باکی، اُن کے کالموں کا ایسا وصف ہے کہ پڑھنے والا ان کے طلسم میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نصر اللہ خان صاحب کے قلم کی سیاہی نے، فقرہ کی گرمی نے، زبان و بیان کے خُن نے مزاح کی چمکنی بات نے طنز کی حدت نے یقیناً عام آدمی کے شعور میں اضافہ کیا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ہم نصر اللہ خان صاحب کو مبارک باد دیئے بغیر پو نہیں سہری طور سے گذر جائیں۔ ان کی تحریر میں ایک ایسی ادبیت ہے جو ان کے کالموں کو زندہ رکھے گی۔ زبان و بیان پر جیسی قدرت نصر اللہ خان صاحب کو حاصل ہے وہ اس رنگ کے کسی صحافی کو حاصل نہیں ہے۔ وہ لفظوں سے نئی نئی وضع اور نئے نئے ذائقے کی روٹیاں کالم کے طور میں پکا کر اپنے پڑھنے والوں کی ضیافتِ طبع کے لیے ہر روز دسترخوان پر سجاتے ہیں۔

آخر میں میں نصر اللہ خان صاحب کو مسلسل اچھے کالم لکھنے پر دلی مبارکباد

پیش کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ جلسہ سالگرہ کے منتظمین سے میری یہ گزارش ہے کہ وہ سالگرہ تو اسی طرح ضرور مناتے رہیں لیکن یہ ہرگز نہ پوچھیں اور نہ بتائیں کہ ان کی کون سی سالگرہ ہے۔ جب آدمی پچاس کے آگے بڑھتا ہے تو پھر عمر کا حساب بے حسی ہو جاتا ہے اور انسان پھر ساری عمر کے لیے ۲۴ سال کا ہو جاتا ہے اور خواتین و حضرات ہمارے نصر اللہ خان صاحب بھی اب ماشاء اللہ مستقل طور پر چوبیس سال کے ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں اس عمر پر بیمار میں وہ اب کیا کیا محفل کھلائیں گے۔ خدا ان کو وہ عمر و راز عطا فرمائے جس کے ہر برس میں پچاس ہزار دن ہوتے ہیں۔

# تاریخ ادب انگریزی: احسن فاروقی

پروفیسر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نہ صرف اردو ادب کے بڑے نقاد، بڑے افسانہ نگار اور بڑے ناول نگار تھے بلکہ بڑے عظیم پاک و ہند میں انگریزی ادب کے ایک ایسے استاد بھی تھے جو اپنے وسعت علم، کثرت مطالعہ اور دل نشیں انداز درس و تدریس کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ اتنے بڑے کچھ لوگ ہمارے دور میں اتنے کم ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اردو، انگریزی، فارسی، عربی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، لاطینی و یونانی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ پڑھتے لکھتے اور بحثوں میں الجھتے دیکھا۔ وہ پاکستان میں دانشوری کی روایت کے صحیح معنی میں منفرد نمائندہ تھے۔ انھوں نے ساری عمر درس و تدریس اور علم و ادب کی خدمت میں گزار دی اور کراچی سے کوئٹہ جاتے ہوئے فروری ۱۹۷۸ء میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پائی۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کی بہت سی تحریروں کی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے سینکڑوں مضامین، افسانے اور انشائیے مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ "تاریخ ادب انگریزی" کا غیر مطبوعہ مسودہ بھی میرے پاس محفوظ تھا جسے شعبہ تصنیف و تالیف ترجمہ شائع کر رہا ہے۔

گذشتہ دو سو سال سے انگریزی زبان را ادب بڑے عظیم پاک و ہند کی دیں نگاہوں میں

پڑائے جارہے ہیں لیکن اب تک اردو زبان میں انگریزی ادب کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جسے مستند کہا جاسکے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر احسن فاروقی کی زیر نظر کتاب "تاریخ ادب انگریزی" پہلی تاریخ ہے جسے انگریزی ادب کے ایک رازدان نے اردو زبان میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں جو مواد اور ذرائع نظر پیش کیا گیا ہے وہ فاروقی صاحب کے پچاس سال کے گہرے مطالعے اور درس و تدریس کے وسیع تجربے کا بخوبی ثمر ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انگریزی زبان ادب اور کلچر نے ہمارے زبان و ادب اور تہذیبی سانچوں کو شدت سے متاثر کر کے انھیں تبدیل کیا ہے۔ اردو کا جدید سرمایہ ادب جس کی روایت سرسید و حلی سے شروع ہوتی ہے انگریزی ادب اور انگریزی زبان کے ذریعے مغربی ادبیات سے متاثر ہوا ہے۔ جدید اردو ادب نظم و نثر کی مختلف اصناف اور تخلیقی عوامل سے لے کر تنقید اور اصولی تنقید تک مغرب کے گہرے اثرات کا عکاس ہے۔ نثر میں ناول، انشائیہ، ناولٹ، طویل مختصر کہانی، رپورٹاژ، سوانح نگاری، خاکہ نگاری، ادبی و فکری تنقید اور شاعری میں جدید موضوعات و اسالیب کی نظموں سے لے کر نظم آزاد، نظم معری، نثری نظم وغیرہ تک جس طور پر اردو میں برتنے گئے ہیں اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی و مغربی ادب کی مختلف تحریکوں نے جس طرح اردو ادب کو متاثر کیا ہے وہ بھی سب ہمارے سامنے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو انھیں اثرات کے تحت سرسید سے پہلے اور بعد کا اردو ادب، طرز احساس اور اصناف ادب دونوں کے اعتبار سے بالکل بدل چکا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اب تک انگریزی ادب کی تاریخ اردو زبان میں کیوں نہیں لکھی گئی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی ادب کی تدریس چونکہ انگریزی زبان کے ذریعے ہوئی اور طلبہ و اساتذہ نے اسی زبان میں پڑھ کر اپنا مقصد پورا کر لیا اس لیے اہل علم کو اردو زبان میں انگریزی ادب کی تاریخ لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ دنیا کے سب ممالک میں ان کی اپنی زبانیں درس و تدریس کا ذریعہ ہیں۔ انگریز اگر فرانسیسی، جرمن یا روسی زبان لکھتا ہے تو اپنی زبان انگریزی ہی کے ذریعے لکھتا ہے۔ اگر اردو زبان لکھتا ہے تو وہ بھی انگریزی زبان ہی کے ذریعے لکھتا ہے۔

اللہ کی اپنی زبان میں دجور میں کتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں صورت حال یہ ہے کہ ہم ہر علم انگریزی زبان کے ذریعے سیکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں اور اخلاقی قوتیں کم زور ہو کر کم و بیش نکارہ ہو جاتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم کے اس قومی احساس کی وجہ سے انگریزی ادب کی تاریخ اردو زبان میں ابھی جا سکی۔ یہ ”تاریخ“ یقیناً ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے طلبہ و اساتذہ سے کرام قاری تک سب مستفید ہوں گے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کی یہ تصنیف اردو ادب کے طلبہ، اساتذہ اور قارئین کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے مطالعے سے جدید اردو ادب کا پس منظر نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ ادب جو مغرب سے استفادہ کر کے سرسبز سے لے کر اب تک لکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا ارتقاء و رفتار اور بنیادی پس منظر بھی مرابطہ انداز میں پڑھنے والے پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کو لکھتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے اختصار لیکن جامعیت سے کام لیا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنی افادیت اور زاویہ نظر کے باعث مقبول ہوگی۔ -

(رہبرِ طبع + ۱۹۸۰ء)

# عمر گذشتہ کی کتاب

میں آج اس بات کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے آگرہ بہت پسند ہے اور اسی لیے مرزا ظفر الحسن صاحب بھی بہت پسند ہیں۔ ممکن ہے یہ بات سن کر آپ کے ذہن کے درمیان سے "مادوں گھٹنا پھوٹے آنکھ" کی کہادت جھانکنے لگی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ یہ بات اتنی اہل ہے جوڑ نہیں ہے جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔ اس لیے آپ کی انجمن میں مزید احضار کیے بغیر پہلے یہ بتا دوں کہ مجھے آگرہ کیوں پسند ہے۔ آگرہ کی پسندیدگی کی ایک وجہ تو وہی ہے جسے آپ بھی جانتے ہیں اور جس کا انہماک اگر نہ بھی کیا جائے تو بات آپ تک یقیناً پہنچ چکی ہوگی لیکن آگرہ کی پسندیدگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مجھے آگرہ والیاں بہت پسند ہیں۔ ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ جب بولتی ہیں تو پھول جڑتے ہیں۔ لیجئے میں ایسی گھلاوٹ آواز میں ایسی میٹھی تیزی 'بیان میں ایسی رچاوت کہ آدمی دیکھتا رہے، سنتا رہے۔ آگرہ والیوں کی یہی خصوصیت چونکہ مرزا ظفر الحسن صاحب میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اسی لیے میں انھیں بھی دل سے چاہتا ہوں۔ بات کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تیز دھار کی قینچی کھواب کو کاٹتی چلی جا رہی ہے اور جب نکلتے ہیں تو یہی خصوصیت ان کی تحریر میں رنگ بھرتی ہے۔ "ذکر بار چلے" میں تو ان کے قلم کی تسبیح ایسی چلی ہے کہ کہڑا پیچھے رہ گیا اور قینچی آگے نکل گئی۔ مرزا ظفر الحسن صاحب سے مل کر اور پھر ان کی تحریر میں پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ وہ

ویسے ہی ہیں جیسے وہ نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اس بھری مٹل میں ایک خاتون ایسی بھی ہوں جو مجھ سے اختلاف کریں لیکن خواتین و حضرات! ایک خاتون کی ذاتی رائے رائے عامہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ بہر حال مرزا صاحب کی زبان نے زبانی بھی اور قلم سے بھی سارے ملک کے طول و عرض میں ایک کہرام مچا دیا ہے اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں تو انھوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا ہے جو اس شہر کے نام کے ساتھ ویسے ہی ذہن مہیا کرتا ہے جیسے ہندو روڈ اور کیمٹری ذہن میں آتے ہیں۔ یہ مرزا صاحب کا کوئی معمولی کاغذ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ بے لوثی کے ساتھ ”ادب و یادگار“ غالب کو جنم دے کر ایک ایسا لافانی کام کیا ہے جو اس شہر کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسی کے ساتھ مرزا ظفر الحسن کا نام نامی بھی۔ اس دور میں جب ساری قوم صرف پیسے کمانے کی مہلک بیاری میں مبتلا ہے، جب ساری قوم کا خدا اور اس کا رسول پیسہ علیہ السلام بن کر رہ گیا ہے جس کے باعث قوم لوح اور قوم عاد و ثمود کی ساری برائیاں ہم میں سرایت کر گئی ہیں، ابھی قدریں لوٹ پھوٹ کر ڈھیر ہو گئی ہیں اور ہم اندھے بہرے ہو کر گھرے گڑھے کی طرف بڑھ رہے ہیں، مرزا صاحب کی یہ بے لوث خدمت یقیناً ایسی ہے جس کا ہمیں بار بار اعتراف کرنا چاہیے اور آج سماج بھری مٹل میں مرزا صاحب کو اس بے لوث خدمت پر سلام کرتا ہوں۔

میں یہاں تک پہنچا تو خیال آیا کہ مجھے تو ”گزشتہ کی کتاب کی تعارفی تقریب میں کتاب کے بارے میں کچھ کہنا تھا لیکن مرزا صاحب کا ذکر میں نے اس لیے پہلے کیا کہ کتاب تو خود مصنف کی ذات اور صفات کا مظہر ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کتاب سے پہلے صاحب کتاب کا ذکر نہ جائے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے لیکن مرزا صاحب سے معذرت کے ساتھ میں کتاب کا ذکر اختلاف سے شروع کروں گا۔ اس کتاب میں مرزا صاحب نے فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کو موضوع بنایا ہے اور ان کی زندگی و شخصیات کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے جس کی وجہ سے دونوں کی تصویریں پورے طور پر چاگر نہیں ہو سکی ہیں۔ اگر اس کتاب کے دو حصے الگ الگ ہو جاتے۔ ایک فیض پر ایک مخدوم پر تو میرا

خیال ہے کہ مرزا صاحب زیادہ بہتر طریقے سے اپنے تعلقات اور اپنی محبتوں کا قرض اُتار سکتے تھے۔ فیض اور مخدوم دونوں مختلف شخصیتیں ہیں اور دونوں الگ الگ مطالعہ کی متقاضی تھیں۔ خیر یہ تو میری ذاتی رائے تھی۔ ضروری نہیں ہے کہ مرزا صاحب اس وقت جب کتاب چھپ کر بازار میں آگئی ہے اس بات کو کوئی اہمیت دیں، لیکن ایک اختلاف اس سلسلے میں "بین الاقوامی" نوعیت کا ہے۔ مرزا صاحب نے صفحہ ۳۲۵ پر لکھا ہے کہ "اگر فیض کی شادی ایلس کے بھائے اس برصغیر کی کسی خاتون سے ہوئی تو میرا یقین ہے کہ فیض بحیثیت شاعر اور انسان کرج سے بالکل مختلف ہوتے۔ ایلس کی صلاحیت اور بھرداری کی داد برصغیر کی عورت کی تحقیر کیے بغیر بھی دی جاسکتی تھی لیکن کھتہ بنا کر برصغیر کی عورت کو جس کا ہت ورتا ہونا دنیا زمانے میں مشہور ہے، اس طرح رد کرنا مرزا صاحب جیسے انصاف پسند شریف النفس انسان کو یقیناً زیب نہیں دیتا۔ اسی صفحہ پر آگے چل کر مرزا صاحب خود مخدوم محی الدین کی بھی یہی کہہ رہے ہیں انصرت محی الدین کے حوالہ سے یہ لکھتے ہیں کہ

"امی کے ایشا راودان کی قربانیوں کا وہ (مخدوم) اکثر ذکر کرتے اور ہم سے کہتے اس خاتون کی جتنی عزت کر سکتے ہو کر و کیونکہ اس نے میرے اور تمہارے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔"  
(ص ۶۵)

واضح رہے کہ یہ خاتون برصغیر کی خاتون تھیں۔ اس کے برخلاف مرزا صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ فیض صاحب ایک بار بغیر اطلاع دئے مرزا صاحب کو لاہور صحابے گھر اسلام آباد لے گئے۔ مرزا صاحب کے الفاظ میں اس واقعہ کی تفصیل سنئے :

"ایلس نے مجھے دیکھ کر فیض سے شکایت کی کہ میرے لائے جانے کی اطلاع لاہور سے کیوں نہیں بھیجی۔ فیض نے پوچھا اگر تمہیں اطلاع کر دیتا تو تم کیا کرتیں؟ میں نے جواب دیا خوشی میں کہ اگر



ایک دُنبہ تو ذبح کرتی اور پہلے سے ان کا کرہ ٹھیک کرتی اور شاید ان کے گلے میں پھولوں کا بار ڈال کر استقبال کرتی :

(ص ۷۳)

پھر ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ  
 ”فیض اپنے گھر میں مہمان کی طرح رہتے ہیں اور ہر مہمان  
 ان کے گھر میں میزبان کی طرح نہ رہے تو اس کا پورا ہونا  
 یقین ہے“ (ص ۷۵)

بہر حال برصغیر کی عورت کے بارے میں مرزا صاحب نے جو کلیتہً بتایا ہے وہ جو تکمیل صحیح نہیں ہے اس لیے مجھے اختلاف ہے۔ لیکن مجھے ان سے ایک اور بات پر بھی اختلاف ہے۔ فیض صاحب کی محبت میں ایک آدمہ جگہ انھوں نے ایسی متضاد باتیں بیان کی ہیں جن کو ذہن قبول نہیں کرتا مثلاً ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ فیض کو :

”بی بی سی لندن اور آل انڈیا ریڈیو سے ملازمت  
 کی پیش کش ملی۔ انگریزوں کی نوکری ناپسند تھی۔ قبول نہیں کی۔“  
 (ص ۹۳)

لیکن صرف چار سطروں کے بعد یہ غلطے ملتے ہیں :

”دلی میں فوجی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے تو ٹریڈ  
 یونین کا کوئی کام نہیں کیا۔ جنگ کے بے پناہ کام کے علاوہ  
 دورے کرنے پڑتے تھے اور اس وقت وہ جنگی کام ٹریڈ یونین  
 کی اعانت سے زیادہ اہم تھے“ (ص ۹۳)

اگر بی بی سی لندن اور آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت انگریز کی ملازمت تھی تو فوجی  
 ملازمت بھی تو کسی قومی حکومت کی ملازمت نہیں تھی ؟

بہر حال اب اختلاف بہت ہو چکا۔ یہ تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ قہقہے چلتے ہوئے بعض

اوقات کھڑا غلط بھی کٹ جاتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ”عمر گزشتہ کی کتاب“ ایک اچھی دلچسپ اور قابل ذکر کتاب ہے جس سے فیض اور محمدؐ کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں مثلاً اس کتاب کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض کا نام فیض احمد خان ہے۔ ان کے نانا کا نام عدالت خان اور دادا کا نام صاحبزادہ خان اور پردادا کا نام سر بلند خان تھا۔ والد کا نام میں نے اس لیے نہیں لیا کہ ان کے نام سے میں پہلے سے واقف تھا۔ پھر یہ بھی میرے لیے بالکل نئی بات تھی کہ ڈاکٹر تاثیر کا نکاح علامہ اقبال نے پڑھایا تھا اور ان کی شادی کے عہد نامہ کا مسودہ بھی علامہ ہی نے مرتب کیا تھا اور یہی عہد نامہ فیض اور اعلیٰ کے درمیان طے پایا تھا۔ یہ بات بھی میرے لیے نئی تھی کہ فیض کا نکاح شیخ محمد عبداللہ نے پڑھایا تھا۔ پانچ ہزار مہر تھا اور شادی کے اخراجات کے لیے میان افتخار الدین نے تین سو روپے دیئے تھے اور براتیوں میں جو ش ملیح آبادی اور مجاز مرحوم شامل تھے۔ یہ باتیں پڑھ کر میں علامہ اقبال اور شیخ عبداللہ کی صلاحیت نکاح خوانی کا بھی قائل ہو گیا اور میرے ذہن میں برجستہ یہ جملہ آیا کہ قاضی ہوں تو ایسے ہونے ورنہ نہ ہوں۔ غالباً فیض اور ڈاکٹر تاثیر کی کامیاب ازدواجی زندگی میں علامہ کی روحانیت اور شیخ عبداللہ کی بصیرت کو بڑا دخل ہے۔

# پاکستان کی شخصیات

ایک زمانہ تھا جب ادب اور سیاست کا چرخی دامن کا ساتھ تھا۔ ادب ساتھ ساتھ کی فہمی تربیت کا ایک حصہ تھا جس میں علوم مروجہ کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر قدرت شامل تھی۔ وہ نکتہ بھی سکنا تھا اور تقریر بھی کر سکتا تھا۔ اُسے اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کی زحمت نہیں ہوتی تھی اسی لیے الفاظ غلط فہمی پیدا نہیں کرتے تھے اور سیاست والے کے منہ سے ایسے جملے نہیں نکلتے تھے جن سے سُنے والے منفذ ہوں اور موصوف اپنی صفائی پیش کرتے پھریں۔ جس نے سیاست میں قدم رکھا، علم و ادب کے راستے سے رکھا۔ دور کیوں جائیے۔ سر سید کو لیجیے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، بہادر یار جنگ کو لیجیے، یہ سب علم و ادب کے راستے سے میدان سیاست میں داخل ہوئے اور اپنی اسی صلاحیت و تربیت سے ایسے گہرے اثرات مرتب کیے کہ الٹ کے نام ہماری جدید تاریخ کا حصہ ہیں۔ نواز الصبار، بگیم جنوں نے چھپاس ساتھ سال پہلے کے رواج زمانہ کے مطابق کسی اسکول کا لچ یا پونی ورلٹی میں تعلیم نہیں پائی بلکہ گھر پر ہی اردو فارسی پڑھی اور مطالعے سے اپنی صلاحیتوں کے جوہر نکھارے،

اسی روایت سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ قلم اور زبان دونوں سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی ہیں اور سلیقے سے کر سکتی ہیں اور ہماری نئی نسلوں کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مشرقی عورت کی وہ ساری اخلاقی خصوصیات موجود ہیں جن کی وجہ سے مشرقی عورت ایک بچی ماں، ایک اچھی بیوی، ایک اچھی انسان اور ایک اچھی راہبر بنتی تھی۔ وہ گھر میں رہی تو اس نے گھر کو جنت، بنا دیا، بچوں کی ایسی تربیت کی کہ وہ زندگی میں ممتاز ہوئے۔ شوہر کے ساتھ ایسا اچھا سلوک کیا کہ اس کے چھپے ہوئے جوہر ظاہر ہو گئے۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی مشرقی عورت کا ایک مقصد حیات ہوتا تھا۔ زندگی کا ایک مشن ہوتا تھا۔ اس کے لیے دولت، عیش و آرام، بنگلہ کو بھی کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اگر یہ چیزیں میسر نہ ہوں تو ٹھیک ہے۔ نہیں ہیں تو ان کے حصول کے لیے شرافت و اخلاق کی دیواریں پھاٹ گئے کی عزت نہیں ہے۔ نواز الصباح بیگم نے برقعہ پہن کر پردے میں رہتے ہوئے، ساری عمر تحریر پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے لیے جس حوصلے، جس کردار اور جس جوش مقصد کی عزت تھی وہ ان میں موجود تھا۔ اس عمر میں وہ کم و بیش ان تمام راہنماؤں سے ملیں جن کا نام ہمارے لیے عزت و محنت کی علامت ہے۔ اس اعتبار سے بھی نواز الصباح بیگم اب ان چند خواتین میں سے ایک ہیں جنہیں قائد اعظم محمد علی جناح، شہید ملت لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشترو، نواب محمد سلیم خان وغیرہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔

”پاکستان کی مشہور شخصیتیں میری نظر میں“ جس کی تقریب رونمائی میں شرکت کے لیے آپ برسات کے موسم میں یہاں تشریف لائے ہیں نواز الصباح بیگم نے ۶۵ مشہور اور معروف سیاسی اور ۶۶ ادبی شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر جیسا کہ انہوں نے خود بتایا ہے، یہ ہے کہ ”مشہور مرد حضرات کے متعلق ایک خاتون کے خیالات کیا ہیں؟ اس اعتبار سے یہ کتاب ایک انفرادی نظر کی حامل ہے۔“ قائد اعظم کے بارے میں جو تاثرات نواز الصباح بیگم نے پیش کیے ہیں ان میں اتنا غلوں اور عقیدت ہے کہ اس خوب صورت مضمون کو اسکول کی لصلی کتابوں میں شامل کیا جانا

چاہیے۔

نورالصبح بیگم ۱۹۵۸ء میں مسلم لیگ پر پابندی کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہو گئی تھیں اور اب ۱۹۷۷ء میں جیسا کہ اخبارات سے جتا چلا کہ وہ بیس سال بعد پھر تحریک استقلال میں شامل ہو گئی ہیں۔ پاکستان کی مشہور شخصیتیں ان کی گیارہویں کتاب ہے اور یہ اس وقت تک گیارہویں کتاب ہے گی جب تک وہ میدان سیاست میں سپاہی بنی دشمنوں کو شکست فاش دینے میں لگی رہیں گی۔ ان کی اس کتاب کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ اتنی دلچسپ کتاب ہے کہ آپ اسے ایک نشست میں پڑھیں بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کتاب میں نورالصبح بیگم نے جیسا کہ میں نے عرض کیا مختلف سیاسی وادبی شخصیتوں کے بارے میں سیدھے سادے رواں اسلوب میں اپنے تاثرات ہے ہاں وجوہات و خلوص کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ یہ تاثرات چونکہ دل سے نکلے ہیں اس لیے پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتے ہیں۔ یہاں آپ کو کسی قسم کی ہٹاؤٹ یا ہٹاؤٹ نہیں ملے گی۔ سید علی بات سیدھے سادے بھائی انداز میں لکھ دی گئی ہے۔ ان تاثرات میں اکثر ایسے جملے سامنے آتے ہیں جن سے اس شخصیت کا سادہ مزاج اور اس کی روح کی تصویر اُٹھ کر بر جاتی ہے۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جن کے آپ نے نام نہیں ہیں جن کے بارے میں آپ پہلے سے کچھ نہ کچھ جانتے ہیں لیکن اس طور پر یقیناً نہیں جس طور پر نورالصبح بیگم نے دکھا اور آپ کو دکھایا ہے۔ نورالصبح بیگم نے چودھری خلیق الزماں مرحوم سے پوچھا کہ آپ بھارت سے یہاں کیوں آ گئے۔ جواب دیا ”ہم گاندھی جی سے بڑے وعدے کر کے آئے تھے کہ جنت سے تمام باتیں منوالیں گے مگر یہاں انھوں نے ہماری ایک بات بھی نہ مانی تو ہم واپس جا کر ان کو کیا منہ دکھاتے۔“ اس کے بعد مصنفہ نے لکھا ہے کہ ”یہ نہیں معلوم کہ وہ کون سی باتیں تھیں؟“

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ”میں نے فوراً محمد علی بوگرہ کو فون کیا۔ وہ لمبے وقت بہت کم ہے۔ فوراً میرے گھر آ چلے۔ میں ساتھ لے چلوں گا۔ وہاں چودھری خلیق الزماں صدارت کی کرسی پر بیٹھے نظر آئے۔ میں نے برابر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا کہ صدارت قریب امین خان کو کرنا تھی۔ انھوں نے بتایا کہ رات بھر میں یہ معاملہ طے ہو گیا کہ نیشنل مسلم لیگ کا

سارا کام یامین خان سے کر اگر ایوب خان قول سے پھر گئے اور حج دھری خلیق الزماں صاحب کو تیار کر لیا گیا یہاں پھر حج دھری صاحب نے یامین خان کو شکست دی۔  
 کیجئے اب آپ کو اس دل چسپ کتاب کی چند جھلکیاں دکھائوں۔ علی محمد راشدی کے بارے میں لکھا ہے کہ ”دوست کے انتہائی دوست اور اگر ذرا بھی شہد ہو جائے کہ اللہ کے کسی دوست نے ذرا بھی اُن کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے تو وہ ایسی چال چلنا مہلتے ہیں کہ وہ تحت الشریعہ میں پہنچ جائے۔“

میر رسول بخش تاپور کے بارے میں لکھا ہے کہ ”پھر کراچی میں اردو سندھی کا جھگڑا چل نکلا تو ہمیں اور بھی تکلیف ہوئی کیونکہ میر صاحب تو اردو والوں کے بھی اتنے ہی دوست تھے جتنے سندھی والوں کے۔ انھوں نے سلیپ پارٹی کا انتخاب ہی حیدر آباد سے جہا جرنل کے دوٹوں سے جیتا تھا۔ اس خزانوں نے گورنری سے استعفا دے دیا۔ بیگم اختر سلیمان کی بیٹی کی شادی میں ملے تو ہم نے کہا۔ ”میر صاحب مجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کو مبارک باد دیں یا اظہار افسوس کریں۔ کہنے لگے۔“ بیگم صاحب مبارک باد دیجیے کہ عزت و اکبر دے لیں آیا۔“

غلام محمد کے بارے میں لکھا ہے کہ ”جیسے ہی قلی نے میرا بستر کھولا وہ ہماری پوچھ وچ کی ایک پاوروئی کی تارک سی ریشمی فرد (رضائی) کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور اپنے ہاتھوں نے کر نور ریشم کو بار بار اپنے گالوں سے لگا کر دیکھا اور بولے کمال ہے بکتنی نرم رضائی ہے بکتنی ہلکی اور بکتنی حسین پھر میری طرف دیکھ کر بولے ”آپ کو تو بڑے مزے کی نیند آتی ہوگی ایسی رضائی اور بھرتہ ہمیں نہیں آگئی۔“

ایوب خان کے بارے میں یہ واقعہ سُنے۔ ”میں نے کہا آئین تو مل گیا مگر کیا آپ نے انتخابات کے لیے کوئی خاص قوانین بنائے ہیں جن کی وجہ سے ووٹ فروخت نہ ہوں۔ ایوب خان بولے۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے کہا ”اشد ضرورت ہے کیونکہ ان لوگوں نے جن کا دولت پر قبضہ ہے انتخاب کی تیاری میں ہزاروں روپے خرچ کرنے کا اعلان کر دیا ہے مگر وہ سب جاہل ہیں تعلیم یافتہ طبقے کے پاس

پیسے نہیں ہیں۔ اگر وٹ کے تو وہ ہی کامیاب ہوں گے اور پھر اس آئین کا خدا ہی حافظ ہے۔ ایوب خان نے کہا: ”بگم صاحبہ ان بیچاروں کو اس بہانے پیسے مل جائے تو کیا ہرجا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیسہ کسی سے لیں اور وٹ کسی کو دیں۔“

بھٹو صاحب کے بارے میں بھی چند جملے سنئے چلتے۔ ”وہ صدر ایوب کے دست راست بنے ہوئے تھے اور اب وہ صدر ایوب کی مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل بھی تھے۔ جس قدر صدر ایوب ناقبول ہوتے جا رہے تھے اسی قدر بھٹو صاحب ان کے خاص آدمی بننے جا رہے تھے۔ صدر ایوب کے مقابلے پر محترمہ فاطمہ جناح کھڑی ہوئیں تو ذوالفقار علی بھٹو نے اب بھی صدر ایوب کا ساتھ دیا اور انتخابات میں کامیاب کر دیا۔ یہ باتیں مجھے ڈکھ دیتی تھیں کہ اس انتخاب کی وہ اندلیاں سب پر عیاں تھیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ بھارت سے چھڑ گئی۔ کئی لوگوں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھٹو پر الزام لگایا کہ وہ ہی اس جنگ کا باعث ہیں۔ جنگ ہندی کے بعد معاہدہ تاشقند ہوا اور روس سے واپسی کے کچھ عرصے بعد بھٹو ایوب حکومت سے علیحدہ ہو گئے اور اپنی سیاسی پارٹی بنائی۔ غلامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمن اگر تلہ سازش کیس میں ملوث ہو کر جیل جا چکے تھے۔ ادھر ایوب خان کی حکومت زہان ہندی کرتی رہی۔ ادھر یہ جماعتیں فروغ حاصل کرتی رہیں۔ جب ہنگامہ ہوا تو ایوب خان نے گھبرا کر کانفرنس بلوائی۔ سب لیڈروں کے مطالبے پر بھٹو اور مجیب کو جیل سے رہا کر کے کانفرنس میں آنے کی دعوت دی۔ اس دور میں اسرائیل اصغر خان کی تقاریر نے تہلکہ مچا دیا۔ مجیب و بھٹو، اصغر خان کی تقریر و تحریک سے رہا ہو کر کانفرنس میں مدعو کیے گئے تھے۔ اس کانفرنس میں مجیب شریک ہوئے مگر بھٹو نے شرکت سے انکار کر دیا۔ اسی مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے کہ وہ اپنے مصاحبین کی رائے پر نہیں چلتے بلکہ ان کے ارد گرد کے لوگوں کو ان ہی کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ بعض اوقات میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ آخر کسی پر تو بھٹو صاحب کو اعتبار ہو گا مگر واقعات بتاتے ہیں کہ ان کو صرف خود پر اعتبار ہے۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ بھٹو صاحب ممتاز علی بھٹو سے (میرے بیٹے) ثمنین خان کی قابلیت کی باتیں کرتے رہے کہ

وہ بہت ہی قابل قانون دان ہے۔ تعجب ہے تم اب تک اس سے نہیں ملے۔  
چار ماہ بعد ممتاز علی بھٹو کی حکومت نے ثمنین خان کو ڈی پی آر کا الزام لگا کر گرفتار  
کر لیا۔"

اب چند اہل قلم کا بھی حال ٹہنتے چلیے۔ "اس سال مشاعرے کی صدارت کی  
درخواست میں نے مولانا قدوسی صاحب سے کی۔ کئی لوگوں کو محض اس وجہ سے  
اختلاف تھا کہ وہ لا لوکھیت میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا دراصل پڑھے لکھے لوگوں  
کا مسکن ہی لا لوکھیت ہے کیونکہ ان کے پاس دولتِ علم ہے، ذرا نہیں ہے۔"  
بگیم جوش ملیح آبادی کے بارے میں لکھا "دو ایک بار پھر میں ان کے گھر بھی گئی  
محض ان کی بگیم کو دیکھنے کے اتنے عظیم شاعر کی بگیم کیسی ہیں؟ بگیم بے چاری سیدی ساڈا  
اور بے حد صاف گو لکھنوی طرز کی نکلیں۔ کہنے لگیں میں تو ان کی شاعری سُنتے سُنتے  
تنگ آگئی ہوں۔ میں نے کہا "کبھی آپ کو بھی اچھی لگی ان کی شاعری۔ بولیں" شروع  
شروع (اچھی لگتی تھی) اب تو کان پک گئے سُنتے سُنتے اور یہ کہتے کہتے ہمیں ان کی رجحان  
صاحب کی) دو نظمیں بتائیں کہ کسی دن آپ ان سے یہ سُنا بہت ہی مزے کی ہیں۔  
حقیقت جالندھری کے بارے میں لکھا ہے کہ "دوسرے سال مشاعرے کا  
دعوت نامہ گیا تو میں نے فون کیا۔ بولے میری توفیس مقرر ہے اور فیس بھی بتادی۔  
میں نے کہا میری طاقت ہی کہاں ہے۔ میرے گھر تو شوقیہ مشاعرہ ہوتا ہے بلکہ  
تھوڑی گنتا ہے۔"

جمیل الدین غانی کے بارے میں لکھا کہ "بولے ہارہ آدمیوں کا وفد چین جانے گا۔  
میں آپ کو بھیجوں گا مگر بعد کو وفد چلا گیا ہمارا نام ہی نہ آیا۔" دوسرے دن انتخاب  
کے بعد غنتی ہوئی تو پتا چلا میرے ہیں دوٹ شوکت صدیقی کے پچیس دوٹ۔ تو یہ  
ہوا کہ بعد کو ہمیں سوچنا پڑا۔"

جی ایم سید صاحب کے سلسلے میں یہ چند ٹپلے ٹپلے۔ "سید صاحب کے گھر  
پہنچ کر میری ملاقات شیخ مجیب سے ہوئی جن کو ڈھاکہ سے بلا کر سید صاحب نے



بہت بڑا عنصر اور یا تختہ خیر ہماری کوشش سے ون یونٹ ٹوٹ گیا۔ میں تو ابتداء ہی سے ون یونٹ کے خلاف تھی کیونکہ میں نے جب سے سندھ کی سیاست میں حصہ لیا خود کو سندھی سمجھنا شروع کر دیا اور ون یونٹ کو سندھ کے لیے مضر سمجھ کر سخت مخالف بن گئی۔ اب مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کراچی کو سندھ میں شامل کر بی کر الگ رکھیں۔ کراچی کے لیڈران سے گفت و شنید کرنے کے لیے "محاذ" نے ایک کمیٹی مرتب کی جس میں کھوڑو صاحب، آغا غلام نبی، جام صادق علی، قاضی اکبر، میں اور دو اور جہاں لیڈر تھے۔ تین چار میٹنگز ہوئیں اور ہم لوگوں نے کراچی کے لیڈروں کو اس بات پر متفق کر لیا کہ کراچی کو سندھ میں شامل کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ کراچی کو سندھ سے ملانے سے مہاجر بھی ایک طاقت رہیں گے۔ میرے ساتھی سندھی لیڈر کھوڑو اور قاضی اکبر کے علاوہ باقی کراچی کو سندھ میں ملانے کے حق میں خود بھی نہیں تھے۔ جب یہ حرام کام سید صاحب کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو وہ متعصب سندھی بن گئے اور اب "محاذ" نے بڑے سندھ کا نعرہ لگایا یہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی اور خود ہی میں نے محاذ سے استعفاء لے دیا۔

ابن النشا کے بارے میں لکھا کہ "انشا صاحب عالی کا ذکر اپنے کالم میں کرتے ہیں اور عالی انشا کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہوا کہ ہم یکساں نہیں سب ہی نے یہ بات محسوس کی ہے اور میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ابن النشا اس بات کو چھوڑیں تو ان کا کالم خاص مزاحیہ ہو جائے۔"

نورالصابح بیگم صاحبہ نے ابن النشا کا جو چہرہ لکھا ہے اس میں ان کا رنگ گورا بتایا ہے۔ میں نے ابن النشا کو بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھا ہے۔ اگر ابن النشا کا رنگ گورا ہے تو پھر ظلمت و نور کے لیے نئے الفاظ تلاش کرنے پڑیں گے۔ ابن النشا چونکہ میرے کئی دوست ہیں اور اس وقت پریس میں ہیں اس لیے غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کتابت کی اس فاحش ظلمی کی تصحیح نہایت ضروری ہے۔

یہ میں نے اس کتاب کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے سب کو پڑھنا چاہیے۔ یہ ایک ایسی خاتون کے تاثرات ہیں جس نے خلوص کے ساتھ سیاست میں حصہ لے کر اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ اس میں لگایا ہے۔

(۱۹۷۷ء)

# یادوں کا جشن

کچھ لوگ بڑے ہوتے ہیں لیکن شاعر بُرے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ شاعر بڑے ہوتے ہیں لیکن انسان بُرے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں اور جو شاعر ہوتے ہیں کہ شاعر بھی اچھے ہوتے ہیں اور انسان بھی اچھے ہوتے ہیں۔ ایسے شاعر انسان جنہیں دیکھ کر محبت کی مہک گئے گنتی ہے اور غلوں کی کلی نسیم سر سے کھل اٹھتی ہے اور ساری نفاذات چنبیلی اور رات کی رانی کی خوشبو سے جکھنے لگتی ہے۔ برصغیر کے حوالے سے اگر ایسے لوگوں کی فہرست بنائی جائے تو میرا خیال ہے کہ فہرست بنانے والے کو خاصی دشواری پیش آئے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس فہرست میں بلکہ سرفہرست جناب کنور مہندر سنگھ بیدی تحریر کا نام ضرور شامل ہوگا اور نہ صرف شامل ہوگا بلکہ ہر کس و ناکس اس نام پر صدق دل سے اتفاق بھی کرے گا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی شخصیت میں یقیناً ایک ایسا سحر ہے کہ جو ان سے ملتا ہے وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور ساری عمر کے لیے ان کو جھکے لگا کر ان سے جھکے لگ جاتا ہے۔ بیدی صاحب نے اُن کو بھی ساری عمر نبھایا ہے جو ایک بار جھکے لگ کر ان سے جھکے پڑ گئے اور ان کو بھی جو نہ کبھی جھکے لگے اور نہ جھکے پڑے بلکہ صرف انسانی محبت کے رشتے سے انہوں نے اُن کی دل سے مدد کی۔ بیدی صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو محبت ہے اور

یہی ان کا پیغام ہے۔ محبت اُن کی زندگی کی سب سے بڑی طاقت ہے اور اسی لیے خواجہ میر درد کی زبان میں محبت گھنٹن دل را بہار است، ان کی زندگی کا راہنما اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی صاحب مجھے عزیز ہیں۔ ایسے عزیز کہ جن کی شخصیت کا جادو پہلی ہی ملاقات میں دل کو موہ لیتا ہے۔ "یادوں کا جشن" پر مدح کر اُن کی شخصیت کے وہ چھپے ہوئے گوشے بھی سامنے آ گئے جن سے میں اب تک ناواقف تھا اور میری محبت کے جذبے میں مزید گہرائی پیدا ہو گئی۔ خلاصہ صاحب کو خوش رکھے اور صحت کے ساتھ بہت لمبی عمر دے تاکہ یہ اپنے ہدائلی بابا گرو نانک کے پیغام محبت کو برسوں اسی طرح پھیلاتے اور آگے بڑھاتے رہیں۔

"یادوں کا جشن" ایک اچھے ناول کی طرح ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے کہ جسے آپ شروع کرتے ہی تو ختم کیے بغیر بند نہیں کرتے۔ میں نے سفر لاہور کے دوران اس کا مطالعہ شروع کیا اور سفر واپسی تک ۲۶۵ صفحات کی یہ کتاب ختم ہو گئی۔ میں تیز مزور پڑھتا ہوں لیکن اگر کتاب میں کچھ نہ ہو تو اسے پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک سطر و دوسری سطر سے مختلف ہے۔ اس میں اختصار بھی ہے اور بیان کی روانی بھی زندگی کی رنگارنگی کی طرح ایک ایسا تنوع ہے کہ اسے آپ ایک دلچسپ داستان کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی داستان حیات ہے جس نے کھل کر بولا ہے اور جس نے اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کے بجائے پوری طرح انسان رہنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شکاری بھی ہیں، وراثت بھی، سرکاری افسر بھی اور بڑے زمیندار بھی۔ وہ گھوڑ سوار بھی ہیں اور بازار و شکاریوں کے رسیا بھی۔ غریبوں کے ہمدرد بھی ہیں اور امیروں کے دوست بھی۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو اپنے دکھ درد میں شریک بھی کرتے ہیں۔ وضع داری اور شرافت ان کی زندگی ہے اور دل و دماغ کی دھڑکن روح حیات ہے۔ ۱۹۶۴ء میں جب ہندو مسلم فسادات نے سارے بڑے بڑے کو پاگل کر دیا تھا ان کا دل تعصب و نفرت کے جہنم سے پاک تھا۔ دلی میں رہ کر بیدی صاحب نے جو اس شہر کی خدمت کی اور جس طرح مسلمانوں کو اس نفرت کی آگ سے نکالا وہ مجھ تک قصہ کہانی بن کر پہنچا ہے۔ شاہد احمد دہلوی بھی اس کے

گواہ تھے اور خواجہ حسن نظامی بھی۔ ملاواحدی بھی اور مولانا رازا بخیری بھی۔ اب کوئی نہیں ہے لیکن بیدی صاحب کی انسان دوستی آج بھی چراغ نورانی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر بھی انھوں نے ”یاروں کا جشن“ میں لکھا ہے جس سے اس دور کی بربریت کی ایک تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ میں یہاں ان سب واقعات کا اعادہ تو نہیں کر سکتا لیکن ایک آدھ واقعے کی طرف آپ کی توجہ ضرور دلاؤں گا۔ بیدی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”ہری پور ٹھیکر کا گزردہ ضلع میں ایک جاگیردار کا ٹھکانہ ہے۔ وہاں کے ہسپتال میں ایک مسلمان کمپونڈر تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو اس کے سارے کنبے کو بکرا لیا گیا۔ اس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی اس لڑکی پر ان لوگوں کے درمیان ٹکرا ہو گئی۔ لڑکی نے کہا کہ جس سے آپ کہیں میں شادی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ میرے والدین اور دوسرے کنبے کو حفاظت سے رہو گی کیسب میں پہنچا دیں یہ شرط منظور کر لی گئی اور اس کمپونڈر کو اس کے باقی ماندہ کنبے سمیت رہو گی کیسب میں پہنچا دیا گیا۔ مگر لڑکی کے بارے میں یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس سے کون شادی کرے جب یہ ٹکرا ایک خطرناک جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی تو ایک شخص اٹھا اور تلوار سے لڑکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کہا کہ لو اب سب ایک ایک ٹکڑا ہانت لو۔“

کخور مہندر سنگھ بیدی ساری عمر اسی بربریت، حیوانیت اور ظلم کے خلاف صفت آرا رہے اور یہ کام دہی شخص کر سکتا ہے جو انسانیت پر یقین رکھتا ہو اور حسب سے اس کا دل پاک ہو۔ اس کتاب میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جن سے انسان اپنی زندگی پر نظر ثانی کر سکتا ہے اور بہتر زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھ سکتا ہے۔ ایک بات جس کا ذکر میں ضرور کرنا چاہوں گا وہ جوڑن علی آبادی مرحوم کے سلسلے میں ہے۔ جوڑن نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ جوڑن کو یہاں جو کچھ بھی نقصان پہنچا وہ ان کے ان دوستوں سے پہنچا جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا ”ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا ساتھ کیوں ہو۔“ جوڑن جب آخری بار ہندوستان گئے تو ان کے خلاف یہاں طرح طرح کی خبریں اخباروں میں چھپیں۔ بیدی صاحب ان سب باتوں کے معنی مشاہدہ ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ ”آخری بار جب جوڑن

ہندوستان آئے تو ان کے ایک شاعر دوست، بی ہمراہ تھے۔ وہ سائے کی طرح جوش صاحب کے ساتھ رہتے اور جہاں بھی مشاعروں میں جوش صاحب جاتے وہاں انھیں بھی مدعو کیا جاتا۔ دہلی میں بھی وہ اگر ہونٹل میں جوش صاحب کے ساتھ مقیم رہے۔ میری جانب سے ہر روز جوش صاحب کے لیے ایک بوتل شراب اور موتی محل سے کھانا پہنچ جاتا تھا۔ لیکن جب جوش صاحب مبلغ آباد وغیرہ اپنے احباب سے ملنے گئے تو ان کے شاعر دوست دہلی میں نہیں رہے اور ہر روز شراب کی دوکان سے جوش صاحب کے ہم پر ایک بوتل شراب لاکر بازار میں فروخت کرتے رہے۔ جب دوکان واپس آئے تو اس بات کا پتہ چلا مگر میں نے دیدہ و دانستہ جوش صاحب سے اس کا ذکر نہیں کیا تاکہ دوستوں میں کدورت نہ پیدا ہو جائے۔ اسی دوست نے موقع پا کر بیٹھی میں جوش صاحب کی جیب سے چار ہزار روپے نکال لیے۔ اس پر جوش صاحب نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن جب دہلی واپس گئے تو بھل سیدی لوگ کی منت سماجت کرنے پر اسے معاف کر دیا۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ اس دوست نے جوش صاحب کے احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ بارہ زخمیوں کو مارنے کے فوراً ہی بعد ان سے الگ ہو گیا اور ان کے خلاف حکومت پاکستان سے بے بنیاد اور غلط شکایتیں کیں جن کی بنا پر جوش صاحب کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔

”جہاں تک مجھے علم ہے جوش صاحب کے خلاف جوش شکایتیں کی گئی تھیں ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ انھوں نے بمبئی میں ایک اخبار میں انٹرویو میں پاکستان کے خلاف زہر افکلا۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت موجود تھا اور یہ انٹرویو خطہ انصاری نے سید و بھائی کے گھر پر کیا تھا۔ اس سلسلے میں انٹرویو کے دوران میں جوش صاحب نے ہندوستان سے محبت کا مفروضہ اٹھایا کیا لیکن پاکستان اور پاکستان کی حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ (۱۳۳۶ء) اس سے ساری صورت حال عاف ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک اور واقعہ انھوں نے لکھا ہے کہ ”جب وہ سنگر در کے ٹرپے کھڑے تھے تو جنرل تھما یا گما نڈران چیف وہاں تشریف لائے۔ ضلع والوں نے ان کا شاباشہ استقبال کیا۔ رات کو میرے ہاں کھانا تھا جس میں شمالی ہندوستان کے تمام بڑے فوجی اور سول

اضران موجود تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتے ہوئے سیاست پر تبصرہ شروع ہو گیا۔ جنرل قمرایا نوڈ میں تھے فرمانے لگے کہ ان سیاست دانوں نے اتنے عظیم ملک کا یہ بڑا غرق کھڑا ہے۔ جی چاہتا کہ یہاں فوجی حکومت قائم کر کے مارشل لا لگا دیا جائے تاکہ ملک کو سیاستدانوں کی پیدا کی ہوئی گندگی سے پاک کیا جاسکے اور اگر میں ایسا کرنا چاہوں تو دو گھنٹے میں کر سکتا ہوں لیکن میں نے آئین کی وقار داری کا حلف لیا ہوا ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ سب انکی اس صاف گوئی پر حیران ہوئے۔

اسی طرح بسمل شاہجہان پوری کے بارے میں بھی جنس دل چسپ واقعات کیے ہیں جو آپ کے لیے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ بیدی صاحب نے لکھا ہے کہ "ساحر ہوشیار پوری مجھے اور بسمل صاحب کو علی گڑھ مشاعرہ میں شریک ہونا تھا۔ میں ان دنوں سٹی مجسٹریٹ تھا اور بسمل میرے باڈی گارڈ بھی گن مین لگے ہوئے تھے لیکن اس مشاعرے میں وہ ایک شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے جا رہے تھے۔ یہ طے ہوا کہ سب لوگ میری کونٹری واقع تیس ہزار پر چار بجے شام پہنچ جائیں۔ وہاں سے بھنگوان سنگھ ٹیکسی ڈرائیور کی اسٹیشن دیگن میں ہم سب علی گڑھ کے لیے روانہ ہوں گے۔ بسمل کے علاوہ سب وقت مقررہ پر میرے ہاں پہنچ گئے۔ چونکہ ہم لیٹ ہوتے جا رہے تھے اس لیے بسمل صاحب کے گھر پہنچے جو بارہ ہندو راڈ میں تھا۔ جب ہم ان کی گلی کے سامنے پہنچے تو وہ اپنے مکان کے سامنے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے فوراً گانے کے لیے کہا تو اتنا سے اشارہ کر کے گھر میں داخل ہو گئے اور دس بارہ منٹ کے بعد برآمد ہوئے۔ ہم سب نے لعن طعن کی اور کہا کہ ہم تو پہلے ہی لیٹ ہو چکے تھے آپ نے اور لیٹ کر دیا تو نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ دراصل معاملہ یہ تھا کہ ہر مسلمان شوہر کو فرض ہے کہ اگر شہر سے کہیں باہر سفر پر جائے تو جانے سے پہلے اپنی بیوی کا "حق زوجیت" ادا کر کے جائے۔ ہمیں ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کر کے کہا کہ اگر ایسا ہی تھا تو آپ یہ حق زوجیت پہلے ہی ادا کر دیتے۔ خواہ مخواہ ہمیں لیٹ کر دیا۔ تو فرمانے لگے کہ میری بیوی دوسرے محلے میں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں وہاں سے خاص طور پر

اسی لیے بلوایا کہ وہ حق زوجیت وصول کر لیں لیکن انھوں نے آنے میں دیر کر دی۔ حق زوجیت ادا کرنے میں تو صرف آدھا منٹ لگا باقی وقت غسل کرنے میں لگ گیا۔ تمام راستہ بسمل صاحب سے حق زوجیت کے مسئلے پر مذاق ہوتا رہا۔ وہ مختلف دلائل سے اپنے اس عمل کو جائز بتاتے رہے۔ علی گڑھ تک کا سفر بڑی آسانی سے کٹ گیا۔

غرض کہ یہ ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے جس سے نہ صرف ہمارے ماضی قریب کے حالات پر گہری روشنی پڑتی ہے بلکہ بعض اہم شخصیات سے لگی ہوئی اس طرح متعارف ہوتے ہیں جس طرح ہم اس سے پہلے نہیں کرتے۔

(۱۰ جون ۱۹۸۵ء)



## طنزد مزاح کی شاعری

آج ہم حضرت شہباز امروہوی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ایک خراج عقیدت ہم نے ۱۵ مئی ۱۹۸۳ء کو اس وقت پیش کیا تھا جب ان کی کتاب ”مظہر کی تقریب اجرا کراچی میں ہوئی تھی اور ایک خراج عقیدت ہم آج پیش کر رہے ہیں۔ جب حضرت شہباز اس دنیائے فانی سے لافانی دنیا کے طول طویل سفر پر چلے گئے ہیں۔ اُس سفر پر جو ابد تک جاری رہے گا۔ آدمی چلا جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے اپنے اخلاق، اپنی شرافت اور اپنی تخلیقات کا وہ اعمال نامہ چھوڑ جاتا ہے جس سے ہم اسے تاحیات یاد کرنے رہتے ہیں۔ فروری ۱۹۸۳ء میں جب میرے بزرگ دوست حضرت افسر صدیقی امروہوی اچانک وفات پا گئے تھے اور ان کی میت میرے گھر سے اٹھی تھی تو میں نے ان کی وفات کی جن لوگوں کو خط کے ذریعے اطلاع دی تھی ان میں شہباز امروہوی مرحوم مغفور بھی شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ قریباً امروہو سے ان کا خط آیا تھا اور خط میں نہ صرف تین قطعات تاریخ وفات درج تھے بلکہ افسر صاحب کی وفات پر انتہائی پُر اثر الفاظ میں اظہار غم بھی کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کتاب کی تقریب اجرا کے بعد جب وہ کراچی سے چلے والے تھے تو اصرار کر کے میرے گھر کھائے تھے۔ یہی شعیب احمد عباسی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ بہت دیر بیٹھے رہے اور دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ چلے گئے اور امید تھی کہ سال دو سال میں پھر آئیں گے مگر جون ۱۹۸۵ء میں اب ان کے سفر کا رخ دوسری

سمت مڑ گیا ہے۔ اب ہم منتظری رہیں گے۔ میں بھی اور شعیب احمد عباسی بھی۔ ان کے احباب بھی اور سلسلے اعزہ بھی۔ خدان کی مغفرت فرمائے۔ بحیثیت انسان وہ شریف النفس، وضع دار اور خوش خلق تھے اور بحیثیت شاعر پر اثر، دل چسپ اور منفرد تھے۔ حضرت شہباز کے ساتھ شاعری کا پورا ایک دبستان اُلٹھ گیا جس کے وہ ہمارے دور میں ممتاز نمائندے تھے۔ مردم خیز امروہہ کا سہاگ بھی ان کی وفات سے اُبھ گیا ہے۔ اس وقت وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو خود امروہہ کی پہچان بن گئے تھے۔ اس موقع پر مجھے ان کا قطعہ یاد آ رہا ہے :

بالیقین تاریخ دہراتی ہے خود کو بار بار

شک نہیں اس بات میں واقف ہیں اس سے خاص و عا

کل ال آباد میں امروہہ اکبر کا تھا شور

آج امروہہ میں ہیں مشہور شہباز اور آرم

ذرا غور کیجئے کہنے لوگ ہیں جو حضرت شہباز امروہہ کی طرح اپنے وطن کی پہچان بنے ہیں۔

شہباز صاحب پیدائشی شاعر اور صاحب علم و فضل تھے۔ ساری عمر درس و تدریس

کے شاہی پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۵ء میں بھارت سے محروم ہوئے تو اپنی شاعری کا

رنگ بدل کر مزاجید رنگ اختیار کر لیا۔ اس تبدیلی میں ایک جہانِ حنی پوشیدہ تھا۔ بیٹا بیٹا

ہو جائے تو شدید احساس محرومی کا شکار ہو جاتا ہے کمزور اعصاب کا انسان ہوا تو معاشرہ

سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ حاسد اور مرموم بیزار ہو جاتا ہے۔ باشعور ہوا تو زندہ رہنے کا

نیا سلیقہ پیدا کرتا ہے تاکہ بینائی کے بغیر بھی ہر دل عزیز بن کر سارے معاشرے کی آنکھ کا

تلاش جائے۔ اردو کے نامور شاعر شیخ قلندر بخش جرأت جب تک سواٹھ تھے میزور دہ

اور سواد کے رنگ سخن کے پیرو تھے۔ اندھے ہوئے تو معاند بنی کی شاعری کی طرف آگئے

اور اس میں اپنے دور کی کھنوی تہذیب کے مخصوص رنگ میں ایسی شوخی اور چہچہلاہی سمویا کر

سارے معاشرے نے انھیں سر پر ٹھالیا اور وہ سب کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ شہباز صاحب نے

بھی یہی مثبت رویہ اختیار کیا اور اپنی غزلیہ شاعری سے نہ صرف اپنے شہر کے خاص و عام میں

مقبول ہو گئے بلکہ سداے برصغیر پاک و ہند کے مشاعروں کی موفقی بن گئے۔ ملنے والا ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ شعر سننا تو دل کی کھل تھی اور وہ محفوظ ہوتا۔

شہباز صاحب کی شاعری میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ مزاح نگار تھے۔ ان کے مزاح میں طنز اس طرح شامل ہے جیسے پھول میں خوشبو۔ طنز میں اگر شدت آجائے تو دل آزاری کا سبب ہوتا ہے۔ مزاح میں اگر طنز شامل ہو تو وہ شہد بن جاتا ہے۔ ان کے کلام میں ایسی تازگی و چٹکتی ہے جیسے سورج پھر کے وقت کھلے ہوئے کتاب میں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ محدود نہیں ہے۔ انھوں نے کم و بیش ان تمام معاشرتی مسئلوں پر تبذیر و مداخلت کی ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع بنایا ہے جن سے عظیم کا معاشرہ دوچار ہے۔ حضرت شہباز نے زندگی کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھا اور اپنی نظریۂ شاعری میں اسے چٹکتی و مہارت کے ساتھ پیش کر دیا۔ انھیں زبان و بیان پر آستا و آواز قدرت حاصل تھی۔ فن شاعری پر ان کی گہری نظر تھی۔ صنائع و بدائع کو ایسی خوب صورتی سے برتتے تھے کہ ان کی شاعری پر اثر ہو جاتی تھی۔

کچھ حضرت شہباز ہم سے نہیں ہیں لیکن ان کا کلام ہمیں آج کی طرح کئے والے دور میں بھی محفوظ و سرور کرتا رہے گا۔ یہی انسان کا وہ تخلیقی عمل ہے جو فانی کو لافانی بنا دیتا ہے اور میرا خیال ہے کہ حضرت شہباز کچھ بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

## ماحول اور شاعری: نظر حیدر آبادی

زندگی کے سفر میں جب پہچے ٹرک روکنا ہوں تو بے شمار مناظر اور بے حساب چہرے، کچھ صاف، کچھ دھندلے دھندلے سے نظر آتے ہیں۔ بہت سے چہرے تو اتنی دور ہیں کہ اب صاف نظر بھی نہیں آتے اور بہت سے مناظر ایسے ہیں جو یاد دل کی کپڑاؤں کی فضا میں ایسے چھپ گئے ہیں جیسے بادلوں میں چاند چھپ جاتا ہے۔ بس مدہم مدہم سی روشنی چھن چھن کر چاند کے دھجکا احساس دلاتی ہے۔ زندگی تو مختصر ہے لیکن وقت کی رفتار اتنی تیز ہے کہ جب ذرا ہوش آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزر گیا اور دم بیکر آگے چلنے کا وقت پہنچا۔ اسی لیے کم لوگ ہیں جنہیں پہچے ٹرک روکنے کی مہلت سفر حیات میں میسر آتی ہے۔ یہ ۱۹۵۰ء ہے۔ کراچی جیل کے قریب جمشید روڈ کے آخری ٹکڑے پر حیدر آباد کالونی نئی نئی آباد ہوئی ہے۔ اونچے کار کی شیر و انیاں پہنے ہوئے لوگ اس نئی بستی کی رونق بڑھاتے ہیں۔ نظام دکن کی مملکت ابڑی تو یہ پہلی بستی تھی جو سر زمین پاکستان پر نمودار ہوئی۔ اسی بستی کی گلیوں میں دکن کی عظیم تہذیب کے سپوت اپنی ممتاز اقدار کو سینے سے لگائے اپنے ماضی کی داستان دہرانے میں مصروف ہیں۔ یہیں نوجوان خواجہ معین الدین نظر آ رہے ہیں اور یہیں صدیقی نقوی، حسین احمد اشک، تحسین سرور سی اور نظیر حیدر آبادی نظر آ رہے ہیں۔ گاہے گاہے میر لائق علی اور معین نواز جنگ، شاہد حسین رزاقی کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھیے یہ وحید الدین خان بوزنی ہیں اور یہ جو قرا زیادہ موٹے تازے

اور سرخ و سفید سے نوجوان نظر آ رہے ہیں اور زوردار قہقہہ لگا رہے ہیں ضیاء الدین خان بوزنی ہیں۔ یہ جو بید ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ سڑک کی طرف جا رہے ہیں احمد علیا خان ہیں اور یہ جو چھڑکاؤ کر کے کرسی پر بیٹھے ہیں ڈاکٹر السین زبیری ہیں اور اس طرف جو وہ ہیں وہ پولیس والے فاروقی ہیں اور یہ صاحب جو کتے میں پان دبائے شیروانی پہنے بید لیے سیر کو جا رہے ہیں حیدر آباد دکن کے آئی جی قید خانہ جات ہیں اور یہ جو ایک صاحب پو لے پو لے قدموں سے اونچی ٹرکی ٹوپی پہنے اداھر آ رہے ہیں ریاضی کے استاد اللہ بخش کمالی ہیں۔ یہ کالا کوٹ پہنے جو صاحب جا رہے ہیں عبدالرؤف ایڈووکیٹ ہیں اور عبدالرشید ان کے بھائی ساتھ ہیں۔ یہ جو دائیں طرف کی سہلی گلی میں رہتے ہیں یحییٰ صدیقی ہیں اور یہ جوان کے پاس کھڑے ہیں مہدی علی صدیقی ہیں۔ اور یہ۔ یہ کون ہیں؟ شکل تو جانی پہچانی ہے۔ کسی نے بتایا کہ جناب یامین زبیری ہیں اور یہ جو سہارے سے چل کر گھر کی طرف لوٹ رہے ہیں ع چل خسرو گھر پہنچے سانجھ بھٹی چوندیس۔ برصغیر کے نامور شاعر حضرت اختر حیدر آبادی ہیں کچے کچے مکانات، ٹین کی چادروں سے ڈھکے ہوئے مگر چل چل دلربا یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستی یہاں برسوں سے موجود تھی نئے نئے کھانے کراچی شہر کی زندگی میں داخل ہو کر مقبول ہو رہے ہیں۔ ناشتے میں تھی کھائی جا رہی ہے۔ بھنگا رہے بیگن کی خوشبو سے لگی مہک رہی ہے۔ دھوئوں میں ڈبل کا میٹھا اور خوبانی کا میٹھا بھی ہے اور کچی بریانی بھی۔ طرح طرح کے اجار اور چٹنیاں دسترخوان کی زینت ہیں۔ محلوں میں رہنے والے جب گھلیوں میں آباد ہوتے ہیں تو ان کے وجود سے گھلیاں بھی محل نظر کرنے لگتی ہیں۔ مخصوص دکنی لہجے میں سب اُردو بول رہے ہیں۔ اُردو ان سب کا اور بھنا بھونا ہے۔ ان سب نے بھی اسلام اُردو اور پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ گنوا کر یا مقصد ہجرت کی ہے اور کھٹک ہے کہ اس زندگی سے بہت خوش ہیں۔ خوش اس لیے ہیں کہ اب وہ یہاں اپنے خوابوں کی تعبیر پائیں گے اور پاکستان کو جنت لقمہ بنائیں گے۔ یہی ان کا مقصد حیات ہے۔

معائن کیجیے میں بہت دُور نکل آیا۔ آج تو ہم سب نظر حیدر آبادی کے مجموعہ کلام ”صنعتِ مرگاہ“ کی تقریب اجرا میں جمع ہوئے ہیں۔ لیکن آج یہ پھول بھی یادوں کی گلیاں ہی ہیں تو کھلے ہیں اور نظر حیدر آبادی اسی گلیاں کا ایک ایسا پھول ہے جس کے کلام کی خوشبو سے آج کی محفل مہک رہی ہے۔ نظر حیدر آبادی کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ اس بات کو بھی اب ۲۲ سال ہو گئے ہیں۔ تقریباً ربع صدی۔ لیکن اب بھی ان کا کلام تازگی سے مہک رہا ہے۔ جذبات و احساسات کی سچائی اشعار میں اثر و تاثیر کا رنگ بھر رہا ہے۔

نظر حیدر آبادی کے کلام میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ قطعات بھی ہیں اور رباعیات بھی۔ وہ غزل بھی اچھی کہتے ہیں مکیں بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ایسی نظم جس میں وہ انسان کے مسائل اور عوام کے دکھوں کو بیان کر کے انھیں بیدار کرتے ہیں۔ انھیں نیا شعور دیتے ہیں۔ وہ شعور جس سے سوتا ہوا معاشرہ جاگ اٹھتا ہے اور نئی دنیا آباد ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے میں نظر حیدر آبادی کی شاعری کو مسائل و بیداری شعور کی شاعری کہتا ہوں۔ نظر حیدر آبادی کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ نظر کو اپنے خیالات، جذبات و احساسات کو موزوں لفظوں میں بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں پختگی ہے، قدرت، اظہار ہے، لفظوں کو برتنے کا سلیقہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آج بھی تازہ ہے۔ ان کی شاعری پر اقبال، جوش اور اختر حیدر آبادی کا اثر اس لیے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں، جب نظریں شاعری کا آغاز کیا تھا، برصغیر کی ساری ادبی فضا میں موجود تھا اور شاعری کو ذریعہ پیغام بنانا اس زمانے کا مقبول ترین رجحان تھا۔ نظر کی شاعری بھی اسی رجحان کی حامل ہے۔ اپنی نظم نئے شاعر سے ”میں بھی وہ یہی پیغام دیتے ہیں“

ساز سکوں کو نغمہٗ لطفِ خرام نے

خاموشیوں کو ہر آوازِ ذوقِ کلام سے

اندھوں کو مل ہی جائے گی چشم ہنر شناس  
 دُنیا کو ہر مقام سے اپنا پیام دے  
 ایک اور نظم ”فن کار“ میں بھی نظر ہی کہتے ہیں:

یہاں کے دلوں میں شرار سے نہیں ہیں  
 یہاں کنگا ہوں میں پار سے نہیں ہیں  
 یہاں کی شبوں میں ستار سے نہیں ہیں

چراغ امید سحر کو جلانا

یہی میرا نغمہ یہی میرا گانا

جناب مہدی علی صدیقی نے اپنے ”پیش لفظ“ کے ساتھ نظر حیدر آبادی  
 کے کلام کو ”صفتِ مرثکال“ کے نام سے مرتب کیا ہے اور اسے آپ، آسلانی سے  
 کلیاتِ نظر حیدر آبادی بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۳۴ دھاریج ۶۱۹۸۷)

## تذکرہ سخنوران کا کوری

جب کوئی نئی کتاب وجود میں آتی ہے تو اس سے نکلنے والی شعاعوں سے کائنات کا رنگ بدل جاتا ہے جس معاشرے میں جتنی زیادہ کتابیں وجود میں آتی ہیں اسی لحاظ سے وہ معاشرہ کائنات کے رنگ کو تبدیل کرتا جاتا ہے۔ صرف اسی پرانے سے آپ مختلف معاشروں پر نظر ڈالیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ جن معاشروں میں کثرت سے کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ ان معاشروں کا رنگ ساری زمین پر غالب آ رہا ہے۔ اس کے تہذیب و تمدن سے دنیا منور ہو رہی ہے اور ساری دریافتوں، انکشافات اور ایجادات کے مخارج بھی وہی معاشرے ہیں۔ مسلمانوں نے یادش بخیر جب تہذیب کے نقطہ شروع کو چھوا تو کتاب ہی اس کے شروع کا سبب تھی۔ آج مغرب کمال پر ہے تو اس کی بنیاد بھی کتاب پر قائم ہے۔ کسی معاشرے میں کتاب کا نہ لکھا جانا اس بات کی علامت ہے کہ اس معاشرے کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور اب یہ درخت ہوا کے تیز ہونکے سے زمین پر آ رہے گا۔ کتاب سے معاشرے کے ذہن و شعور کے دریچے کھلے رہتے ہیں اور فکر و خیال کی تازہ ہوا پہنچتی رہتی ہے۔ اندھے معاشرے کتاب کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اسی لیے ایسے معاشرے پتلے گونگے اور پھر پھرے ہو جاتے ہیں۔ جب معاشرہ اندھا، گونگا اور بہرا ہو جائے تو پھر اس کا مستقبل بھی باقی نہیں رہتا۔ آئیے جب مجھے کسی کتاب کی اشاعت کی خبر ملتی ہے تو مجھ میں زندگی کا اس کا گہرا ہوجانا ہے۔ ضرور دی نہیں ہے کہ لکھی جانے والی کتاب میری پسند کے مطابق ہو یا وہ ایسی کتاب ہو جس کے موضوع سے بھی مجھے کوئی دلچسپی ہو۔ مقصد تو یہ ہے کہ کتاب کی اشاعت خود اس بات کی علامت ہے کہ وہ معاشرہ جس میں کتاب لکھی جا رہی ہے زندہ ہے۔



حکیم نثار احمد علوی نے جب ازراؤ کرم اپنی تصنیف مجھے دی تو اسے دیکھ کر مجھے دہشت مسرت ہوئی۔ ایک تو اس لیے کہ انھوں نے پچیس سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے سخن دران کا کوری کے حالات و کلام کو جمع کیا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ اس قسم کی کتابوں اور موضوعات سے مجھے بھی دل چسپی ہے۔ میں نے اس کتاب کو دل چسپی سے پڑھا اور میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے مطالعے سے میرے علم اور میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ حکیم نثار احمد علوی نے مواد کے بکھرے ہوئے مزیوں کو ایسے سلیقے اور خوب صورتی سے پرویا ہے کہ ایک دیکھنے دکھانے کے قابل چن بنگیا ہے۔ یہ ایک ایسا مربوط تذکرہ ہے جس میں خوب بھی ہے اور علم و بیان کی دل کشی بھی۔ اس کتاب کو کہیں سے پڑھئے دلچسپی و ربط، علم اور حسن بیان ہر صفحے پر یکساں طور پر نظر آئے گا اور یہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے جس کی داو و پیچہ بغیر ہم فوجی سرسری گزرد جائیں۔ میں اس بھری محفل میں سخنوران کا کوری جیسی اچھی تصنیف لکھنے پر حکیم نثار علوی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اس کتاب کا اثر ممکن ہے آپ اس وقت محسوس نہ کریں لیکن یہ وہ کتاب ہے جس سے اہل علم و ادب، مورخ، تہذیب و تمدن کے عالم بار بار استفادہ کریں گے۔

بات یہاں تک پہنچی تو ایک بات کا ذکر اور کرتا چلوں اکثر حضرات یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ صاحب کلام ایک پورے سنبھل اور تگ آوارہ کا کوری المرومہ، عالندہ راہبہارا راجستھان پٹالہ افغانستان وغیرہ تو سرحد کے اس پار ہیں آخر اب ان کا تذکرہ لکھنے کی کیا ضرورت اور ان کی تاریخ مرتب کرنے کا کیا محل ہے۔ یہ بات کہنے والے حضرات تاریخ کے دھارے اور اس کے شعور سے خاصی بے خبری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ایک فرد یا پھر بہت سے افراد الگ الگ یا ایک ساتھ جب ہجرت کرتے ہیں تو وہ اپنا ماضی، اپنی روایات، اپنی ذاتی داستانیں اور اپنی علاقائی تاریخ بھی ساتھ لے کر ہجرت کرتے ہیں۔ کوئی فرد ہجرت کرتے وقت اپنے ماضی کو اپنے وجود ذہنی سے کاٹ کر نہیں پھینک سکتا۔ یہ ماضی اس کی زندگی کے تسلسل کا نام ہے اس کے ذہنی و مادی وجود کی بنیاد ہے اس کے سفر حیات کے وہ اہم نقوش اور سنگ پائے میل ہیں جس سے اس کے ذہن کی شکل بنی اور اس کا روپ بکھرا ہے۔ اسی لیے جب میں دیکھتا

ہوں کہ لوگ سڑا مانگ پر زنجیر لگا کر دی اٹلا دھیرہ کی تاریخ اور تذکرے مرتب کر رہے ہیں تو مجھے اس لیے اطمینان ہوتا ہے کہ میری نسل ابھی زمینی طور پر زندہ ہے اور وہ اپنے ماضی کو سمجھنے، اس کا جائزہ لینے اور اپنے حال میں سمجھ کر آئندہ نسلوں تک اپنے ماضی و حال کے شعور کو پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ اگلے والی نسل ماضی کے بغیر دھوری اکھٹولی اور نیم جان نہ رہ جائیں۔ یہ ایک ایسا صحت مند رجحان ہے جس سے ہمارے معاشرے کی نئی اجتماعی نفسیات جنم لے گی۔

سارے برصغیر اور پاکستان آباد ہوا۔ کچھ اس ملک میں سارے برصغیر کے مسلمان موجود ہیں جن کا اپنا ماضی اپنی تاریخ، اپنے کارنامے، اپنی کمزوریاں اور اپنی توانائیاں ہیں۔ اس ملک کی نئی تہذیب کا کافی یا وحدت ملی کو وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی تاریخ کے سارے اوراق مربوط و مربوط ہو کر پاکستان کی کتاب وحدت میں یکجا ہو جائیں جس میں سب رنگ اس طور پر گھل مل کر ایک ہو جائیں کہ ان کے ملنے سے از خود ایک منفرد فطری چمک پیدا ہو جائے۔ یہ کام یقیناً ایک دن میں نہیں ہو سکتا لیکن یہ کام ماضی کو کھنگالنے سے جاری رہ سکتا ہے۔ میرے اور آپ سب کے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ کام بہر حال ہوتا ہے۔ لیکن اس بات کا ایک پہلو اور ہے اور وہ یہ کہ جب گئے والے گئے ہیں تو نئی سر زمین اور نئے وطن کو تجسس و حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی تہذیب و تاریخ اور زبان و معاشرت کے بارے میں علم و آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں یہاں گئے والے یہ کام بھی کر رہے ہیں اور ایسی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور مسلسل لکھی جا رہی ہیں جن کا تعلق پاکستان کے مختلف علاقوں کی تہذیب و تاریخ سے ہے یہ کتابیں نئے وطن کے ماضی کو سمجھنے کی جستجو کا نتیجہ ہیں۔ قائم رہنے والی تہذیبوں اور زندہ قوموں نے یہ کام ہمیشہ نہایت شوق اور تہذیب سے کیا ہے، سخنوران کا کوری بھی اسی تہذیبی عمل کی ایک کڑی ہے اور پاکستان میں اس کتاب کے لکھے جانے کی پہلی مناسبت ہے۔

کا کوری کے نام سے ہم سب واقف ہیں لیکن ہماری یہ واقعیت اس لیے نہیں ہے

کہ اس میں باغات نہایت ہیں یا گندم کی کاشت اچھی ہوتی ہے یا یہاں ترلوز بہت بڑے اور بہت میٹھے ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اس سرزمین کے رہنے والوں نے اپنے قابل فخر کارناموں سے اس کے نام کو وہ شرف بخشا ہے کہ خود کاکوری جو مضافات لکھنؤ کا محرم ایک قصبہ ہے، آج ان کے نام کی وجہ سے دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ شہر آدمیوں سے پہچانے جاتے ہیں اور آدمی شہر سے پہچانے جاتے ہیں۔ اصغر گوندہ سے پہچانے جاتے ہیں اور گوندہ اصغر سے پہچانا جاتا ہے۔ آدمی کا قد جتنا اونچا ہوتا ہے اس لحاظ سے بستی کا قد بھی اونچا ہو جاتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھٹائی پہچان جاتے ہیں اور بھٹا خورشاد شاہ عبداللطیف بھٹائی کی پہچان ہے۔ جب شہر اور آدمی کی شخصیت ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہو جاتی ہے تو پھر آنے والے زمانوں میں انھیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اب تو خیر سے بین الاقوامیت کا زمانہ ہے اس لیے شہر بھی کھو گئے ہیں اور انسان بھی گم ہو گیا ہے۔ دونوں کے قد گھٹ گئے ہیں اور معاشرہ ایک بڑا سا جنگل بن گیا ہے جس میں کوئی ایک دوسرے کو نہیں پہچانتا اور کوئی ایک دوسرے سے محبت و وفا کے رشتے میں پیوست نہیں ہوتا۔ اس لیے اب شہر لوگوں کے ناموں سے کٹ گئے ہیں۔ بستیاں کثرت آبادی کے باوجود آج بھڑک رہی ہیں اور بڑے بڑے شہر آبادی کے گھنے جنگل بن کر دریا بن ہو گئے ہیں۔ دریا ان اس لیے کہ اب یہاں تہذیب و تمدن شرافت و شائستگی، علم و ہنر، فنون و ادب پر دان نہیں چڑھتے بلکہ خود غرضیاں، بے وفائیاں اور جنیتیں تخلیق پکڑ رہی ہیں۔ اب جوش و حشمت کے علاج کے لیے جنگل بازار سے لئے جاتے ہیں۔ نومن خان مومن نے شاید اسی لیے کہا تھا:

کر علاج جوش و حشمت چارہ گر

لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

میں یہاں کاکوریوں کے کارناموں کی فہرست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کاکوری کو شاہ تراب علی کاکوری کے تعلق سے پہچانتا ہوں۔ میں کاکوری کو ایڈیٹر اور دوپٹے منشی سجاد حسین کی وجہ سے جانتا ہوں۔ میں کاکوری کو انور اکبرؒ

کے نام سے پہچانتا ہوں۔ میں کاکوری کو ایڈیٹر الزنا نظر اور منشی امیر احمد علوی کی وجہ سے پہچانتا ہوں۔ یہ وہ نام ہیں جن سے اردو ادب کی تاریخ کبھی مٹنے نہیں ٹوڑ سکتی۔ یہ وہ نام ہیں جو پاکستان اور ہندوستان میں بھی یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جو پاکستان میں ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہیں۔ حکیم نثار احمد علوی نے ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جنہوں نے اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے دائرے میں شعر و ادب کی خدمات انجام دی ہیں۔ اس لیے میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس کتاب کے مطابحہ سے میری آنکھیں روشن ہو گئی ہیں۔

ان سب باتوں کے علاوہ مجھے کاکوری اس لیے بھی پسند ہے کہ وہاں کے باشندوں کو جن سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی میں نے عام طور پر شریف، النفس، خوش ذوق، علم پسند، مہذب، نرم خو، وضعدار اور مخلص پایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کا ہر شخص ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ یہی خوبیاں مجھے اپنے بزرگ دوست سراج احمد علوی اور انوار احمد علوی میں نظر آئیں۔ اور یہی خصوصیات پہلی ملاقات ہی میں میں نے حکیم نثار احمد علوی میں بھی محسوس کیں۔ دروغ پر گردن رادی۔ علم طور پر یہ بات اور نگ زیب عالم گیر سے منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے مضامین لکھنے کے چند قصبوں کے خصائص کا گہرا مطالعہ کر کے انہیں عالم گیر خطا بات سے نوازا تھا اور چونکہ نقل کفر کفر نہ باشد کی بات شرعی اعتبار سے سولہ آنے پاؤ رتی اپنی جگہ درست ہے اس لیے بھی خطا بات کو دہرانے میں مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اور نگ زیب عالم گیر نے دیوانہ شریف کے باشندوں کو مفسدانہ دیوانہ کے خطاب سے نوازا تھا۔ سندیلہ شریف کے لوگوں کو حاسدانہ سندیلہ کا خطاب دیا تھا۔ کرسی شریف کے لوگوں کو احمقانہ کرسی اور کاکوری شریف کے لوگوں کو مدغیانہ کاکوری کے خطاب سے عالیہ سے نوازا کہ کرم و عنایات کی بارش کی تھی۔

خواجہین و حضرات اسب قصبوں کے لیے شریف کا لفظ میں نے اس لیے عمداً استعمال کیا ہے کہ میرے لیے تو سب ہی شریف ہیں۔ جی تو یہ بھی چاہتا تھا کہ میں خود کو بھی لگے ہاتھ شریف کہوں، لیکن تامل اس لیے ہے کہ مخالفت آرٹے آتی ہے اور جیسا

کہ آپ جانتے ہیں، اپنے منہ میں مٹھو بیٹا شرافت سے بعید ہے لیکن حسن اتفاق سے چونکہ میں کسی منہ، حاسد یا احمق کو ذاتی طور پر نہیں جانتا اور میرا واسطہ صرف ان لوگوں سے ہی پڑا ہے اور اس واسطے کو بھی برسوں ہو گئے، اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی ہلک نہیں ہے کہ اگر مدت ایسے ہوتے ہیں تو خدا سب کو مدت کر دے۔ پاکستان کا مستقبل انشاء اللہ تعالیٰ محفوظ ہی محفوظ ہے۔ کاکوری کے لوگوں کی شرافت و بے نیازی، لیے دیے رہنے کی صفت، ان کی درویشی اور قلندریت، ان کا خلوص و شریف النفسی وہ اعلیٰ و ارفع صفات ہیں جو مجھے انہیں چاہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ تیسرے خانہ پر شعر محمد تقی ان کا کوری کے لیے ہی کہا تھا:

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی  
تجھے تیر سمجھا ہے یاں کم کس نے

آخر میں صرف ایک بات کی طرف حکیم نثار احمد علوی کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اپنی کتاب سخنوران کا کوری کی جو فہرست مندرجات بتائی ہے اس میں والد محترم کے رکھے ہوئے ناموں سے ناموں کو باعتبار حذف تہجی مرتب کیا ہے۔ حالانکہ سخنور اپنے اصلی نام سے زیادہ اپنے تخلص سے سچا نا جاتا ہے، اس میں قباحت یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ تخلص کے ساتھ اس شاعر کا اصلی نام بھی آپ کو یاد ہو اگر ایسا نہیں ہے تو پھر پوری فہرست کے ایک ایک اندراج کو ٹوٹنا پڑے گا مثلاً اگر مجھے مصحفی کے شاگرد ارشد مسرود کے حالات دیکھنے ہیں تو میں اس نام کو اس وقت تک فہرست میں تلاش نہیں کر سکتا، جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ مسرود تخلص شاعر کا نام پیر بخش تھا۔ شہرت کے ساتھ پیر بخش ہیچے چلے گئے اور مسرود نے ان کی جگہ لے لی نا امید ہے آئندہ ایڈیشن میں موصوف اس ترتیب کو بدل دیں گے یا پھر آخر میں ایک اشاریہ شامل کر دیں گے جو ایسی کتابوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ دوسری گزارش یہ ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں کنایات بھی شامل کر دیں گے جس کا ذکر خود انھوں نے آغاز میں کیا ہے۔

## معاصر شعراء کا تذکرہ : سخن ور

سلطان مہر ہمارے ملک کی نامور صحافی، معروف افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعرہ ہیں۔ ان کی ذات میں صحافت، افسانہ نگاری، ناول نویسی اور شاعری کے وہ اوصاف یکجا جو گئے ہیں جو دوسروں میں الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ وہ برسوں تک روزنامہ "جنگ" کا صفحہ خواتین مرتب کرتی رہی ہیں اب تک ان کے چار ناول — "دارِ دل"، "تاجوراک کرن اُجالے کی"، "جب ہنسنت رُت آئی"، شائع ہو چکے ہیں۔ انساؤں کا ایک مجموعہ "بند سپہاں" کے نام سے ۶۱۹، ۶۲۰ میں شائع ہو چکا ہے۔ "آج کی شاعرات" اور "اقبال دو بر جدید کی آواز" ان کی دو مرتب کی ہوئی کتابیں ہیں۔ ان کی تازہ ترین تالیف "سخن ور" ہے جس میں سلطان مہر نے عہد حاضر کے شاعروں کے انٹرویو اس طور پر مرتب کیے ہیں کہ یہ کتاب جدید شاعروں کا ایک تذکرہ بن گئی ہے جس میں ہر شاعر کے بارے میں مفید معلومات بھی درج ہیں اور اس کا نقطہ نظر بھی۔ اس اعتبار سے یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ سلطان مہر ایک سلیقہ مند باہمت اور باعمل خاتون ہیں اور سلیقہ و عمل ان کی وہ خوبیاں ہیں جو ان کی ساری ذہنی و مادی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ یہی سلیقہ ان کی اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بعض ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو ہمارے لیے نئی اور دل چسپ ہیں مثلاً جب کے میں نے شعور کی آنکھ کھولی تھی دیکھا کہ سید ذوالفقار علی بھٹاری کے سر کے بال چاندی کی طرح سفید ہیں۔ ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے ہم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ بال یا تو نزلے کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں یا کراچی کی آلودگی نے سفید کر دیئے ہیں یا بخاری صاحب سفید خٹا۔

استعمال کرتے ہیں اور اگر یہ سب باتیں غلط ہیں تو پھر بخاری صاحب نے یہ بال یقیناً و صوب  
میں سفید کیے ہیں لیکن سلطان مہر کی تالیف ”سفر“ پڑھ کر معلوم ہوا کہ ہماری یہ قیاس کرنا  
غلط تھیں۔ اس کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ ۶۳۷ء میں ہجرت کے دوران ان کا سامان تلف ہو گیا  
اور ان کی کتابیں بھی۔ کتابوں کے تلف ہونے کا بخاری صاحب کو اتنا صدمہ ہوا کہ ان کے  
بال سفید ہوئے شروع ہو گئے (ص ۴۹) اسی طرح پہلے مشہور رشاد جناب تائیں دہلوی علی موجود  
بیوی کے بارے میں یہ دل چسپ معلومات فراہم کی ہیں کہ وہ مرزا غالب کی بھانجی ہیں اور ان  
کے نانا کے مکان ہی میں مرزا غالب رہا کرتے تھے۔ اتفاق سے وہ بھی غالب کے ہم نام تھے اور  
مرزا نوشہ کہلاتے تھے (ص ۶۰) حضرت رئیس امر دہلوی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اب تک  
کئی لاکھ شعر کہہ چکے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں لکھنوی کہلاتے ہیں (ص ۶۰) اور یہ بھی بتایا  
ہے کہ رئیس صاحب کو نوگ کی دھلی دال جس میں پالک کا ساگ ڈال گیا ہوا اور قیہ پسند  
ہیں۔ ویسے کوئی امرار کرے تو کوڑے اور وہی کے رشتے کے ساتھ پلاؤ بھی کھلیتے ہیں۔  
(ص ۱۶۱)۔

ایک اور شاعر کے بارے میں بتایا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک طالب  
علم نے اپنی فارسی نظم اس وقت کے وائس چانسلر سر شاہ سلیمان کو سنائی تو وہ بہت خوش  
ہوئے اور کہا: ”کتنا شور ہے اس نظم میں!“ اس کے بعد سے منظور حسین نے اپنا تخلص شور رکھ  
لیا۔ (ص ۲۱۰) اور آج بھی پروفیسر منظور حسین شور اردو کے نامور شاعر ہیں۔ عندلیب شادانی  
کے بارے میں سلطان مہر نے بتایا ہے کہ ”نطف کی بات یہ ہے کہ خشک اور بے مزہ کتابیں ہی  
وہ بڑے انہماک سے پڑھ لیتے ہیں“ (ص ۲۸۹) محترم احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں  
لکھا ہے کہ ”بچپن سے ہی ان پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی اور مطالعے کے انتخاب میں بڑوں کی  
پیروی کرتے تھے۔ یہ اسی سنجیدگی کا نتیجہ ہے کہ جب مولانا محمد علی کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس  
موقع پر ایک نظم کہی“ (ص ۲۹۵) قتیل شفائی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ  
”انھیں شروع کا قورہ کھڑے مسالے کا سالن، سرسوں کا ساگ، رنگولی ہریالی، ہلائی کے  
پانچے پسند ہیں“ (ص ۳۲۲) ان کھاؤں کے ہم نشین کبھی ہمارے نسخہ میں پانی بھر آیا

وہاں یہ عجیب و غریب بات بھی قاتل صاحب کے سننے میں آئی کہ ”ہندی محروں میں بہت تنوع ہے۔ ہندی شاعری میں اردو کے مقابلے میں کئی گنا ایسی بحرین موجود ہیں“ (ص ۲۲۳)۔

سلطان مہر صاحب نے ایک اور ایسی بات ہمیں بتائی ہے جس پر سارے اہل علم اور موصنفین کو فوراً توجہ دینی چاہیے اور اس عظیم و خیرے کو محفوظ کر لینا چاہیے اور وہ بات یہ ہے کہ احسان دانش کے پاس خطوط کا ایک اچھا ذخیرہ ہے۔ اگر ان خطوط کو شائع کر دیا جائے تو برصغیر کی تاریخ از سر نو لکھی نہ رہے گی: (ص ۲۰) حفیظ ہوشیار پوری کے بارے میں کھلبے کہ جب وہ انٹر کے طالب علم تھے تو ایک جلوس کی قیادت کی اور ایک جرسنی نظم پڑھی جس پر ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا لیکن بزرگوں کا اثر و رسوخ کام آگیا اور معاملہ دب گیا۔ اس طرح برصغیر ایک بڑے انقلابی سے محروم ہو گیا ہے: (ص ۱۹) حفیظ ہوشیار پوری ہمارے اعلیٰ درجے کے غزل گو تھے لیکن ان کے انقلابی ہونے کے امکانات پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

بھر اس کتاب کے مطالعے سے بعض اور بھی دل چسپ باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً حسرت موہانی کے بارے میں سلطان مہر نے کھلبے کہ انھوں نے شاعرے میں اپنی غزل کا مطلع پڑھا تو سامنے بیٹھے ہوئے کسی صاحب نے زور سے کہا ”حضور پھر عنایت ہو“ مولانا رک گئے۔ دو دنوں ہاتھوں سے اپنی عینک سرکائی اور عینک کے اوپر سے گھورتے ہوئے فرمایا۔ ”کوئی ضرورت نہیں“۔

جمیل الدین عالی کے بارے میں جہاں بہت سی معلومات فراہم کی ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ جمیل الدین عالی پہلے ایشیائی ادیب ہیں جنہیں نوبل فاؤنڈیشن نے انعام ملے بغیر تقسیم انعام میں جہان کے طور پر شریک کیا۔ لوگ کہتے ہیں ادب پر پوری توجہ دیں تو کیا پتا ایک دن نوبل انعام بھی لے کر دکھا دیں لیکن یہ نذا دھر پوری توجہ دے دے رہے ہیں مذاب اس کا اسکان باقی رہ گیا ہے۔ بہر حال ۱۹۶۰ء کے پریس ایک پکڑ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا (ص ۲۶۸، ۲۶۹)

استاد قمر جلالوی مرحوم کے بارے میں بتایا ہے کہ انھوں نے سلطان مہر کو صحیح کہا



سکھایا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں علم بدیع میں سجع اس عبارت کو کہتے ہیں جس کے فقروں کے آخری کلمات قافیہ رکھتے ہوں یا بصورت قافیہ واقع ہوں یا نظم یا نثر میں وہ فقر جس میں کسی حرف ان کا نام اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس سے کچھ اور معانی بھی ظاہر ہوں مثلاً ہمارے مشہور شاعر جعفر زٹلی نے محمد اشرف نامی کسی شخص کا بڑا خوب صورت سجع لکھا۔ محمد اشرف پیغمبر ان است۔ ایسے خوب صورت سجع کے ہر جملہ حبیب محمد اشرف نے انتقادات نہ کیا تو جعفر زٹلی نے دوسرا مصرعہ یہ لگایا ہے۔ نہ ایں اشرف کہ مردود نہ مان است۔ سجع کا رواج اب تو نہیں رہا لیکن یہ شاعری کا ایک دل چسپ استعمال تھا۔ استاد قمر جلالوی نے سلطانہ مہر کو سجع کا فن سکھاتے ہوئے ان کے لیے یہ سجع کہا ہے۔

ترے رُخ کے نہ مقابل ہوا سلطانہ مہر

میں نے اس کتاب کو دل چسپی سے پڑھا اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے دل چسپی سے پڑھیں گے لیکن ایک بات کی طرف میں سلطانہ مہر صاحبہ کی توجہ ضرور مبذول کرادوں جو کہ کتاب کی ستم ظریفی کی وجہ سے کتاب کو متاثر کر رہی ہے۔ مثلاً جہاں کاتب نے عبدالباری آسی کو عاصی لکھ دیا ہے، 'افقر نو بانی کو' آخر لکھ دیا ہے (ص ۶۰) وہاں سنین کی کتابت میں بھی بعض غلطیاں کر دی ہیں مثلاً ص ۹۷ پر جوش کمال ولادت ۱۸۹۲ء درج ہے اور ص ۱۰۴ پر ۱۸۹۸ء درج ہے۔ ص ۱۱۴ پر لکھا ہے کہ حفیظ جالندھری ۱۸۹۹ء میں ہندوستان گئے۔ ص ۲۸۵ پر عندلیب شادانی کا سال ولادت ۱۹۱۳ء درج ہے اور ص ۲۸۷ پر ۱۹۰۴ء درج ہے۔ منظر صدیقی کے بارے میں ص ۳۸۵ پر کاتب نے یہ ستم ڈھایا کہ لکھ دیا کہ منظر صدیقی کا انتقال ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو کراچی میں ہوا اسی طرح ناصر کاظمی کا سال پیدائش ۱۹۲۵ء ہے۔ کاتب نے لکھ دیا ہے کہ یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے لاہور کے اسلامیہ کالج میں مشاعرہ تھا (ص ۳۸۸) گویا ناصر کاظمی اپنی پیدائش سے ایک سال پہلے مشاعرہ میں شریک ہو گئے۔ یہ سنین اور املا سلطانہ مہر صاحبہ فرزدہ درست کرادیں۔

ایک بات میں اس سلسلے میں اور کہتا چلوں کہ استاد قمر جلالوی کی شاعری کے بارے میں سلطانہ مہر صاحبہ کی رائے نہ صرف مبالغہ آمیز ہے بلکہ اس لیے نادرست بھی ہے کہ میر تقی میر اور قمر جلالوی کا رنگ و سخن مزاجاً مختلف ہے۔ سلطانہ مہر صاحبہ نے جو یہ لکھا ہے کہ "یہ کہنا غلط ہے" گا کہ استاد قمر جلالوی میر تقی میر کے دبستان کے آخری شاعر تھے۔ انھیں اپنی زندگی ہی میں میر ثانی کا لقب مل گیا تھا۔ (ص ۳۳۲) اسی لیے درست نہیں ہے۔

(۲۱ جولائی ۱۹۶۱ء)

## تذکرہ ماثر الکرام

کتابوں کی تقریبِ روزنامی ایک عام سی بات ہو گئی ہے۔ لکھنے والے کتابیں لکھتے ہیں اور پڑھنے والے انھیں پڑھتے ہیں۔ یہ پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے لیکن تیز رفتاری کے اس دور میں یہ بھی ضروری ہے کہ پڑھنے والوں تک اشاعتِ کتاب کی اطلاع جلد سے جلد پہنچ جائے۔ تقریبِ روزنامی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس عمل میں اس لیے کبھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ لکھنے والے کی اس موقع پر اتنی حوصلہ افزائی ضرور ہوجاتی ہے کہ اس میں مزید کام کرنے کا حوصلہ زندہ و باقی رہتا ہے۔ کتاب لکھنے کے لیے خصوصاً اور زندگی کے دوسرے اور کام کرنے کے لیے عموماً حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اتنی حوصلہ افزائی کہ کام کی معنویت کا احساس لکھنے والے میں باقی رہے۔ ورنہ یہ کہی ہوا ہے کہ کسی نئے لکھنے والے کی اتنی زیادہ حوصلہ افزائی ہو گئی کہ اس کے ذہن کا ارتقائی تخلیقی عمل رگ گیا اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے یا جو کچھ وہ لکھ چکا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی نئے لکھنے والے کو اس کے ابتدائی زمانے ہی میں اتنی شہرت کا بندوبست کر دیکھیے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو اس ادیب کو زندہ دفن کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔ بہر حال میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تقریبِ روزنامی کوئی ایسی بری بات نہیں ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔ مخالفت کی بات میں نے اس لیے کہی کہ اکثر اخباروں یا رسالوں میں بعض لکھنے والے اس عمل کو سرے سے برا سمجھتے ہیں۔

ماثر الکرام، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میر غلام علی آزاد بلگرامی کا وہ تذکرہ ہے

جو بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ آزاد بلگرامی جن کی وفات ۵ اکتوبر ۱۷۸۷ء کو ہوئی اور جسے اب دو سال کم دو سو سال ہو گئے ہیں، اپنے وقت کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے جن کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ انھوں نے کئی تذکرے لکھے جن میں روضۃ الاولیاء خلد آباد کے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے اور مستند ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ربیعہ فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔ مراد آبادی شعر کا تذکرہ ہے جس میں ۱۳۳ فارسی گو شعراء ہیں اور ۸ بھاکا کے شاعر ہیں۔ خزائنہ عامرہ ان شعراء کا تذکرہ ہے جو امراتہ، نوابین اور بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ رہے۔ اس میں ۱۳۵ شعراء کا تذکرہ ہے جو ایران اور برصغیر کے مختلف درباروں سے وابستہ رہے۔ مائثر الکرام میں علامہ آزاد بلگرامی نے علماء و فضلاء، صوفیاء اور مشائخوں کے حالات درج کیے ہیں۔ ان تذکروں کو مرتب کرنے کے سلسلے میں آزاد بلگرامی نے اس سارے مواد کو کھنگالنا جو مستند حالات کے لیے ضروری تھا۔ مائثر الکرام دو فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں ۸۰ صوفیہ کا ذکر ہے۔ ان میں سے ۶۱ خطہ بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خاقان ہیں اور بقیہ ۱۹ دوسرے خطوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری فصل میں ۷۳ علماء کا تذکرہ ہے۔ تیس بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں محل شہباز قلندر کا تذکرہ بھی درج ہے۔ یہ سب تذکرے جن میں مائثر الکرام بھی شامل ہے، فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

اس دور میں محب فارسی کا رواج کم سے کم تر ہوتا تھا بلکہ فارسی کتابوں سے استفادہ بھی مشکل ہوتا تھا بلکہ اس طرح بنیادی ماخذ کے دروازے ہم پر بند ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے اور خصوصاً اہل تحقیق و صاحبان علم کے لیے کہ وہ فارسی زبان کو سیکھیں تاکہ ہمارا ماضی اور اس کے بنیادی ماخذ ہمارے لیے زندہ رہیں۔ وہ قومیں جو اپنے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہیں بے اصل اور بے بنیاد بن کر رہ جاتی ہیں۔ فارسی کے سلسلے میں آج یہ سوال ہمارے مستقبل کے دروازے پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ اس صورت حال میں ایک مل تو یہ ہے کہ ہمارے کچھ والے

فارسی زبان سیکھیں۔ دوسرا اصل یہ ہے کہ اپنے بنیادی مآخذ کے مستند اردو تراجم کیے جائیں لیکن یہ بہت دشوار کام ہے اور اس دشواری کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے کسی دوسری زبان سے اپنی زبان میں ترجمے کا کام کیا ہے۔ اسی لیے مستند علما اپنی کتابوں میں ترجموں کے حوالے یا اقتباسات نہیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ محقق نے اصل کتاب کو اسی زبان میں پڑھا ہو جس میں وہ لکھی گئی ہے تاکہ تحقیق کے سلسلے میں کوئی غلطی پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن آج کے دور میں یہی غنیمت ہے کہ فارسی کتب کے زیادہ سے زیادہ ترجمے کیے جائیں اور یقیناً یہ خوشی کی بات ہے کہ مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری صاحب نے مآثر الکرام کا ذکر ترجمہ کیا بلکہ ایسا اچھا ترجمہ کیا جو مجلس رواں ہونے کے ساتھ ساتھ اصل فارسی متن سے نہایت قریب ہے۔ یہ بہت مشکل کام تھا جسے فاخری صاحب نے سلیقے کے ساتھ انجام دیا ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی کے دوسرے تذکرے بھی ان کی توجہ کے محتاج ہیں۔ اسی طرح بہت سی تصوف کی کتابیں مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ان کے تراجم کی بھی ضرورت ہے۔ خواجہ میر درد کی عظیم۔ علم الکتاب بھی مستند اردو ترجمے کی منتظر ہے۔ ہم خواجہ میر درد کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن انہوں نے علم الکتاب میں فلسفہ تصوف میں جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا امتزاج کیا ہے، اس سے ناواقف ہیں۔ علم الکتاب تصوف کی عظیم کتاب ہے اور مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری سے کہہ رہی ہے خدا کون ہوتا ہے حریف سے مراد لکن عشق

## دیوانِ غالب کا پنجابی ترجمہ

غالب اور دیوانِ غالب ہماری قومی میراث ہیں۔ ایسی گراں مایہ قومی میراث جس میں برصغیر کی مسلم تہذیب کی روح اپنے حسن و جمال کے ساتھ، تنوع و توحید کی طرح، ہم سے کلام کرتی ہے اور روح کو تازہ دم کر دیتی ہے۔ امیرِ غالب صاحب نے اس روح کو منظوم ترجمہ کے ذریعے اس طور پر پنجاب کے سلسلے میں ڈھالا ہے کہ ہماری قومی میراث اپنے حسن و جمال، لطافت و خیال اور وسعت و بیان کے ساتھ آئینہ خاندانِ اعلیٰ میں منعکس ہوئی ہے۔ یہاں میں ایک سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ آخر پنجابی زبان میں غالب جیسے مشکل گو عظیم شاعر کی روح شاعری کیوں اور کیسے حلوں کر گئی۔ اس کا جواب چونکہ بہت آسان ہے اسی لیے شاید ہماری نغروں سے او بھل ہے، اردو زبان اور پنجابی زبان برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ایک دوسرے سے قریب تر رہی ہیں۔ قدیم اردو کے ارباب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اردو زبان کی تشکیل کے دور میں ہی پنجابی زبان اس کی تعمیر و تشکیل میں مسلسل شریک رہی ہے۔ دونوں زبانوں کے کئی ایات، اشارات، علامات، رمزیات، استعارات اور تلمیحات کم و بیش ایک جیسے ہیں۔ دونوں زبانوں کا ذخیرہ الفاظ بڑی حد تک مشترک رہا ہے۔ دونوں زبانوں میں ہندو ترک کیب کا خزانہ بھی ایک اور یکساں رہا ہے۔ اردو زبان نے صدیوں کے سفر میں جس ترکیبِ نحوی کی پرورش کی ہے اس ترکیبِ نحوی کو پنجابی زبان نے ہمیشہ قبول کر کے اپنی ترکیبِ نحوی کو اسی سلسلے میں ڈھالا ہے۔ تصوف کی روایت اور اس کے مابعد الطبیعیاتی نکات دونوں میں یکساں ہیں اسی لیے شاہ حسین، سلطان باجوہ اور

میر تقی شاہ اردو اور پنجابی ہی کے نہیں بلکہ سارے پاکستان کا مشترک سرمایہ ہیں اور تقی شاہ تو میرا وہ محبوب شاعر ہے کہ میں ان کے کلام کے مختلف نسخے اسی طرح جمع کرتا ہوں جس طرح دیوان غالب کے مختلف مطبوعہ قلمی نسخے جمع کرتا ہوں۔ پنجابی اور اردو دونوں کا رسم الخط بھی ایک ہے اور دونوں زبانوں پر فارسی و عربی الفاظ کے گہرے اثرات ترسے ہوئے ہیں۔ پنجابی ہمیشہ سے فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے۔ خوشونت سنگھ نے اپنی کتاب ”وی سیکس“ اور جان گلارک اگرچہ لے اپنی کتاب ”دی سیکس“ میں لکھا ہے سنگھوں کے دوسرے گروا نگہ (۱۵۰۳-۱۵۵۶) نے جب سکھ مذہب کو اسلام سے دور ہٹانے کی کوششوں کا آغاز کیا تو گروا نگہ نے فارسی عربی رسم الخط کو ترک کر دیا اور شمالی ہندوستان کے کئی رسم الخطوں کے عناصر کو ملا کر ایک نیا رسم الخط گورکھی کے نام سے ایجاد کیا، لیکن پنجاب کے مسلمان ہمیشہ کی طرح فارسی عربی رسم الخط ہی میں پنجابی لکھتے رہے۔ اسی رسم الخط اور مشترک تہذیبی روایت کی وجہ سے اردو و پنجابی اپنی ترکیبِ نحوی اور جملوں کی نحوی ساخت کے اعتبار سے قریب تر ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں۔ اہل پنجاب نے چونکہ اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار اردو زبان میں کیا بلکہ اردو بکھا جانے کے جیسے انیسویں صدی اردو کے تعلق سے وہی دلکھتو کی صدی ہے اسی طرح بیسویں صدی ہندیا کے ساتھ پنجاب کی صدی ہے اور پنجاب کے محاورے کہاوتیں اور مزمرہ الفاظ اچھے اور تہذیبی صورتیں اردو زبان کا حصہ بن کر قومی سطح پر عام و مروج ہو گئی ہیں اور یہی وہ تہذیبی پس منظر اور ترکیبِ نحوی کی یکسانیت ہے کہ جس کے باعث دیوان غالب کو امیرِ عابد صاحب کامیابی و فنی اثر کے ساتھ پنجابی کا حامی پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ترکیبِ نحوی اردو اور پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی مماثل اور قریب ہے۔ اسی ترکیبِ نحوی، رسم الخط، روایتِ تصوف و اسلام اور یکساں تہذیبی ارتقا کی وجہ سے اردو زبان جتنی بیان و اظہار کے سانچے وضع کر کے ترقی کرتی ہے اسی حساب سے پاکستان کی دوسری ساری زبانیں بھی ترقی کرتی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خواہ پنجابی، ہندکو، سرائیکی، پشتو، بلوچ، سندھی، گجراتی، کشمیری، شنا و غیرہ زبانیں ہوں ان سب نے کمزادی کے بعد ۱۹۴۷ء سے جو ترقی کی ہے اس سے پہلے نہیں کی تھی۔

اردو کا پاکستان کی ساری زبانوں سے یہ اصل رشتہ ہے اور یہ رشتہ انگریزی زبان سے ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ زبان کے اس فطری استخراج کے باوجود انگریزی نے جس طرح ہمارے معاشرے پر قبضہ کر رکھا ہے اس سے نتیجتاً خواص و عوام الگ الگ ہو کر ہر روز طلوع آفتاب کے ساتھ ایک دوسرے سے دُور سے دُور ہوتے جا رہے ہیں اور اس طرح انگریزی زبان کا بااختیار رواج، متجاسس قوم بننے کے ہمارے فطری عمل کو روک کر انتشار و تعصب کے عمل کو تیز سے تیز کر رہا ہے۔ انگریزی زبان سیکھنا، اس پر قدرت حاصل کرنا ایک بات ہے اور اسے اڑھٹنا، کھونا بنانا جیسا ہم نے بنا رکھا ہے ایک بالکل مختلف بات ہے۔ میں کہتا رہا ہوں کہ انگریزی سیکھیے اور خوب سیکھیے۔ اس پر پورا عبور حاصل کیجیے۔ اس کے ذریعے علوم حاصل کیجیے لیکن خدا را اسے اپنی تہذیب بنانے کی کوشش نہ کیجیے ورنہ ہم اسی طرح منتشر اور بکھرے بکھرے رہیں گے۔ انگریزی زبان اور تہذیب نے ہیں اپنی تہذیبی روایت سے دور کر کے ہمیں ایک دوسرے کے لیے جہنمی بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ساری خدا داد صلاحیتوں کے باوجود ہم اپنی فطری تخلیقی صلاحیتوں کو اب تک بروئے کار نہیں لاسکے ہیں اور اس صورت حال میں جس سے ہم گذشتہ ۴۶ سال سے دوچار ہیں، ہم اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا بھی نہیں سکتے۔ اسی لیے ہمارا معاشرہ اول درجہ کے موجد، سائنس دان، محقق و غیرہ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ عوام کو جب تک ہم اپنے معاشرے کے بڑے دھارے میں شریک نہیں کریں گے اور خواص کا محدود طبقہ عوام کی غالب اکثریت کا تہذیبی و معاشی سطح پر استحصال کرتا رہے گا یہ صورت نہ صرف برقرار رہے گی بلکہ روز بروز پرآگندہ تر ہوتی چلے گی۔



# نظیر خوانی

آپ نے اب تک قرآن خوانی، روضہ خوانی اور قصیدہ خوانی وغیرہ کی ترکیب تو سنی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان مجلسوں میں شرکت بھی کی ہے لیکن نظیر خوانی کی محفل پہلی بار سجائی گئی ہے اور اس کا سہرا "اہل سلسلہ" کے سر جاتا ہے۔ کئی سال پہلے کی بات ہے کہ مختار زمن صاحب، بھائی سلمیٰ اور بڑے بھائی ابوالفضل صدیقی صاحب اور میں اکثر اوقات کوئل میٹھے اور تونیا زماٹے کی باتیں کرتے۔ ابھی بھی بُری ہی۔ پاک بھی ناپاک بھی لیکن دل کی صفائی کا ہمیشہ خیال رکھتے، اور جنبیل کی تہک سے لبریز لب سوز چینی چائے پیئے جاتے۔ غالباً باتوں کا روحانی تعلق کسی نہ کسی قسم کے مشروب سے ہوتا ہے۔ یہ مشروب خواہ مشرقی کا ہو یا مغرب کا۔ محفل جب ہی جمتی ہے جب مشروب سامنے ہو اور باتوں کی خوشبوئوں سے فضا تہک رہی ہو۔ ایک ایسی ہی رات تھی۔ کراچی کا موسم ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا تھا اور جھاوٹوں نے سردی کو اچھی طرح جھرا دیا تھا کہ باتوں باتوں میں نظیر اکبر آبادی کا ذکر آ گیا۔ میں نے زمن صاحب سے کہا کہ اگر کلیات نظیر ہو تو نظیر اکبر آبادی کی نظم "جاڑے کی بہاریں" پڑھی جائے۔ زمن صاحب جھٹ پٹ اندر گئے اور پلک جھپکتے میں کلیات کے ساتھ واپس آ گئے۔ زمن صاحب، خدا انھیں عفو فرمائے، بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ محفلوں کی رونق۔ زندہ دلی کی تجسیم، یاروں کے یار، صاحب قلم لیکن بے سیف، جہاں جائیں محفل کو معطران زار بنادیں۔ اس دور حشر زمین کو سارا معطرہ نفسا نفسی کا شکار ہے، ایسا مقبول بندہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ سلسلے کی گرمی اور اہل سلسلہ کی جان۔ کتے ہی ورق گروانی شروع کر دی اور

نظیر کی نظم پڑھنے لگے۔

دل ٹھوکر مار چھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی  
خمر خمر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی تیشی

ہو شور پھر ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی  
سکتے پر کٹا گنگ گنگ کر چلتی ہو منہ میں پکتی سی  
ہر دانت چنے سے دکتا ہو تب دیکھ بہا رہی جاٹے کی

جب ایسی سردی ہو اسے دل تب زور مزے کی گھاتیں ہوں  
کچھ نرم بچھونے محفل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں  
محبوب محلے سے پٹا ہو اور کہنی چٹکی لاتیں ہوں

کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں  
دل میٹھ و طرب میں ہلتا ہو تب دیکھ بہا رہی جاٹے کی

جب نظم ختم ہوئی تو سب نے زور دار قبضہ لگایا اور مسرتوں کی نسیم سحر سے دل کی بند  
کلی کھل اٹھی اور ساری فضا میں شامۃ العین کی گہری خوشبو پھیل گئی بہت دیر نظیر کو اپنی  
کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی اور باتوں باتوں میں یہ طے پایا کہ ایک ایسی محفل آراستہ  
کی جائے جس میں ہر فن کلام نظیر پڑھا جائے اور اسے نظیر خوانی کا نام دیا جائے۔ کوٹے

چھٹے کی باتیں درمیان میں آئیں۔ نغموں اور گانوں کی باتیں ہوئیں۔ اُنی نقیروں کی دھنیں  
زیر بحث آئیں جو نور ظہور کے تار کے مخصوص دھنوں میں کلام نظیر گاتے ہوئے گزرتے تھے  
اور جن کی لے ولوں کے نہیں خانوں میں اگر کر روح میں پرست ہو جاتی تھیں۔ پھر ان  
دھنوں کے گانے والے تلاش کیے گئے مگر اسی تلاش بے معاش میں زمن صاحب  
اسلام آباد چلے گئے اور ان کے بغیر میں، بھائی سلی اور ابو الفضل صدیقی بے ہوا کا خبارہ  
میں کر رہ گئے۔ برسوں بعد جب زمن صاحب کراچی آئے تو نظیر خوانی کی بھوک ایک بار  
پھر اٹھی اور دلجمعی کے ساتھ اس کا انتظام کیا گیا۔

خواتین و حضرات! آج کی رات محفل نظیر خوانی کی رات ہے اور آج برسوں

کا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے جس کی آرزو ہم سب کی حسرت تھی۔ اے اہل سلسلہ! یہ محفلیں جو گذشتہ ۴۲ سال سے کراچی میں جم رہی ہیں، ہم سب کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ آئے والے زمانوں میں ان محفلوں کی یادیں گرمی احساس بن کر ہمارے دلوں کو روشنی و نور سے بھر دیں گی اور ان یادوں کی برات کے درمیان تضاد کو تو ازل و اعتدال بخشنے والا ایک صحیح منور چہرہ اس ہستی کا ابھرے گا جس نے ایک تاروں بھری رات میں اس انجمن کی بنیادیں استوار کی تھیں اور جو کج بھی ہمیشہ کی طرح اس محفل کی روح رواں ہے۔ (پھر شاعر، بڑے دل والی، اچھی انسان، محبتوں کا پیکر اور عضو و درگزر کی مثال اور اے اہل سلسلہ! آپ ہی سے اس محفل کی رونق ہے۔ آپ ہی سے گرمی گفتار بھی ہے اور گرمی بازار بھی۔ آپ ہی کی محبتوں اور فراخ دلی نے سلسلے کو ایک ایسے خاندان، ایک ایسے کنبے کی صورت عطا کی ہے کہ اب ایک دوسرے کے بغیر روح میں موج اضطراب ہی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی محبتیں اور آپ کا اخلاص اہل سلسلہ کی حیاتِ تازہ کا نظیر اکبر آبادی، جوار و شاعری کی عظیم روایت کے ایک منفرد اور بے مثال شاعر تھے، ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے اور یکم اگست ۱۹۸۰ء کو اگر وہ ہیں اسودہ خاک ہو گئے۔ فقیر منش، آزاد، طبع اور قناعت پسند، ساری عمر مدرسہ اور شاعری میں گزار دی، ہند کی سے پیٹ پالا اور شاعری سے اس تہذیب کی روح کو پالا پوسا جو اپنی صورت گرمی کے لیے صدیوں سے بے قناعت تھی، اسی لیے نظیر کی آواز اردو شاعری کی سب آوازوں سے مختلف ہے۔ ان کی آواز میں ہندو مسلم تہذیب کی روح، اصوات و آہنگ کا جاوہ جگمگا رہی ہے، اسی لیے نظیر کا ذخیرہ الفاظ بے حد بے حساب ہے اور اسی لیے ان کی شاعری سے آج بھی عوام و خواص سب کی روح تازہ ہو جاتی ہے اور سرسوں کی ٹھوکر سے زندگی کی تپنی بھٹی دھوپ میں جان سی پڑ جاتی ہے۔

نظیر عوام میں اتنے مقبول تھے کہ چاروں طرف سے گزرتے شعر و شاعری کی فرمائشیں ہونے لگتیں۔ ایک دن شاہجی سے کتے ہونے چند نظیر نیوں نے ڈھک لیا اور کہا کہ میاں! کچھ کہہ دو میاں نے بہت ٹالا مگر وہ کہا ٹلنے والی تھیں۔ نظیر نے کہا اچھا اپنا اپنا نام بتاؤ۔ ایک نے

کہا جتنا۔ دوسری نے کہا گنگا۔ نظیر نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا اور رخصتہ کہا:

یارب میری دعا کو جلدی قبول کیجیے

جہنا میں لگا جلی گنگا کے پار کر دے

جنھوں نے اگر وہ دیکھا ہے جانتے ہیں کہ مالی امتحان جاتے ہوئے کناری بازار پر

ہے۔ کوٹھے پر کسی نے مسکرا کر کہا ”مہیاں! ہمیں بھی اپنا کلام سنا دیجیے۔ یاد کر لیں گے“

گائیں گے کماؤں گے۔ نظیر خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر اصرار کیا اور فقرہ بھی چُست کیا۔

نظیر نے رخصتہ یہ شعر پڑھا:

لکھیں ہم عیش کی خفقی پہ کس طرح لے جان

قلم زمین کے اوپر، دوات کوٹھے پر

نظیر بڑے شاعر اور زندہ دل انسان تھے۔ بخام کی جان تھے۔ اسی لیے اپنے دور میں

بے حد مشہور اور بے حد ہر دلعزیز تھے۔ ان کی یہی شہرت اور یہی ہر دلعزیزی آج تک

باقی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔

آج کی محفل میں نظیر اکبر آبادی کو یاد کرنے اور ان کے کلام سے اپنی روح کو تازہ

کرنے کا یہ وہ سلسلہ ہے جسے اہل سلسلہ نے تلاش کیا ہے۔

# غیر منقوطہ شاعری: مصدر الہام

جناب صاحبِ سترا دی مجھے اس لیے بھی عزیز ہیں کہ وہ میرے تین چھوٹے بھائیوں اور ایک بیٹے کے اُستاد ہیں۔ میں انھیں گزشتہ بیس بائیس سال سے جانتا ہوں۔ اور ان کا نام میرے گھر میں ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ ایک شریف النفس کم گو اور کم آہمیز انسان ہیں اسلام کے قُرب سے ان کے دل و دماغ روشن ہیں اور خشتِ رسولؐ سے ان کا دھڑ دھڑاتا ہے۔ اسلام اور خشتِ رسولؐ ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات ہیں وہ ایک سچے فرضِ شمس اور اُممّوں کے مطابق زندگی بسر کرنے والے آدمی ہیں۔ ایک اچھے انسان۔ ایک اچھے استاد ایک اچھے شاعر۔

اب تک ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر اہل نظر سے غریب تحسین وصول کر چکی ہیں۔ محاذِ قلم۔ کٹھن، خطباتِ غوثِ اعظمؒ، و دربارِ رسالت میں اور ترویجِ فنونِ تاریخ میری نظر سے گزری ہیں۔ وہ گزشتہ پچاس سال سے شاعری کر رہے ہیں اور اس فنِ لطیف پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ کلام جن کا نام صاحبِ صاحب نے مصدرِ الہام رکھا ہے اُن کی شاعری کا حاصل ہے۔ اس مجموعے میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ کسی شعر میں کوئی لفظ ایسا استعمال نہ ہو جس میں نقطہ آتا ہو اب سے پہلے جب ہماری تہذیب زندہ تھی صنعتِ غیر منقوطہ میں شاعری کرنا کمالات کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ اس کمال کا اندازہ اُس وقت کیا جاسکتا ہے جب آپ شاعری کی بات تو چھوڑ کر ایک سطرِ شعر میں ایسے الفاظ کی مدد سے نکھنا چاہیں جن میں نقطہ نہ آتا ہو اور کوشش کریں کہ بات ہی ڈھنگ سے ادا ہو جائے اُس وقت صحیح معنی میں آپ جناب صاحبِ سترا دی کے فنِ بلبل کی دلوں سے کہتے ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں جتنی غزلیں انھیں قطعات و رباعیات اور نعتیں ہیں ان میں کہیں

ہی ایک لفظ ایسا استعمال میں نہیں آیا جس میں نقطہ آیا ہو۔ پھر قابل تعریف بات یہ ہے کہ صاحب صاحب نے غیر منقوط الفاظ کو جو اور وزن کی زنجیروں میں قید نہیں کیا، اگر وہ صرف یہی کرتے تو ان کی محنت کی داد تو دی جاسکتی، لیکن شعر کا مزہ آتا۔ صاحب صاحب نے بیک وقت دو قول کام کئے ہیں۔ ایک طرف غیر منقوط الفاظ استعمال کیے ہیں اور دوسری طرف شاعری کا جادو بھی جگایا ہے، یہ ایسا کلام ہے جس کی داد دینا سفاک ہے۔

اردو تحریک و ترقی تاریخ پر نظر ڈالے تو اس فن میں بہت کم لوگوں نے اظہار کمال کیا ہے۔ یہ تو ایسے جاں جو کہوں گا کہ ہے کہ لکھنے والا خون تھوکنے لگے۔ فیضی نے شرفیاری میں قرآن پاک کی غیر منقوط تفسیر لکھی تھی اور اس کا نام "سواطع الالباب" رکھا تھا۔ جناب صاحب نے اپنے غیر منقوط مجموعہ "کلام کلام" "مصدر الالباب" رکھا ہے۔ انشاء اللہ خدا ان الشانے ایک مختصر دیوان اور ایک کہانی اسکے گہر اس صنعت غیر منقوط میں تصنیف کی ہے اور ایک مثنوی اور ایک قصیدہ منقبت بھی اسی صنعت میں لکھے تھے۔ شاگرد و تاجر مرزا محمد علی اختر کا ایک مرثیہ بھی اسی صنعت میں ملا ہے۔ یہ وہی مرثیہ ہے جو "ذائقہ قائم" نامی مجموعہ مرانی میں مرزا سلامت علی دہیر کے نام سے درج کیا گیا ہے۔ صدر عالم صدق نے ایک قصیدہ "سرور صدق" کے نام سے اسی صنعت میں تحریر کیا تھا جس کا مخطوط انجمن ترقی اردو پاکستان میں میری نظر سے گذرا ہے۔ لخص پر شاہ صدق لکھنوی نے "مسدا" کے قصے کو صنعت غیر منقوط میں منظوم لکھا تھا جس کا ذکر خرم خاں جاوید کی جلیہ نظم (۲۰۹) میں ملا ہے، بحر الفصاحت (۱۷۷) میں دہیر کے تین بے نقط مرثیوں کا ذکر ملتا ہے اور ایک بند میر تقی میر کا بھی اس صنعت کی مثال میں دیا گیا ہے۔ مرزا دہیر کے چھپتے شاگرد شیخ فقیر حسین عظیم نے صنعت غیر منقوط میں مرزا دہیر کے انتقال کی تاریخ لکھی تھی۔ (دہلی ۱۲۳۶) ایسی ہی چند مثالیں تلاش سے اور پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس شکل صنعت میں بہت کم اہل کمال نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ مصدر الالباب اس فہرست میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

صاحب صاحب نے اپنے مجموعہ کلام میں صنعت غیر منقوط کو استعمال کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ غیر منقوط کلام کی اشاعت کا مقصد اردو کی قوت ابلاغ کا مظاہر ہے۔ دکھانا یہ ہے کہ اردو نیز الفاظ کا کس قدر بے پناہ ذخیرہ ہے کہ بعض دانستہ پابندیوں کے باوجود اس میں ہر قسم کی خیانت

کا اظہار آسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعہ کلام سے نہ صرف اردو کی بلکہ خود قصبا صاحب کی قوتِ ابلاغ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ آخر کلمہ طیبہ کے سارے الفاظ کیوں غیر منقوط ہیں؟ آخر اللہ اور اس کے رسول محمدؐ کے نام میں نقطہ کیوں نہیں آتا۔ لفظ تو سب ہی پاک ہیں، لیکن کیا اس طرح غیر منقوط الفاظ زیادہ اہم نہیں ہو جاتے؟ پھر یہ خیال بھی آتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ منقوط الفاظ کے مقابلے میں حقوقِ اعتبار سے زیادہ شک ہوتے ہیں یہ وہ الفاظ ہیں جنہیں زبان کو جنبش دینے بغیر دل کی زبان سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمارے دل کی آواز بن سکتے ہیں اور جنہیں ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنی روح کی آواز میں تبدیل کر سکتے ہیں مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ کا تعلق ہماری روحانی زندگی سے زیادہ ہے۔ باطن کی آواز، ظاہر کی آواز سے زیادہ سچی اور زیادہ بامعنی ہوتی ہے، سمجھتے سمجھتے یہاں تک پہنچا تو خیال آیا کہ آپ کو سوچنا ہوا چھوڑ کر میں اب رخصت ہو جاؤں اور پھر آپ جانیں اور قصبا صاحب جانیں۔ میں آپ کے دوران کے درمیان کیوں دیوار بنوں۔

(۲۳ مارچ ۱۹۷۷ء)

## غیر منقوطہ نثر: ہادی عالم

آج مجھے آپ سے ایک ایسی کتاب کا تعارف کرانا ہے جو ایک طرف اس انسان کامل کی مقدس سیرت کو پیش کرتی ہے جس نے انسان کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچایا اور دوسری طرف جس میں اس عظیم انسان کی سیرت کا ملکہ کو صرف ایسے الفاظ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے جن پر نقطہ نہیں لگایا جاتا۔ غیر منقوطہ الفاظ کے ذریعے اپنی بات کو سلیقے سے کہنا ایک نہایت مشکل کام ہے اور اس کام کی داد وہی دے سکتے ہیں جنہوں نے تیشے سے جوئے شیر لانے کا کام کیا ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں ہمارے رسم الخط میں نقطہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور عربی، فارسی و اردو کے بیشتر الفاظ منقوطہ ہوتے ہیں۔ مخدوم فرمائیے کہ لغت کے ٹیسے حصے کو نظر انداز کر کے صرف ان الفاظ کے سہارے اپنی بات کہنا اور اس طور پر کہنا جس طور پر مولانا محمد ولی رازی صاحب نے کہی ہے ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے تصور ہی سے صاحبانِ ادب کے قلم جنبش سے محروم ہو جاتے ہیں۔ غیر منقوطہ الفاظ سے کوئی ادب پارہ تخلیق کرنا صرف ان زبانوں میں ممکن ہے جنہوں نے اردو فارسی کی طرح عربی رسم الخط اختیار کیا ہے اور جہاں منقوطہ و غیر منقوطہ الفاظ خود زبان اور اس کے رسم الخط کو مابعد الطبیعیاتی اساس اور دینی بنیاد فراہم کر کے کائنات کے وجود میں جگہ گاتے ستاروں اور محو خرام سیاروں کا سماں پیدا کرتے ہیں۔ اسی مابعد الطبیعیات سے ہمارا تصور و جمال پیدا ہوا ہے اور الفاظ اسی رسم الخط کی مدد سے ہمارے ظاہر کی آرائش اور ہماری روح کی بالیدگی کرتے ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جس سے اسلامی تہذیب کی روح نے جنم لیا ہے۔ لیکن آج تہذیبِ مغرب کے سیلاب میں بہہ کر ہم ایک ایسے گہرے احساسِ کسری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اب ہمیں اپنی روایت، اپنی فکر، اپنی زبان، اپنا رسم الخط عرض کر اپنی ہر چیز پر مایہ نظر کرنے



گئی ہے۔ حالانکہ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام نے انسانی زندگی کو ہر طرح پر اپنے سانچے میں ڈھالا ہے مثلاً اپنے رسم الخط ہی کو لیجیے۔ اس کا رخ سیدھے ہاتھ کی طرف سے اُلٹے ہاتھ کی طرف ہوتا ہے یہ رُخ بھی بے سبب نہیں ہے۔ یہ بھی دینی بنیاد پر قائم ہے۔ اسلام نے اپنے نظام کائنات میں سیدھے ہاتھ کو اہمیت و فوقیت دی ہے اور اسی لیے اسلامی تہذیب اور مسلمان معاشروں میں ہر کام سیدھے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ ہم کھانا کھاتے ہیں تو سیدھے ہاتھ سے پانی پیتے ہیں تو سیدھے ہاتھ سے۔ نماز پڑھ کر سلام پھیرتے ہیں تو پہلے سیدھے ہاتھ کی طرف پھیرتے ہیں۔ طواف کعبہ کرتے ہیں تو اُس کا رُخ بھی وہی ہے جو ہمارے رسم الخط کا رخ ہے۔ طواف کرتے ہیں تو دایاں پر پہلے اٹھاتے ہیں گویا جب ہم اپنے رسم الخط میں کچھ لکھتے ہیں تو ہم ہر بار طواف کعبہ کے عمل کو دہراتے اور اپنی حرجی روایت کو زندہ کرتے ہیں۔ لیکن آج جب ہم اپنے فکر و عمل سے اپنی دینی اساس کو فراموش کر کے مغرب کے ہاتھوں مغلوب ہو رہے ہیں مولانا محمد ولی رازی نے اپنی زیر نظر تصنیف ”یادی عالم“ میں غیر منقوط الفاظ کی مدد سے اردو نثر کا ایک اسلوب تخلیق کر کے ہمیں پھر سے اپنی دینی روایت کی معنویت اور اس کی دریافت و کُن طرف متوجہ کیا ہے۔

غیر منقوط تحریروں کی روایت عربی، فارسی اور اردو ادبیات میں پہلے سے موجود ہے۔ عربی میں مقامات حریری، فارسی زبان میں امیر خسرو کا کچھ کلام اور فیضی کی سواطع اللہام اردو میں انشاء اللہ خان انشا کا غیر منقوط دیوان اور کئی دوسری تخلیقات موجود ہیں لیکن اب تک ایک موضوع پر اردو نثر میں پوری کتاب کسی نے تصنیف نہیں کی تھی۔ اسی لیے مولانا محمد ولی رازی کی تصنیف ”یادی عالم“ تاریخی اہمیت کی حامل ہے جس میں سیرت رسولؐ بیان کرتے ہوئے فاضل مصنف نے ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کیا جس میں نقطہ استعمال ہوتا ہو اور پھر خوبی یہ رکھی کہ نہ اظہار میں تشبیہ پیدا ہوا نہ بیان میں کم زوری آئی اور نہ اسلوب میں جھول پیدا ہوا اور نفس مضمون بھی پڑھنے والے تک پوری طرح پہنچ گیا۔ کتاب پڑھتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ اگر خطِ طیبہ

کے سارے الفاظ بے نقط یا غیر منقوط کیوں ہیں؟ آخر اللہ اور اس کے رسول پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام میں نقطہ کیوں نہیں آتا؟ لفظ تو سب ہی پاک ہوتے ہیں لیکن اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بے نقط ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ غیر منقوط الفاظ منقوط الفاظ کے مقابلے میں اصولی اعتبار سے زیادہ سبک ہوتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جنہیں زبان کو جنش دینے بغیر دل کی زبان سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمارے دل کی آوازیں سن سکتے ہیں اور جنہیں ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے روح کی آواز میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ کا تعلق زندگی کے روحانی پہلو سے ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک عربی رسم الخط غیر منقوط تھا۔ حروف پر نقطہ لگانے کا طریقہ خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا۔ روایت ہے کہ ایک دن حضرت معاویہؓ نے ایک کاتب کو بلایا اور فرمایا کہ میں تمہیں لکھواتا ہوں۔ لکھو اور ”رقش“ کرو۔ کاتب نے پوچھا کہ حضور ”رقش“ کیا چیز ہے؟ حضرت معاویہؓ مسکرائے اور کہا کہ ایک دن جب میں مدینہ منورہ میں تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کی حیثیت سے مجھے بلایا اور فرمایا لکھو اور ”رقش“ کرو۔ اس وقت میں نے بھی پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! ”رقش“ کیا چیز ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حروف پر جہاں ضرورت ہو نقطے لگاؤ۔ اب آپ دیکھیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نقط الفاظ کی روحانیت میں نقطے کا اضافہ کر کے اسے زندگی کے عمل سے ملا دیا اور اس طرح اسلام کی دینی روایت کو مکمل کر دیا۔ میں نے جب مولانا محمد ولی رازی صاحب کی تصنیف ہادی عالم کا مطالعہ کیا تو میں نے دراصل دینی روایت کے دائرے میں روحانی سفر کیا اور یہی وہ روحانی سفر ہے جس کی ہمیں اپنے معاشرے میں اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ روحانی سفر جس سے بے لوثی اور ایثار

کی قدریں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ روحانی سفر جس سے زندگی لگے بڑھتی ہے وہ روحانی سفر جس سے معاشرے ترقی کرتے ہیں۔ وہ روحانی سفر جس سے دلوں میں محبت اور اخوت کی دنیا آباد ہوتی ہے اور امن و سکون اور اعتماد و اعتبار کی نقشا پیدا ہوتی ہے۔ مولانا محمد ولی رازی صاحب کی کتاب نے مجھ پر یہ سفر آسان کر دیا اور یہی وہ سفر ہے جس سے زندگی میں نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔

(۵۵ تا ۱۶۷)

## رحمن بابا کا پیغام

پشتواؤں سے دل چسپی رکھنے والے طلبہ نے جب مجھ سے رحمان بابا کے جانشینانہ میں تقریر کرنے کی فرمائش کی تو میں نے ڈائری دیکھ کر فوراً باجی بھری یہ میری عادت ہے جو کام میں کر سکتا ہوں فوراً کر دیتا ہوں۔ اگر نہیں کر سکتا تو پھر نہیں کر سکتا۔ مجھے طلبہ سے محبت ہے۔ وہ محبت اور شفقت جو باپ کو اپنے بیٹوں سے ہوتی ہے۔ جب طلبہ چلے گئے تو میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا کہ رحمن بابا کی وفات کو اب تقریباً تین سو سال ہو گئے ہیں آخر ہم انھیں آج بھی کیوں یاد کرتے ہیں۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں۔ شادی بیاہ کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ لوگ انھیں بھول جاتے ہیں۔ یہی کام ایک حیوان بھی کرتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ اپنے مرنے کے ساتھ ہی زندگی سے اس کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ رحمن بابا بھی ایک انسان تھے۔ لیکن وہ مرنے کے ساتھ مر نہیں گئے۔ وہ آج بھی زندہ ہیں اور آج بھی ہمارے دل کے نہاں خانے میں زندہ ہیں اور ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہے ہیں۔ خود سمجھیے تو آپ بھی میری طرح اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مرنا رحمت ہے۔ سب کو مرنا ہے لیکن وہ لوگ جو زندگی میں اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ زندگی میں جن کا کوئی مقصد ہوتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں تو وہ لوگ رحمان بابا کی طرح مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اسی لیے آج یوم رحمان بابا مناتے ہوئے آپ کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی زندگی میں ایسے کام کریں جن سے آپ کا نام روشن ہو اور مرنے کے بعد بھی لوگ آپ کو یاد رکھیں۔ اسی وقت انسان حیوان کی سطح سے بلند ہو سکتا ہے۔ اسی وقت انسان انسان بن سکتا

ہے۔ اُردو کے لافانی شاعر میر تقی میر نے کہا تھا:

ہمارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

سب سے پہلا سبق اس شعر سے یہ ملتا ہے کہ ہمیں زندگی میں ایسے کام کرنے چاہئیں جس سے آپ سب کو یاد رہیں اور یہ کام، جیسا کہ رحمن بابا نے کہا ہے، اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان دنیا میں سب اچھے کام کرے۔

رحمن بابا نے کہا تھا:

غفلت کی نیند سے جاگ اٹھو

کس تک اونگھتے رہو گے

ہر وقت دعا اور درود میں مشغول رہو

آدمی کے ظاہر لباس سے دھوکا دکھانا

اس کے باطن کو دیکھو کہ پُر مغز ہے یا بے مغز ہے۔

رحمان بابا نے ان شعروں میں جن کا ترجمہ میں نے آپ کو سنایا ہے آپ کو غفلت کی نیند سے جاگنے کی تلقین کی ہے۔ غفلت انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ غفلت کی وجہ سے انسان اپنی عمر کو ضائع کر دیتا ہے اور جب وہ ضائع ہو جاتی ہے اور پھر واپس نہیں آتی تو وہ پھٹتا ہے۔ دوسری بات، رحمن بابا نے یہ بتائی ہے کہ انسان کے ظاہر کو نہیں بلکہ اس کے باطن کو دیکھنا چاہیے۔ باطن ہی اصل حقیقت ہے۔ ظاہر صرف دھوکا ہے۔ اچھا انسان وہ ہے جس کا ظاہر نہیں بلکہ اس کا باطن اچھا ہو۔ وہ پُر مغز ہو سبے مغز نہ ہو۔ مجھے یاد آیا کہ پشتو کے ایسے بہت سے شاعر ہیں جن میں بہت خوب صورت الفاظ ہیں عمر کو ضائع نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک نچے میں کہا گیا ہے کہ:

(۱) " عمر کی مثال پانی کی لہر کی سی ہے۔ کچھ کا دن جو گزر گیا تو پھر

واپس نہیں آئے گا۔ "

(۲) " میری عمر یوں ضائع ہو رہی ہے جس طرح بخر زمینوں پر

بارش :-

ایک اور ٹپے میں کہا گیا ہے :

”گذرا ہوا وقت واپس نہیں آئے گا۔ چاہے میں کانٹوں کو اپنے

آنسوؤں سے ہر اکیوں نہ گردوں :-

اسی لیے رحمان بابا کی یاد مناتے ہوئے آپ کو چاہیے کہ آپ ان کے کلام سے وہ سبق حاصل کریں جس سے آپ کی زندگی سنورے۔ آپ زندگی میں وہ کام کریں جن سے آپ رحمان بابا کی طرت پرست رہیں۔ وہ لوگ جو اس بات کو سمجھتے ہیں زندگی میں ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ رحمان بابا نے کہا تھا :

”وہ لوگ جو صبح و شام میں نئی اور سونے میں اور خیر و شر میں

کوئی فرق نہیں کرتے وہ اندھے ہیں :-

ایک اندھا وہ ہوتا ہے جس کی آنکھیں کی روشنی ضائع ہو جاتی ہے لیکن ایک اندھا وہ ہوتا ہے جو مٹی اور سونے میں فرق نہیں کرتا۔ جو خیر و شر میں فرق نہیں کرتا۔ جو تنگ دل ہوتا ہے۔ جو تنگ نظر ہوتا ہے۔ جو لالچ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جو خدا سے وقتی فائدے کے لیے وہ کرتا ہے جو شر ہے، خدا ہے اور خیر کو بھول جاتا ہے۔ عزیز و! خیر یہ وہ چیز ہے جس سے آدمی مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور جس سے اس کا نام روشن ہوتا ہے۔ زندگی میں عزت و احترام کا مالک ہوتا ہے اور رحمان بابا کی طرح مرنے کے بعد بھی وہ ہمارے دلوں کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ رحمان بابا جو پشاور کے قریب مہمند قبیلے کے ایک گاؤں بہادر کی میں پیدا ہوئے، ایک ایسے انسان تھے جن کی زندگی خیر کی تلاش میں گذری۔ وہ مہمند ہوتے ہوئے بھی انسان تھے عشق ان کا مشرب تھا۔ عشق سب انسانوں سے، ساری خلقت سے، ساری انسانیت سے ان کا مقصد حیات تھا۔ ایک شعر میں کہتے ہیں :

”میں عاشق ہوں اور میرا کام صرف عشق ہے۔ میں نہ خلیل

ہوں، نہ دائود زئی اور نہ مہمند :-

ایک اور شعر میں کہتے ہیں :

”اگر میں تمہارے عشق کے مرتبے کا راز کھول دوں تو فرشتے انسا  
س کرنے لگیں کر اے کاش ہم انسان ہوتے :“

یہی انسانیت ہمارا مقصد حیات ہونا چاہیئے۔ یہی وہ سبق ہے جو رحمان بابا نے ہمیں دیا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں دکھایا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ رحمان بابا کی یاد منانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے خیالات کو ان کی باتوں کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ اپنی زندگی کو سنواریں۔ انسان وہی بنتا ہے جو وہ خود کو بناتا ہے۔ وہ انسان جو خود کو انسان نہیں بنانا دو پیروں پر چلنے کے باوجود حیوان رہتا ہے۔ آج رحمان بابا کی روح کو خوش کرنے کا مجھے یہی صحیح طریقہ نظر آتا ہے کہ آپ سب ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور خود کو انسان بنائیں۔ ایسا انسان جو محبت کو پھیلاتا ہے۔ جو خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے اور جو اپنے ملک اپنے وطن سے محبت کرنا ہے اور دشمن سے بھی خیر کا سلوک کرتا ہے۔

عزیزو! اس سے قبل کہ میں آپ سے رخصت ہوں پشتو کے دو مہوں کا ترجمہ آپ کو اور سناروں تاکہ رحمان بابا کی نیک روح خوش ہو جائے۔ وہ نئے یہ ہیں :

(۱) ”اے اللہ مجھے سو بار زندگی دے تاکہ میں سو بار وطن کی محبت پر اس کو نثار کروں :“

(۲) ”میرے محبوب نے وطن کی راہ میں سروے دیا۔ میں اپنی زلفوں سے اس کا گفن سیوں گی :“

خدا کرے ہمارے درمیان بہت سے رحمن بابا پیدا ہوں تاکہ ہمارا ملک اور اس کے رہنے والے حقیقی معنی میں انسان بن جائیں۔ وہ انسان جو سب سے محبت کرتا ہے۔ اپنے عزیزوں دوستوں سے بھی اور وطن سے بھی۔

بابا رحمن اسی لیے میرے پسندیدہ اور محبوب شاعر ہیں کہ ان کی شاعری میں مجھے انسان دوستی کی وہ خصوصیت ملتی ہے جو وسیع القلب اور وسیع النظر انسانوں کا شیوہ رہی ہے۔ رحمن بابا کی شاعری کو پسند کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک ایسی سادگی، ایک ایسی روانی اور ایسی گہری معنویت ملتی ہے کہ ان کے اشعار آج بھی سنتے اور پڑھنے والوں کے دل پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ آپ یہاں یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ آخر اس اثر کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ وہ لوگ جو زر پرست نہیں ہوتے، بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہی درویش کی صفت ہے۔ ان میں ذمال کی طبع ہوتی ہے اور نہ زر و دولت کی ہوس ہوتی ہے۔ دراصل زر پرستی معاشرے کو خواب کرتی ہے۔ لوگوں کو لوٹ کھسوٹ اور جبر و استحصا کی طرف لے جاتی ہے اور اسی لیے انسان سخت دل، خود غرض اور ریاکار ہو جاتا ہے۔ سلام ہے ان لوگوں کو جو بابا رحمن کی طرح ہوس و طمع کی لعنت سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کے دل صاف ہو کر انسانیت کا آئینہ بن جاتے ہیں اور ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ میں حار و کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ رحمن بابا کی شاعری اسی لیے ہمیں آج بھی متاثر کرتی ہے۔ رحمن بابا کا مشرب صلیح کل تھا۔ وہ قبائلی بنیادوں پر تنازعات کو بُرا سمجھتے تھے اور انسانیت کی بنیاد پر انسانوں کے رشتوں کو دیکھتے تھے۔ اسی لیے ان کا اخلاق اعلیٰ، ان کی فکر وسیع اور ان کا انداز نظر صلیح شکل کی طرف مائل تھا۔ اور جنگ زریب عالم گیر کا جب انتقال ہوا تو اس وقت رحمن بابا زندہ تھے۔ ایک قصیدے میں رحمن بابا نے اورنگ زیب کے بیٹوں کی آپس میں لڑائی پر نہایت دکھ سے ساتھ اظہارِ افسوس کیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جنگ ان کے مسلک کے خلاف اور ہوس پرستی کی جنگ تھی۔ اسی قصیدے میں بابا رحمن نے اورنگ زیب عالم گیر کو ”ظلمت کڈ



ہند کا آفتاب قرار دے کر اس کی مدح بھی کی ہے: "وہ اور نگ ذیب کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ وہ نہ صرف منشی اور پرمیزگار تھا بلکہ اس نے سارے بر عظیم کو اپنی دانش و حکمت سے متحد کر رکھا تھا۔"

رحمن بابا ایک نیک باطن بزرگ و صوفی انسان تھے۔ اسی لیے لفظ بابا ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ پشتوزبان میں بابا خدا رسیدہ بزرگ کو کہتے ہیں۔ ایک مصنف نے کبھی جگہ لکھا ہے کہ پشتو ادب میں رحمن بابا کو وہی مقام حاصل ہے جو فارسی ادب میں حافظ شیرازی کو حاصل ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ برسوں حافظ شیرازی کے کلام سے فال نکالی جاتی رہی ہے۔ یہی صورت رحمن بابا کے کلام کے ساتھ ہے۔ زبان قدیم سے لوگ ان کے کلام سے فال نکالتے ہیں اور اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ "پھر خزانہ" کے حوالے سے کتابوں میں آیا ہے کہ "افغان سلطنت کے بانی حسامی میرادیس خان چوہنگ نے جب ایران کے صفوی بادشاہوں کے خلاف آزادی کا علم بلند کیا تو رحمن بابا ہی کے دیوان سے فال نکالی تھی اور کامیابی حاصل کی تھی۔"

اٹھارویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں بابا رحمن نے وفات پائی اور "ان کا مزار پشاور کے جنوب میں ہزار خانہ کے مقام پر اخوند درویش کے مزار کے نزدیک "آج بھی مرجع خلافت ہے۔ رحمن بابا ایک بڑے انسان" ایک بڑے شاعر اور اعلیٰ اخلاقی فکر رکھنے والے نیک باطن اور درویش صفت انسان تھے۔ ایسے انسان کبھی بھار پیدا ہوتے ہی لیکن ان کی روشنی سے گنے والی نیلیں ہمیشہ نور اور حرارت حاصل کرتی رہتی ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ ہمارے نوجوان بھی بابا رحمن کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تاکہ اپنی صلاحیتوں سے وہ بھی انسانیت کی عظیم خدمات انجام دے سکیں۔ بابا رحمن نے اپنے ایک شعر میں لکھا ہے کہ "اگر میں تمہارے عشق کے مرتبے کا راز کھول دوں تو فرشتے انوس کرنے لگیں کہ اسے کاش ہم بھی انسان ہوتے۔ پاکستان کے نوجوانوں کو بابا رحمن کا یہی پیغام ہے کہ وہ قبائلی و علاقائی تعصبات سے بلند ہو کر زندگی کا مطالعہ کریں اور انسانیت کی خدمت کو اپنی منزل بنائیں۔ اسی وقت ہماری نئی نیلیں معاشرے کو جہد و استحصال سے پاک کر سکتی ہیں اور زر پرستی کو ختم کر سکتی ہیں۔"

# شاہ عبداللطیف کی شاعری کے نئے گوشے

”بین الاقوامی سندھی ادبی کانفرنس“ کے موقع پر میں نے جو موضوع اپنے لیے منتخب کیا ہے وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری ہے۔ یہ موضوع میں نے اس لیے منتخب کیا ہے کہ شاہ کی شاعری کا بنیادی فلسفہ عشق ہے جس کے مثبت، انسانیت، ملاپ اور یکساہتی کی وہ خوشبو نکلتی اور پکھلتی ہے کہ مشام جان محط ہو جاتے ہیں۔ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاہ کی شاعری آج دعوتِ مساوی پاکستان میں بلکہ ساری دنیا میں نور اور روشنی پھیلا رہی ہے اور روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی (زمتونی ۱۵۲، ۱۶) سندھی زبان کے وہ شاعر ہیں جن کی شاعرانہ عظمتوں سے سندھ کے عوام و خواص یکساں طور پر مستفیض ہوئے اور ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری دل کی آواز ہے اور اسی لیے دل میں اتر جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے صوفی شاعر ہیں جن کی شاعرانہ لہ نے قرآن و حدیث کی روح کو معاشرے کی روح میں جذب کر دیا ہے۔ توحیدان کی شاعری کا مرکزی نکتہ ہے جس سے فلسفہ و فکر کی وہ کرنیں پھوٹتی ہیں جو ساری زندگی کو متحرک کر دیتی ہیں۔ شاہ نے اسی شاعری کی ہے جو بیک وقت مقامی بھی ہے اور ماورائے مقام بھی اور اسی لیے آج تقریباً اڑھائی سو سال بعد بھی وہ اسی طرح تروتازہ اور پُر اثر ہے۔

شاہ نے اپنی شاعری سے خود سندھی زبان کو زندہ کیا اور اس میں وہ دل آویزی، جاذبیت اور اعلیٰ انسانی قدیم پیدا کیں کہ آج سندھی زبان ایک بلند مقام پر فائز ہے۔ شاہ نے اپنی شاعری سے دنیا کو انسانیت کا درس دیا اور انسانوں کو بحیثیت انسان بہتر

انسان بننے کی تلقین کی۔ غریب عوام جو ظلم و استبداد کا شکار تھے شاہ نے ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ انھوں نے اپنے لغات سے عوام کی ترجمانی بھی کی اور راہنمائی بھی۔ وہ وصالیت کے متلاشی تھے۔ جب جوئے حق اور قرب الہی ان کا مسلک تھا۔ شاہ نے اپنی داستان میں جو خیال آرائی کی ہے اس میں سچائی اور حق کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے سچ شاہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ شاہ کا کلام زبان زد خاص و عام ہے۔ وہ محبت کے شاہ ہیں وہ محبت جو انسان کو انسان سے قریب کرتی ہے۔ ان میں اتحاد اور پیار کا رشتہ پیدا کرتی ہے اور اخوت کے رشتے میں پرو کر معاشرہ کو پُر امن بنا دیتی ہے۔ شاہ نے ان ہی خیالات کو تصوف کے حوالے سے اپنی شاعری کے ذریعے سارے معاشرے تک پہنچایا ہے۔ ان کے کردار دراصل استعارے ہیں جن سے ان کے فلسفہ تصوف کا ترجمانی ہوتی ہے۔ شاہ کا رسالہ ایک ایسا ہادہ ہے جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول اور کلیں کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں حافظہ و سعدی کی لے بھی شامل ہے اور رومی و عطار کا فلسفہ بھی۔ انسانی اقدار کی سر بلندی اور نپہ امن اور صالح معاشرے کا قیام ان کی شاعری کا مقصد ہے۔ انھوں نے زمانے کے سرد و گرم کو خود حکم دے انسانیت کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی۔ فی دوق صحراؤں کو عبور کیا۔ پہاڑوں کے دامن میں ڈیرہ جمایا۔ ریگستان کی تپتی ہوئی زیت پر سیر کیا۔ غربت کی تسکلیف اٹھائیں۔ برفانی ہواؤں کا مقابلہ کیا اور با وسعہ کے چھٹیروں سے زندگی کے راز سر مست کو تلاش کیا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری عوام کی روح سے قریب ہے اور اسی لیے ان کی شاعری میں بلا کا سوز اور بلا کی تاثیر ہے۔ وہ بلکتی ہوئی انسانیت کو حوصلہ دیتے ہیں۔ وہ زندگی بسر کرنے کا شعور پیدا کرتے ہیں اور زندگی میں عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ وہی پیغام ہے جو قرآن پاک اور رسول اکرمؐ نے ہمیں دیا ہے۔ مولانا روم کی آوازاں کی شاعری کی آواز میں شامل ہے اور اسی قرنہ میں فارسی اور اردو زرخفاری کا فلسفہ حیات ان کے فلسفہ حیات میں رنگ بھرتا ہے۔ شاہ سے پہلے یا شاہ کے بعد کسی شاعر نے اس الہانہ ذوق و شوق کے ساتھ عوام کی روح کی طور پر ترجمانی تو نہیں کی۔ اسی لیے شاہ نے اپنے کلام میں اہل لغت

کو اتحاد، اخوت، محبت اور بھائی بھائی کی تعلیم دی ہے۔ ان کے ٹریک شاعری خود منزل مقصود نہیں ہے بلکہ منزل پر پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ شاہ کے کلام اور ان کے فلسفہ و فکر کے متاثر ہو کر میں نے طے کیا ہے کہ ان کے پیغام کو ہر طبقے اور ہر زبان کے بولنے والوں تک پہنچایا جائے اور اسی لیے جب ۱۹۸۲ء میں میں نے کراچی یونیورسٹی سے وائس چانسلر کا منصب سنبھالا تو میں نے ارادہ کیا کہ کراچی یونیورسٹی میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جہاں سے شاہ کے پیغام محبت کو معاشرے کی روت میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے ”شاہ عبداللطیف بھٹائی چیز قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور خدا کا شکر ہے کہ تین سال کی کوششوں کے بعد مجھے اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ پہلے سال کراچی یونیورسٹی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی چیز قائم ہو چکی ہے اور اب وہاں شاہ پر جو کام ہوتا ہے اس سے شاہ کا پیغام محبت اور درس اخوت و انسانیت انشاء اللہ تعالیٰ سارے پاکستان میں پھیلے گا اور شاہ کی فکر و شاعرانہ زندگی کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ بڑے شاعروں نے ہمیشہ پیغام محبت ہی سے دنیا کو بدلا ہے اور ہمارے شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی یہی کام اپنی شاعری سے انجام دیا ہے۔ شاہ لطیف کہتے ہیں :

”بلا کے پھیر دینا محبوب کی عادت ہے۔ یہ ایک انٹی بات ہے  
مگر عشق کی ریت یہی ہے۔ اگر محبوب محبت کا رشتہ توڑتا ہے تو وہی  
اسے جوڑتا بھی ہے۔“

اور پھر کہتے ہیں :

”اے طیب! اٹھو، جاؤ اپنی دوائیں ساتھ لے جاؤ  
وہی اپنے لطف سے میری چارہ سازی کریں گے  
جنہوں نے مجھے درد بخشا ہے۔“

شاہ لطیف چارہ سازی کے لیے محبوب ہی کے پاس جاتے ہیں طیب کے پاس نہیں۔ یہی محبت کا مثبت رویہ ہے اور اسی رویے کو ہمیں بھی آج کے دور میں اپنانا چاہیے کہ یہی تعلیم

شاہ صاحب نے دی ہے۔

اب آخر میں شاہ صاحب نے پشائی کے چند لہجے پیش کرتا ہوں۔ دیکھیے وہم سے کیا کہہ رہے ہیں :

”لے کشتی ! تو بھی ان سفینوں کے ساتھ چلتی چل۔ اس پار جاتے ہوئے بہتر سامان لے کے چلنا۔ خطرناک سمندر کا شور مٹاتی ہے  
راہ ہے۔“

”کشتی سمندر میں ہلکولے کھا رہی ہے۔ بڑھئی نے جو بیض لگائی تھیں وہ کمزور ہو گئیں۔ محکم اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ اس وجہ سے فرنگی چلے گئے۔ لے ملال ! تیری کشتی میں چور داخل ہو گئے ہیں۔“  
”سو اگر نے دوسروں کا سامان کشتی میں خود لادنا کشتی کو دونوں طرف سے موجوں نے اُگر گھیرا۔ دوستو اگر مشیار ہو گئے تو یہ کشتی بھٹک نہیں جائے گی۔“

(سرسری راگ : تیسری داستان)  
”کناچ کی قدر ہے۔ موتی کی ناقدری۔ میں کچھ کو جھوٹی میں نکھٹا پھرتا ہوں۔ پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

(سرسری راگ : چوتھی داستان)  
”وہ جو ہر شناس چلے گئے جو نعل و جواہر کو پر کھٹے تھے۔ ان کے جانشینوں کو لوہے کی بجھ بھان نہیں۔ اب ان کی جگہوں پر لوہا ر لویا کوٹتا ہے۔“  
(سرسری راگ : چوتھی داستان)  
”ستارے حرکت میں ہیں اور ندی تالے بھی حرکت میں ہیں۔“

کیونکہ جو کچھ تھے ملتا ہے تو اسی پر قانع ہے۔ تو ساری رات سوتا رہتا ہے، تو دولت کس طرح جمع کرے گا۔“

(سرسری راگ، چمٹی داستان)

”بیٹھے رہنے سے خاوند نہیں ملتا۔ سوتے رہنے سے محبوب ہاتھ نہیں آتا۔“  
 ساجن اس کو ملتا ہے جو راہوں سے انکسار گذرتے ہیں۔“  
 (سرسری آبرئیں ساتویں داستان)

دانی :-

”راہ میں تھک کر مت بیٹھو! ہوا! اللہ!“

جتنا چلو گے اتنا پاؤ گے۔

کوئی اُکے کچھ کہتا ہے کوئی اُکے کچھ کہتا ہے

جتنا چلو گے اتنا پاؤ گے؟

(سرمعذوری پانچویں داستان)

”شہنشاہیت بھی سولی کے آگے جیج اور کم تر ہے کیونکہ خود

ننگی رہ کر دوسروں کی عریانی پُچھاتی ہے۔ سولی کی اس عظمت کو گھنے

کے لیے کئی جنموں کی ضرورت ہے۔“

(سرمعاروی داستان ہفتم)

”گنگا گنگویر چھائی پھر بادل برسے۔ بھلیاں چاروں اور کوئند رہی ہیں۔

کچھ بادل استنبول کی طرف، کسی کا رُخ مغرب کی طرف ہے۔ کچھ چین پر لہرا

رہے ہیں۔ کوئی سمرقند کی طرف دواں دواں ہے۔ کچھ روم پر رقصاں

ہیں۔ کوئی کابل و قندھار کی طرف، کچھ دلی و دکن کی جانب، اور کچھ

گرنار کی طرف چھا رہے ہیں۔ کچھ جیسلمیر پر برس کر، بیکانیر پر یلغار

کر رہے ہیں۔ کچھ بمبھہ پر برسے، کوئی ڈھٹ پر پھیل گیا۔ کچھ نے

عمر کوٹ سے ہوتے ہوئے دھارہ پر موسلا دھار بارش

کی۔  
 ”سرمسار جنگ، داستان چہارم)  
 ”بجلیاں کوندتی آئیں۔ ہر کھاکِ رم جہم ہوتے لگی۔ جنھوں نے  
 گراں فروش کے لیے ذخیرہ اندوزی کی تھی وہ اب کتبِ افسوس ملتے  
 ہیں۔ سوچ رہے تھے پانچے سے پندرہ ہو جائیں گے۔ اے خدا! ان  
 موذی گراں فروشوں کو موت دے دے۔ پھر چرواہے آپس میں بیٹھ کر،  
 کثرتِ باران کی باتیں کر رہے ہیں۔ سب کچھ سب کو تیرا سہارا ہے۔“  
 (سرمسار جنگ، داستان چہارم)

”سوچتی ہوں کہ یہ کہوں گی، جدائی کے ٹکڑے ان سے بیان  
 کروں گی۔ لیکن جب وہ سامنے آتے ہیں تو سب باتیں دل ہی دل  
 میں رہ جاتی ہیں۔“  
 (سرمسار جنگ، داستان اول)  
 ”لوگوں میں خلوص نہ رہا۔ ہر ایک دوسرے کا گوشت نوحہ رہا  
 ہے۔ دنیا میں صرف خوشبوئے اخلاق باقی رہ جائے گی۔ سب آدمی  
 ریاکار ہیں۔ مخلص تو کوئی ایک ہی ہو گا۔“

(سرمسار جنگ، داستان سوم)  
 ”اللہ نے دوست سے ملایا۔ تجھ پر رسم و راہ کی بات چھڑی۔  
 آئین ہر و عطا ہے کہ ترکِ محبت نہیں کیا کرتے۔“

(سرمسار جنگ، داستان سوم)  
 ”دل سے فتنہ و فساد کو نکالو۔ سلطان سے امن و صلح رکھو  
 تو دانا کے دربار سے ہر روز انعام و اکرام پاؤ گے۔“

(سرمسار جنگ، داستان اول)  
 ”دگنڈ بھڑ آیا۔ اس سے کچھ کام کاج نہ ہوا۔ روٹی اکیڑا اور  
 مکان اس کو پیر و مرشد سے ملا۔“  
 (سرمسار جنگ، داستان چہارم)  
 یہ وہ پیغام ہے جو شاہ سائیں نے سندھی زبان میں سارے عالمِ انسانیت کو دیا

ہے اور یہی وہ پیغام ہے جس پر عمل کر کے سندھ کو اس کا گہوارہ، عدل و انصاف کی سرزمین، بھائی چارہ کا مرکز اور ترقی کی قابل تقلید مثال بنایا جاسکتا ہے۔ یہی روح اسلام ہے۔ یہی روح پاکستان ہے۔ شاعر نے کہا تھا کہ ”بھنبھور میں جہنم کی آگ ہے بھنبھور پر اندھیرا چھایا ہو ہے جہنم کی آگ کے اہل سندھ شاہ سائیں کے بتائے ہوئے رستے ہی سے نکل سکتے ہیں۔ دیکھیے شاہ سائیں آپ کے کیا کہہ رہے ہیں :

آئین مہر و وفا یہ ہے کہ ترک محنت نہیں کیا کرتے

(۱۹۸۷ء)

## نظام الملک میر عثمان علی خان کی خدمات

والی دکن سلطان العلوم نظام الملک نواب میر عثمان علی خان مرحوم کی سرکاری ہستی کے موقع پر اہل دکن کا یہ جلسہ منعقد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نواب مرحوم نے دکن اور دکنیوں کی اتنی عظیم خدمات انجام دی ہیں کہ ان کی یاد ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کے سینہٴ اخلاص میں فروزاں ہے۔ برصغیر کے طول و عرض میں ریاستیں اور ممالک تھیں لیکن حیدر آباد دکن کی ریاست کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ اس نے علم و ادب کا چراغ روشن کیا اور اس کے والی نے علوم و فنون کی ہمہ جہتی ترقی میں گہری دلچسپی لے کر وہ کارنامے نمایاں انجام دیئے کہ ان کا نام نامی بھی سورج کی طرح ہمیشہ نورد و روشنی پھیلاتا رہے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ انھیں آج بھی یاد کرتے ہیں اور اسی وجہ سے آنے والی نسلیں بھی انھیں یاد کرتی رہیں گی۔

خواتین و حضرات ! میں دکنی نہیں ہوں لیکن دکن سے میری گہری دلچسپی کے دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ دکن نے مجھے قدیم ادب کا شعور دیا ہے۔ میں نے دکنی ادب پر



کسی دکنی سے اگر زیادہ نہیں تو کم کام نہیں کیا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں مارچ / اپریل ۱۹۸۳ء میں جناب میر عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" کی دعوت پر بیلا "سیاست" کو سیسی کچھر "دینے کے لیے دہلی سے حیدرآباد گیا۔ سرزمین حیدرآباد پر قدم رکھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسے مقام پر آگیا ہوں جہاں محنت ہی محنت ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ حیدرآباد کا شہر جنوبی، موٹیا اور موگرا کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور اخبار محنت کے لیے ابالیان حیدرآباد خوشبوؤں کی مہک اور اخلاص کے پھولوں سے قدم قدم پر میری گل چٹکا کر رہے تھے اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ آپ ہمیں اس لیے زیادہ عزیز ہیں کہ آپ نے دکنیات پر وہ کام کیا ہے جو خود دکنی بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ مجھے پہلی بار اپنے دکنی زبان و ادب پر کام کی صحیح روشنی واد حیدرآباد دکن میں ملی اور جب اور جہاں بھی میں گیا میں نے دیکھا۔ بوڑھے اور جوان، معمر اور نوجوان، مرد اور عورت کثیر تعداد میں شریک ہو رہے ہیں اور قدم دکنی زبان و ادب کے بارے میں مجھ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اہل دکن کو کچھ بھی اردو زبان و ادب سے اسی طرح گہری دل چسپی ہے جس طرح اس وقت تھی جب سلطان العلوم میر عثمان علی خان والئی حیدرآباد تھے اور دکن کی ریاست علوم و فنون کے فروغ میں پیش پیش تھی۔ دکن سے گہری دل چسپی کا وہ سرا سبب بالکل ذاتی نوعیت کا ہے جس کا اخبار بھرے جلسے میں اس لیے مناسب نہیں ہے کہ ذاتی باتیں عام طور پر جلسوں میں نہیں کی جاتیں لیکن یہ ذاتی بات اتنی اہم ضرور ہے کہ اس نے میری زندگی کو متاثر و متشکل کر کے میرے لیے وہ ماحول پیدا کیا کہ میں اپنے علمی و ادبی شوق کو زندگی کی ساری مصروفیت کے باوجود پوری توجہ سے جاری رکھ سکا۔ میں نے علم و ادب کا جو کام کیا اس میں اس دکنی خاتون کا ہاتھ اور اس کا اخلاص و ریشا و شائل ہے جسے عرف عام میں سنگم جانی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جناب وحید الدین خان بوڑنی صاحب نے جناب عظیم قادری صاحب صدف کے توسط سے مجھ سے کچھ کے جلسے میں شرکت کے لیے فرمایا تو میں نے اپنی ساری مصروفیات کے باوجود فوراً ہائی بھری اور آج میں گئی آپ کی طرح آپ کے ساتھ اس عظیم انسان کو یاد کرنے میں شریک ہوں جنہیں اب سب عرف سلطان العلوم کے

خطاب سے موسوم کرتے ہیں اور یہی خطاب دراصل ان کی شخصیت و خدمات کا جامع اظہار بن گیا ہے اور کچ پاکستان میں جب اردو کو سرکاری و دفتری زبان بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، سلطان العلوم کی ریاست حیدرآباد کی اردو خدمات ایک مثالی نمونے کا کام کر رہی ہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ پروفیسر کثری الدین قادری دور مرحوم نے ۱۹۳۵ء میں "عہد عثمان میں اردو کی ترقی" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی اور اس میں تحریر کیا تھا کہ "سرزمینِ دکن نے اردو ادب کا آغاز نہ معلوم کون سی مبارک گھڑی میں کیا تھا کہ اس کے سپوت آج تک اس کی خدمت میں سرگرم کار ہیں اور گزشتہ تین چار صدیوں کے طویل عرصے میں کبھی کسی وجہ کے بھی اپنے کام کو ملتوی نہیں کیا۔ یہ کام آج بھی ساری مخالفتوں اور منافقتوں کے باوجود حیدرآباد دکن میں ہو رہا ہے اور اردو خدمت کا یہی کام آج بھی اہل دکن کی قدیم و جدید پاکستانی نسلیں پاکستان میں انجام دے رہی ہیں۔ نہ صرف اردو خدمت بلکہ ہر شعبہ حیات میں پاکستان کی خدمت اخلاص و دردمندی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان قابل ذکر خدمات کا سہرا سلطان العلوم کے سر اس لیے باندھنا چاہیے کہ اگر وہ فروغِ علم و فن کا چراغ اپنے دورِ حکومت میں سرزمینِ دکن پر روشن نہ کرتے اور وہاں کے لوگوں کو جدید تعلیم سے بہرہ مند نہ کرتے تو اہل دکن وہ خدمات ہرگز سرگزا انجام نہیں دے سکتے تھے جو وہ آج دے رہے ہیں۔ فروغِ علم کی یہ جدید روایت سلطان العلوم میر عثمان علی خان مرحوم نے قائم کی تھی اور اس روایت کا فیض کچ بھی اسی طرح جاری و ساری ہے۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ سلطان العلوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے آپ ہر سال یہ جلسہ کرتے ہیں میرا خیال ہے کہ غالباً یہ مصرع "وفا داری بشرط استواری اصل ایماں ہے" شاید اہل دکن کی اسی وفاداری کو محسوس کر کے کہا تھا۔

سلطان العلوم دُنیا کے ایک امیر ترین انسان تھے۔ اتنے دولت مند کہ ان جیسے دو چار ہی انسان ہوں گے، لیکن انھوں نے اس دولت کے ایک حصہ کو

کار ہائے غیر اور تعلیم و علم کے فروغ پر صرف کیا۔ برصغیر کے متعدد تعلیمی، مذہبی ادارے سلطان العلوم کی مالی اعانت کے درجہ منت رہے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سلطان العلوم نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام اور مسلم تہذیب کی بقا و ترقی کے لیے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سلطان العلوم میر عثمان علی خان کے بارے میں اور بہت سی باتیں ہیں جو کہی جاسکتی ہیں لیکن آخر میں ایک بات کہ سب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سلطان العلوم نے علم و تعلیم، ادب و فن کے فروغ کے لیے جو روایت قائم کی تھی وہ روایت اب آپ کا تہذیبی ورثہ ہے۔ کیا آپ نے اس روایت کو زندہ و باقی رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے سرزمینِ پاکستان پر اجتماعی طور پر کچھ کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو اور کیجیے اور اگر نہیں کیا تو کرنا چاہیے آپ کے اسی عمل سے سلطان العلوم کی روح کو سکون پہنچے گا۔

(۲۲ فروری ۱۹۸۳ء)

## قاضی عبدالخالق مورانی کی خدمات

قاضی خلیق مورانی مرحوم سے میں قاضی محمد اکبر صاحب کے ذریعے متعارف ہوا اور اتنا متاثر ہوا کہ ۱۹۷۹ء میں، میں نے ایک مضمون بھی قاضی خلیق مورانی کے بارے میں لکھا جو ۲۸ مئی ۱۹۷۹ء کے جنگ اخبار کے ص ۳ پر شائع ہوا۔ قاضی خلیق مورانی کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا اللہ کا وہ مخصوص زاویہ نظر تھا جو ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود کو ملتِ اسلامیہ کا فرد سمجھیں اور نیشنلزم کے پُر فریب تنقیل سے دھوکا نہ کھائیں۔ ملتِ اسلامیہ کا سوا او اعظم اور ہے۔ سب مسلمانوں کو ایک بھائی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے مل کر محبت و اخوت کی فضا میں اس مقصدِ عظیم کے

لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ قاضی مورانی مرحوم تعصب و تنگ نظری کو اسلام کا دشمن سمجھتے تھے یہی وہ نقطہ نظر تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک الگ آزاد مملکت کے لیے جدوجہد پر اکسایا اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں کا وہ ملک وجود میں آیا جسے آج ساری دنیا پاکستان کے نام سے جانتی ہے۔

اس نقطہ نظر کو قاضی خلیق مورانی مرحوم نے سندھ و اہل سندھ میں مقبول بنایا اور یہی وہ نقطہ نظر تھا جسے برصغیر کے ان صوبوں کے مسلمانوں نے بھی اپنایا جہاں وہ صرف بارہ ہندوستانی صوبے تھے اور جانتے تھے کہ الگ مملکت بنانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود ہمیشہ کے لیے 'ہندو' کے غلام بن کر رہ جائیں گے اور ان کی تہذیب، ان کا تمدن ان کے اپنے علاقوں میں محفوظ رہ سکے گا۔ لیکن اسلام کو زندہ و تابندہ دیکھنے کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی، ہر قسم کے ایثار کے لیے آمادہ اور ہر خطرے سے بے نیاز تھے، اسی بے لوث جذبہ ایثار نے اس ملک عزیز کو وجود بخشا اور اسی جذبہ نے پاکستان کے دروازے برصغیر کے سب مسلمانوں پر کھول دیے۔ سب سے زیادہ کشادہ دلی کا ثبوت جس صوبے نے زیادہ بلاشبہ سندھ کا صوبہ تھا۔ اس صوبے میں جس طرح ہجرت کرنے والے مسلمان آباد ہوئے اور جس طرح اس صوبے نے ترقی کی وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ ہجرت کرنے والے جب ہجرت کرتے ہیں تو وہ سخت محنت کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو نئے سرے سے قائم و دائم کرنے کے لیے اپنے سارے وسائل و ذرائع کو استعمال کرتے ہیں جن سے ایک طرف خود ان کی زندگی کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف اس سرزمین کو ترقی حاصل ہوتی ہے جس پر وہ محنت کر رہے ہیں۔ کئے والوں کے لیے یہ ان کا نیا وطن تھا۔ انہوں نے یہاں رہ کر جو محنت کی اور اس محنت سے جو کچھ حاصل کیا وہ یہیں رکھا اور یہیں لگایا۔ اسی لیے صوبہ سندھ معاشرتی، معاشی و تہذیبی سطح پر بے شمار گرمیوں کا مرکز بن گیا اور اس کے ثقافتی وجود میں ایسی بنیادی تبدیلیاں آئیں کہ ایک نئے اور آگے بڑھنے والے تہذیب و تمدن کی گہری بنیاد پڑ گئی۔ اس ثقافت کی روح میں اسلام کی روح پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہے اور یہ وہ صورت حال ہے جس سے مدھون ہم بلکہ ساری دنیا نے

اسلام فیض اٹھا سکتی ہے۔ اس وقت وہ قوتیں پوری طرح سرگرم عمل ہیں جو نہیں چاہتیں کہ اسلام ہماری نئی تہذیب کی بنیاد بنے اور اسی لیے آج ان تمام عناصر کو توڑنے اور الگ کرنے میں مصروف ہیں جن سے ”وصل کے بجائے“ فصل کا کل شروع ہو سکے۔

تاریخ شاہد ہے کہ سندھ نے ہمیشہ نئی تہذیب کے ہر اول دستوں کو خوش آمدید کہا ہے اور ان کو اپنے اندر جذب کر کے ایک نو مند اور جاندار تہذیب کو جنم دے کر نئی دنیاؤں کا سفر کیا ہے۔ تہذیبی، معاشرتی و معاشی سطح پر اس وقت یہی صورت حال ہے اور اگر اس صورت حال کو ہم نے خراب ہونے دیا یا مسافروں پر ستوں کے ایک مختصر ٹوٹے کو اسلامی فکر اور نقطہ نظر پر غالب آجانے کے مواقع فراہم کر دیے تو یقین جانتے کہ وہ عمارت و حرطام سے اگڑے گی اور محرومیوں، انارادوں اور تہذیبی و معاشی جبر و استحصا کا ایک ایسا دور شروع ہو گا جس کے پھٹکل سے نکلنا ایک طویل عرصے کے لیے ممکن نہ ہو سکے گا۔ مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور یہی وہ سطح ہے جس پر مسلم معاشروں کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اسلامی تہذیب و معیشت فروغ پاتی ہے۔ میرے خاندان کی کئی لڑکیاں سندھیوں میں بیاہی ہوئی ہیں اور سندھ کی کئی بیٹیاں میرے خاندان کے افراد سے بیاہی گئی ہیں۔ اس وصل و نزول کی بنیاد کی تعداد ان دونوں کا مسلمان ہونا ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تہذیبی سطح پر ایسے اچھے خاندان وجود میں آتے ہیں جن میں وہ سب کچھ ہے جو الگ الگ نہ انصار خاندانوں میں نظر آتا ہے اور نہ حجاب خاندانوں میں۔ لیکن خاندانوں میں اسلام کی روح اور زیادہ وسیع اور گہری ہو گئی ہے۔ ایک لڑکی ہے تعصبی، فراعہ دل اور اسلامی برٹن خیالی ان خاندانوں میں نظر آتی ہے جو مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

قاضی خلیق مودانی کا یوم متواتر ہوئے مجھے آج بھی کہنا ہے کہ حجاب و انصار دونوں اب اسی صوبے کے باشندے ہیں۔ ہمیں ان دونوں کو الگ الگ کرنے والی قوتوں کے ہوشیار رہنا چاہیے اور وہ کام وہ عمل کرنے چاہئیں جن سے یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں۔ ہمیں ایسے اقدام کرنے چاہئیں جن سے اسلامی عمل و انصاف کو اسلامی مسادا

کو فروغ حاصل ہو سکے اور جبر و استحصا ل کا موجود غیر اسلامی نظام کا خاتمہ ہو سکے۔  
انصاف زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ اُسے خوش حال بناتا ہے۔ انصاف مثبت قدر  
ہے۔ نا انصافی منفی قدر ہے اور معاشرے کو ہر سطح پر، خواہ وہ معاشی ہو یا معاشرتی،  
بر باد کرتا ہے۔

آج کے دن اس موقع پر ہمیں اپنا راستہ مقرر کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے  
کہ کیا نا انصافیوں کی ترویج سے ہم کوئی زندہ آگے بڑھنے والا معاشرہ پیدا کر سکتے  
ہیں اور آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عدل و انصاف، مساوات ہی وہ قدریں  
ہیں جن پر چل کر ہم اسلام و روح اسلام کو زندگی میں نافذ کر سکتے ہیں۔ نا انصافی ان  
گیمنڈ کی طرح ہے جسے آپ جس قوت سے دیوار معاشرہ پر مارتے ہیں وہ اسی قوت سے آپ  
تک واپس آجاتی ہے۔ اس کے واپس آنے میں وقفہ تو یقیناً ہوتا ہے لیکن یہ وقفہ  
بہت مختصر ہوتا ہے۔ اللہ نے پاکستان ہمیں تقدیر کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ہمیں اس  
کا ذمہ دار بنایا ہے۔ ہم جو کچھ کریں گے اس کے ہم خود ذمہ دار ہیں اور ہوں گے۔  
پاکستان اللہ کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت، اس کی ترقی، اس میں عدل و انصاف  
کی روح پھونکنا، اسے اسلام کا قلعہ بنانا، اس میں محنت و اخوت پیدا کرنا، مسلمان  
ایک دوسرے کے بھائی ہیں اے قرآنی احکام کو زندگی میں عملی طور سے پڑھنا اور پرت کر  
دکھانا، یہ ہماری ذمہ داری ہے اور جو اس عمل سے روگردانی کرے گا وہ اسلام کا دشمن  
ہو گا۔ آج ہمیں اس پر بھرے گونہ کرنا چاہیے اس لیے کہ اس میں ہمارے محفوظ ایشیانا  
مستقبل کا راز پنہایا ہے۔

(یکم فی ۱۹۸۴ء)

# حافظ شیرازی

حافظ شیرازی دُنیا نے ادب کے چند عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر بے ہل ہیں کہ صدیوں سے خود ملک ایران کی واضح شناخت ہیں مگر ان کا اثر دُنیا کی بیشتر زبانوں کے ادبیات نے قبول کیا ہے اور برصغیر کے ادبیات اور بالخصوص اردو شاعری پر تو ان کا اثر بہت واضح اور گہرا ہے۔ حافظ کی زندگی ہی میں ان کی شہرت برصغیر پہنچ چکی تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ سلطان شاہ محمود ہمنی کے دورِ حکومت میں میر فضل اللہ نے زاو راہ بھیج کر انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ حافظ شیرازی روانہ ہوئے مگر طوفان نے جہاز کو گھیر لیا۔ خواجہ حافظ جہاز سے اتر گئے اور وہ مشہور غزل کہو کہ میر فضل اللہ کو بھیج دی جس کے یہ دو شعر مجھے بھلے یاد ہیں :

شکوہ تاجِ سلطانی کریم جاں درو درج است

کلا و دلکش است اما یہ دردم سرنہی ارزد

ہے کوئے میفرود شانش بہ جامے در نمی گھرنہ

نہ ہے سجادۂ تقویٰ کو یک ساغر نمی ارزد

حافظ شیرازی برصغیر کی مسلم تہذیب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ جیسے امیر خسرو و غلامِ دُخواص کی تہذیب میں خون کی طرح گردش کر رہے ہیں اسی طرح حافظ شیرازی غلامِ دُخواص کی تہذیب کا سرمۂ چشم بن کر فوراً دو بالاکر رہے ہیں۔ شاید ہی پرانی نسل کا کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا ہو جسے حافظ شیرازی کے دو چار شعر یاد نہ ہوں۔ قوال حافظ کے شعر شکر آج بھی اہل محفل کو عالمِ وہ میں لے آتے ہیں۔ حافظ حال کے بھی شاعر ہیں اور قال کے بھی سارو کی کوئی نعلی یا ادبی کتاب

جو آج سے پچاس سال پہلے لکھی گئی ہو آپ کھول کر دیکھ لیجیے حافظہ کے شعروں کی ترجمانی کرتے ہوئے آپ کو نظر آئیں گے۔ حافظہ ہمارا تہذیب کی زبان کا ایک حصہ بھی ہیں اور ہمارے جذبات و احساسات کے ترجمان بھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایرانی تہذیب کو برصغیر کی مسلم تہذیب سے قریب اور ہمارے دلوں کو ایک دوسرے سے قریب کر لیا ہے۔ انہیں شعرا نے ہماری فکر کو، ہمارے جذبہ و احساس کو ہمارے خیالات و افکار کو متاثر کر کے ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

یہی وہ تہذیبی مشابہت اور یہی وہ ثقافتی مماثلت ہے جس کی وجہ سے ایران و پاکستان ایک دوسرے کے برادر ملک اور برادر قوم ہیں اور یہی وہ راستہ ہے کہ ایران و پاکستان کو مزید قریب کر سکتا ہے۔ علم و ادب کے حوالے سے جو قومیں ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں وہ پہچان، وہ شناخت دائمی وابدی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم اسی سطح پر اور اسی حوالے سے عہد حاضر میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور نہ پرستی سے ہٹ کر علم پرستی اور ادب پرستی کے راستے کو اختیار کریں تاکہ قریبیں بڑھ جائیں اور فاصلے کم سے کم قریب جائیں۔ اردو زبان و ادب نے فارسی زبان و ادب کی چھاتی سے دودھ پیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ فارسی زبان و ادب کے اثرات نے اردو زبان کو نہ صرف علم و ادب کے سانچے دیے بلکہ اسے تیزی سے پروان چڑھانے میں بھی مدد دی ہے۔ آج اردو زبان، جو پاکستان کی قومی زبان ہے، خود ایک ترقی یافتہ زبان بن گئی ہے جس کا ادب ثروت مند اور جس کا دائرہ وسیع ہے اور جس نے تیسرا غالب اور آقبال جیسے شاعر پیدا کیے۔ لیکن ان سب پر اور خود اردو ادب پر فارسی ادب و زبان کے اثرات واضح اور گہرے ہیں۔ میں جو زبان لکھتا ہوں اس میں فارسی زبان شامل ہے۔ ہمارا سارا ثقافتی ورثہ فارسی زبان میں محفوظ ہے۔ اسی لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ فارسی پڑھنے اور سمجھنے کی ہم پھر سے طرح ڈالیں تاکہ ہمارے ثقافتی و تاریخی ورثہ کے بند دروازے کھل جائیں اور ہم مغرب و مشرقین کی آنکھوں سے اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور اپنے ورثے کو دیکھنے کا عمل بند نہ کریں۔ یہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہم خود کو پہچانیں، اپنے ورثے کو براہ راست دیکھیں اور اس ورثے سے اپنے حال کو سنوار کر اپنے مستقبل کو، اپنی مرضی کے مطابق



خود پیدا کریں۔ اپنے عظیم ورثے کو بھٹاکر ہم نے بہت کچھ کھویا اور گنوا یا ہے۔ حافظ شیرازی کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے کہئے اس بات پر بھی خود کریں کہ ہم بھٹک کر کہاں نکل آئے ہیں۔ یہ وہ راستہ تو نہیں ہے جس پر چل کر ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے۔ اب درویش حافظ سے خال نکالنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ہمیں اپنے درفش اور اپنی تاریخ کے حوالے سے خود کو پہچاننے کا وقت آ گیا ہے۔ ہر دوی مغربی سے ہم نقل اور ترجمہ کی تہذیب تو میا کر سکتے ہیں لیکن وہ توانا و اصل تہذیب پیدا نہیں کر سکتے جو فلک افلاک کو چھو لیتی ہے۔ حافظ شیرازی نے اسی لیے ”طرح نو در اندازیم“ کا درس دیا تھا اور یقیناً ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ حافظ نے کہا تھا :

مشاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل

مشاہد آں ست کہ ایں دارد و کنے دارد

”طرح نو“ اور ”کنے دارد“ ہی وہ محاصل ہیں جن سے مجھے پاکستان و ایران و دونوں میں روشنی کی کرنیں پھوٹی نظر آ رہی ہے۔

# نصرتی کی فارسی غزل

پروفیسر اکبر الدین صدیقی صاحب کا ایک مضمون سب رس کراچی دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارے میں نظر سے گذرا جس میں محترمی اکبر الدین صدیقی صاحب نے لکھا ہے کہ ”ڈاکٹر جمیل الدینی صاحب نے اس (نصرتی) کا دیوان اور تاریخ اسکندری شائع کی۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ ”اس میں نصرتی کے فارسی کلام کا کوئی تذکرہ نہیں“۔

یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ۱۹۷۲ء میں جب میں نے قدیم بیاضوں سے ریڑہ ریڑہ اکٹھا کر کے دیوان نصرتی مرتب کیا تو اس میں ایک فارسی غزل بھی شامل کی تھی جو دیوان نصرتی مطبوعہ قوسین لاہور ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۷۹ اور ۸۰ پر درج ہے۔ اس فارسی غزل میں سات شعر ہیں۔ محترم اکبر الدین صدیقی صاحب نے اپنے مضامین کے مجموعے ”مجھے چراغ“ میں اس غزل کے صرف پانچ شعر دیے ہیں۔ نصرتی کی فارسی غزل کے تعلق سے میں نے ایک فنٹ نوٹ بھی دیا تھا جس میں چند امور کی حراحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :

”مظفر حسین صہا مولف ”روز روشن“ نے یہ غزل عشرتی اصفہانی کے نام سے درج کی ہے اور لکھا ہے کہ ”بعضے اپنی غزل را بہ نام نصرتی گیلانی نوشتہ وہ تحقیق اختر (قاضی محمد صادق خان) اختر مولف تذکرہ آفتاب عالمیاب) و صاحب نگارستان سخن (نواب نور الحسن خان) عشرتی اصفہانی است۔“

(روز روشن، ص ۳۵۵)

”فرہنگ سخنوران“ میں نصرتی گیلانی کا نام نہیں لکھا۔ صرف ”روز روشن“ کے

حال سے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ”فرہنگ سخنوران“ میں ایک نعتی ہندوستانی کا نام بھی آیا ہے جس کو مشنوی ”مہروماہ“ کا مصنف بتایا گیا ہے جو ۶۸-۱۰۸ھ تک حیات تھا۔ (فرہنگ سخنوران“ ص ۶۴)۔ نعتی کیلانی کے مطبوعہ دیوان میں یہ فارسی غزل نہیں ہے۔ امکان ہے کہ یہ غزل اسی نعتی دکنی کی ہو سکیں کہ نعتی دکنی کا سال وفات ۸۵-۱۰۸۵ ہے۔ دوسرے یہ کہ جس مشنوی کو ”مہروماہ“ کہا گیا ہے وہ عاقل خان رازی عالمگیری کی مشنوی ہے جس میں اسی قصہ منور و مدحی کو نظم کیا گیا ہے جسے نعتی نے ”گلشن عشق“ میں موضوع سخن بنایا ہے۔ مہروماہ فارسی زبان میں ہے اور ”گلشن عشق“ اردو میں۔

اس غزل کا تیسرا اور پانچواں شعر غالب نے قدسی (مشہدی) سے منسوب کیا ہے موجد تحقیق کی روشنی میں یہ صحیح نہیں ہے۔

نعتی کی یہ واحد فارسی غزل ہے جواب تک دستیاب ہوئی ہے اور یہ غزل جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ’میرے مرثیہ ’دیوان نعتی‘ میں شامل ہے جسے قارئین کی دل چسپی کے لیے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

|                                   |                                    |
|-----------------------------------|------------------------------------|
| از پنج من چاک گرہاں بگلہ دارد     | دو گریہ من گوشہ دامان بگلہ دارد    |
| از بس کہ بہ زندان غمت دہانم       | زنجیر بہ تنگ آئندہ زندان بگلہ دارد |
| دامان نگہ تنگ گل حسن تو بیار      | محل چین بہار تو ز دامان بگلہ دارد  |
| گر بُت نکشم گاہ بہ مسجد زخم آتش   | کز مذہب من گرو مسلمان بگلہ دارد    |
| در بزم وصال تو بہنگام تماشا       | نظارہ ز خنبدین حرا گاہ بگلہ دارد   |
| ستل بہ چین مشک فشاں ہذا بگلہ دارد | از غربت من زلف پریشان بگلہ دارد    |

گر گریم و گر خندم و گر آہ جگر سوز

اے نعتی از وضع تو جاں بگلہ دارد

اس غزل اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی صاحب کی مندرجہ غزل میں چند الفاظ کا فرق ہے۔ اہل علم کے لیے یہ بات بھی دل چسپی کا باعث ہوگی۔ یہ بات میں نے صرف اس لیے وضع

کر دی ہے کہ سب رس کے قارئین کے سامنے یہ بات اچھلے کہ میرے مرتبہ "اولیٰ القریٰ"  
میں نہ صرف فارسی غزل شامل ہے بلکہ اس غزل میں دو شعر بھی اکبر الدین صدیقی صاحب  
کی مندرجہ غزل کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔

(۲۱ جنوری ۱۹۸۲ء)

اکبر الہ آبادی

ریاضتیں

نقوشِ ادب

بنجارے کے خواب

ساتھ دیوانی شخصیت اور فن

کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار

کچھ نئے اور پرانے شاعر

فیض

پاکستان میں اردو ادب (سال بہ سال)

سالانہ ادبی جائزہ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۷ء

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

فکر اقبال کا تعارف

تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید

طمنہ و مزاج

(تاریخ تنقید انتخاب)

فیض کی تخلیقی شخصیت

اردو زبان اور یورپی اہل قلم

ادبی مذاکرے

ڈاکٹر خواجہ محمد زکیا

ریاض احمد

فرزاد سید

مغرب: سماج سمیٹ

ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف

ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف

فتح محمد ملک

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر

عزیزہ تنہا، ڈاکٹر طاہر تونسوی

مغرب: ڈاکٹر طاہر تونسوی

عشق دہانی

مغرب: شمیم امجد